خطوطِ غالب کی
روشنی میں
غالب کی
سوانح عمری
ڈاکٹر تنویر احمد علوی

خطوط غالب کی روشنی میں

غالب کی سوانح عمری

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

نام کتاب : غالب کی سوانح عمری

تصنیف : ڈاکٹر تنویر احمد علوی

سال اشاعت : ۲۰۰۴ء

کتابت : محمد یوسف

تعداد : پانچ سو (۵۰۰)

قیمت : ۲۵۰ سو روپے

ناشر : غالب اکیڈمی

مطبع : پرنٹ سینٹر، گلی گڑھیا، دریا گنج، نئی دہلی ۲

Khatoot-I-Ghalib Ki Roshni Mein

Ghalib Ki Sawaneh Umri

By Dr.Tanvir Ahmad Alvi, Rs.250/-

حکیم حافظ محمد سعید کے نام

شہیدِ سعادت دودمانِ مجید
حکیم سعید مرحوم و مغفور
رفتید و لے نہ از دلِ ما

ت ا ع

نگارش نامہ

پیش لفظ

غالب اکیڈمی علمی و ادبی تقاریب اور معیاری اشاعت کی وجہ سے مقبول و معروف ہے۔ اکیڈمی ہر سال 27/دسمبر کو مرزا غالب کے یوم ولادت کے موقع پر اور 22/فروری کو مرزا غالب کی وفات اور اکیڈمی کے یوم تاسیس کی مناسبت سے جلسے کا اہتمام کرتی ہے۔ جلسوں اور تقاریب کی اپنی اہمیت ہے اور اس کا انعقاد از حد ضروری بھی ہے لیکن جلسوں اور تقاریب کا اثر وقتی ہوتا ہے۔ ان کا اثر قائم رکھنے کے لیے غالب اکیڈمی کے بانی الحاج حکیم عبدالحمید کی خصوصی ہدایت تھی کہ ان موقعوں پر غالب پر ایسے خطبے یا مقالے پڑھوائے جائیں جن کو کتابی صورت میں شائع کیا جا سکے۔

حکیم صاحب کی خواہش پر 27/دسمبر 1997ء کو ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب نے ''غالب کے سوانحی کوائف: بعض نئے گوشے'' کے عنوان سے خطبہ دیا تھا۔ اس خطبے سے بعض وہ پہلو سامنے آئے جن پر غالب کے سوانح نگاروں نے بہت کم توجہ دی تھی۔ غالب کے اسفار کا ذکر غالب کی سوانح عمری میں بہت کم ملتا ہے۔ ڈاکٹر علوی نے اپنے خطبے میں غالب کی تحریروں سے سفر کلکتہ کے دوران آنے والے مقامات، وہاں قیام وغیرہ کی تفصیل کی تحقیق کی۔ خطبہ بے حد پسند کیا گیا اور یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ غالب کی سوانح کے جو گوشے، ان کی سوانح عمریوں میں نہیں ملتے، انھیں شائع کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر تنویر علوی صاحب سے درخواست کی گئی کہ اس مقالے کو آگے بڑھائیں اور غالب کی سوانح سے

متعلق ضروری توسیعات کو شامل فرمائیں۔

ڈاکٹر علوی صاحب نے مقالے کو وسیع کرنے کی ذمے داری قبول فرمائی اور اس میں اس قدر وسعت پیدا ہوگئی کہ غالب کی ایک الگ قسم کی سوانح عمری تیار ہوگئی۔ اس سوانح عمری کا ماخذ غالب کے خطوط اور تحریریں ہیں۔

اس سوانح عمری میں نئے گوشوں کے ساتھ ساتھ وہ تفاصیل بھی آگئیں جو غالب کی سوانح میں ملتی ہیں، جیسے غالب کا خاندان، تعلیم وتربیت، شادی، خاندانی وظیفہ، دلی کالج کی ملازمت، زین العابدین خاں عارف کی وفات وغیرہ کا ذکر اکثر مل جاتا ہے لیکن سفر بھرت پور، فیروز پور جھرکہ، سفر دیار مشرق، لکھنؤ کا سفر اور قیام باندا، الٰہ آباد، بنارس اور کلکتہ کے احوال کی تفصیل بہت کم ملتی ہے۔ علوی صاحب نے ان سے متعلق تفصیلات غالب کے خطوط، خصوصاً فارسی خطوط کی روشنی میں یکجا کی ہیں۔

تحریر کے ساتھ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب، کتابت بھی کرواتے رہے اور آخر میں اس کی تصحیح کا ایک بڑا مرحلہ تھا اور اس میں خاصا وقت لگ گیا۔ اب کتابت شدہ مسودہ غالب اکیڈمی کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب غالب کے سوانحی ماخذ میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری

غالب اکیڈمی

تمہید نامہ

غالبؔ جن کو ہم پیدائش و پرورش کے لحاظ سے اکبرآبادی کہہ سکتے ہیں نیز ایک لمبے عرصے تک دہلی میں قیام کی وجہ سے وہ دہلوی کہلاتے ہیں۔ ان دو بڑے شہروں کے مابین ادبی اور تہذیبی اعتبار سے قدرِ مشترک کا درجہ رکھتے ہیں۔

اپنے زمانۂ حیات میں بھی وہ ایک بڑے شاعر، نثر نگار، فن کار اور ادبی نقّاد تھے۔ اُن کے معاصر تذکروں اور ادبی تاریخوں میں بھی ان کا نام ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے آتا رہا۔ فارسی سے ان کو خاص شغف تھا اور اردو مکتوبات میں وہ ایک مختص ادبی اسلوب کے بانی خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

یہ گنجینۂ معنی کا طلسم ان کا اردو کلام ہے جس میں انھوں نے اپنی شاعرانہ مشکل پسندی طبّاعی، مضمون آفرینی، معنی بندی، حسنِ بیان اور لطفِ زبان کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

اُن کے خیال سے اُن کے اردو کلام کی وہ قدر نہ ہوئی جس قدر فرمائی یا قدر افزائی کا مستحق اُن کے اشعار کا یہ سلسلہ تھا۔ مگر وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ ان

کی شاعری کی قدر ان کے بعد ضرور ہوگی۔ ان کے ایک فارسی شعر میں یہ مضمون اس طور پر آیا ہے ؎

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریدارے کہن خواہد شدن

میرے شعر کی شہرت دنیا میں میرے بعد ہوگی اور یہ شرابِ خریداری کے قحط کی وجہ سے پرانی ہو جائے گی۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ غالبؔ کی شاعری کی مئے رنگین اپنے وقت میں نشہ آور نہیں تھی اور یہ شراب خریداری کے فقدان کے باعث رفتہ رفتہ بادۂ کہن میں بدلی ہے (جس کے بعد شراب کا نشہ تیز ہو جاتا ہے) مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ غالبؔ کی شہرت میں بھی اضافہ ہوا بلکہ غیر معمولی اضافہ ہوا اور ان کے شعر و شعور کی شراب تند و تیز وقت کے گزرنے کے ساتھ مئے دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئی۔ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے:

بیسویں صدی، اب سے کچھ ہی پہلے گزری ہے اور اس نے اپنا صد سالہ دورِ زندگی پورا کیا ہے اردو شعر و ادب کی تاریخ کے حوالے سے یہ کہیے کہ وہ غالب شناسی کی صدی تھی اس صدی کے دوران غالبؔ کو بہت اچھے سوانح نگار، نقاد، شارح اور محقق نصیب ہوئے۔ ان کے کلام کے بہترین ایڈیشن شائع ہوئے ایسے مصور ایڈیشن بھی اس میں شامل ہیں جو تصویر کاری اور شبیہ نگاری کے بہترین نمونوں سے آراستہ تھے اور آئندہ کے لیے اپنے وقت کی عمدہ بلکہ تاریخ ساز یادگاروں میں بجا طور پر ان کا شمار ہوتا ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی اور صادقین صدق جیسے بیسویں صدی کے مصورِ غالبؔ کے ان مصور نسخوں کے فنکار (مرتب) ہیں۔ مولانا حالیؔ، مولانا علم الدین سالکؔ، آغا بیدار بخت، مولانا غلام رسول مہرؔ، شیخ محمد اکرام اور مالک رام جیسے سوانح نگار ان کے حصے میں آئے۔

نقادوں میں حالی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر عبداللطیف، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسے دانشوران کے تنقید نگار ہیں۔ محققوں میں قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا غلام رسول مہر اور مالک رام کو بہت نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

اسی طرح غالب کے شارحین میں مولانا طباطبائی، مولانا ناطق گلاؤٹھی، سہا مجددی، نیاز فتح پوری، یوسف سلیم چشتی، بیخود موہانی اور بیخود دہلوی جیسے اہلِ شعر وادب آتے ہیں۔ (اس فہرست کو اور بھی بڑھایا جا سکتا ہے)۔

غالب پر جو تحقیق ہوئی وہ اپنے طور پر اور اپنے معیارِ فکر ونظر کی روشنی میں اردو کی نہایت اہم تحقیقات کا نمونہ ہے۔ یہی صورت تنقید اور شرح نگاری کی بھی ہے کہ اس سے ہماری زبان اور ادب کے ہفت رنگ دائرے برابر متاثر ہوتے رہے۔ غالب پر جو کام بھی ہوا وہ ہماری زبان اور ادب کا ایک تاریخی ادبی وتہذیبی ورثہ ہے۔ اس پر اضافوں کا سلسلہ برابر جاری ہے نئے فکری گوشے اور ذہنی زاویے سامنے آرہے ہیں اور نئی جہتوں اور نئے دائروں میں ادبی کام ہو رہا ہے۔

غالب کے سوانح وسیرت کا مطالعہ بھی برابر جاری ہے اور خود غالب کے اپنے کلام اور خاص طور پر ان کے مکتوبات کی روشنی میں اس پر غور وفکر اور اخذِ نتائج کا ادبی سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جو کام ہوا ہے اس کا تنقیدی جائزہ سامنے آئے اور غالب پر جو خاص نمبر یا خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں یا مقالات ومضامین کا کہکشانی سلسلہ ادھر سے ادھر تک بکھرا ہوا ہے، وہ بھی (اس میں غالب سے متعلق سوانح عمریاں بھی شامل ہیں) تحقیقی اور تقابلی نقطۂ نظر سے ان کے اردو اور فارسی خطوط اور سلسلۂ نظم وشعر کی جو تدوین عمل میں آئی ہے اس کا تنقیدی مطالعہ بھی جس میں عیار گیری کے نئے پیمانے کام آئیں اور مآخذ کی نئی چھان بین اور بازیافت کی کوششوں کو مزید واضح صورت میسر آئے۔

مولوی مہیش پرشاد نے غالبؔ کے اردو خطوط کو مرتب کیا تھا اس سے مالک رام صاحب نے استفادہ کیا اور وہ خطوط چھپ گئے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے نئی تحقیق کی روشنی میں اسی کام کو زیادہ توجّہ اور محنت سے انجام دیا اور خطوطِ غالب کا نسبتاً زیادہ مستند اور معتبر ایڈیشن پیش کیا جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے دیوانِ غالبؔ کو اپنی محققانہ نظرداریوں کے ساتھ مرتب کیا۔ انتخابات بھی شائع ہوئے اور قدیم ایڈیشن بھی اپنی اصل یا Original صورت میں عکسی اشاعت کے ساتھ ظہور پزیر ہوئے۔

اس صدی کے دوران جس نے غالبؔ اور ان کے کلام و کمال کے بارے میں بہت سی دریافتیں کیں اور علمی فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اردو زبان میں غالبؔ کے دو گم شدہ دواوین کی بازیافت بھی عمل میں آئی، جن کی بازیابی کے بعد غالبؔ اور کلامِ غالبؔ سے متعلق بہت سی ایسی غزلوں یا اشعار کی طرف ذہن منتقل ہوا جو اس سے پیشتر ہماری دسترس میں نہیں تھے اور ہم ان کے بارے میں باوثوق سطح پر کچھ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

پہلا دیوان اب "نسخۂ حمیدیہ" کہلاتا ہے کہ وہ بھوپال میں دریافت ہوا اور نواب حمیداللہ خاں والیِ بھوپال کے نام کی نسبت سے اس کو "نسخۂ حمیدیہ" کہا گیا۔ دوسرا نسخہ بھی بھوپال ہی میں دریافت ہوا اور نسخۂ بھوپال ثانی کہا گیا۔ یہ دونوں غیر معمولی دریافتیں تھیں اور ان سے غالبؔ کی فکر و فن کے اطراف کے توسیع میں بڑی مدد ملی۔

نسخۂ بھوپال ثانی کو نقوش لاہور نے "بیاضِ غالبؔ" کے نام سے شائع کر دیا (نسخۂ حمیدیہ) بھی دوبارہ چھپ گیا ہے اس کے علاوہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے ذاتی کلکشن میں غالب کے اردو دیوان کا ایک اور نسخہ بھی تھا جو اب نو دریافت کلامِ غالب کا حصّہ ہے۔ یہ اس زمانے میں زیرِ ترتیب تھا جب غالبؔ کلکتہ کی راہ سفر میں تھے اور دورانِ سفر جو غزلیں ہوتی تھیں، وہ غالبؔ

اس نسخہ کے حاشیوں پر درج کرتے جاتے تھے۔

یہ دریافتیں غالب کے سلسلے میں بیسویں صدی کی بڑی دریافتوں کا حصہ ہیں اس کے ماسوا غالب کے وہ خطوط بھی سامنے آئے جو انھوں نے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں والیان رامپور کو لکھے تھے۔ اور جن کو مکاتیب غالب کے نام سے مرتب کر کے اپنے حواشی کے ساتھ مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے شایع کر دیا۔

مزید یہ کہ "گلِ رعنا" کے نام سے غالب نے کلکتہ کے زمانۂ قیام میں اپنے اردو اور فارسی کلام کا جو ایک انتخاب تیار کیا تھا وہ بھی غالب کے نودریافت اردو فارسی متن کا ایک قابلِ قدر جز بن گیا ہے یہ سب ہوا لیکن جہاں تک غالب کے سوانح و سیرت کا سوال ہے اس سلسلے کی بڑی دریافت غالب کے وہ فارسی خطوط ہیں جو 'نامہ ہائے فارسی غالب' کے عنوان سے علی اکبر ترمذی صاحب نے مرتب کر کے غالب اکیڈمی سے شائع کرائے ہیں۔

یہ خطوط نیشنل آرکائیوز کے نادر ذخیرے سے حاصل کیے گئے تھے ان میں ان خطوط کے علاوہ بھی بہت سے خطوط تھے جو غالب کی زندگی میں "پنج آہنگ" کے ساتھ شائع ہو گئے تھے۔ غالب کی دوسری تصانیف بھی شایع کی گئیں ان میں "باغ دودر"، "مہر نیم روز"، "سبد چین" "دستنبو" اور دو مثنویاں بطور خاص شامل ہیں ان میں ایک مثنوی — کلکتہ کے سفر کے دوران قیام بنارس اور دوسری مثنوی کلکتے کے ادبی ہنگامے کے نتیجے میں لکھی گئی تھی۔

ان نودریافت تصانیف کے باعث غالب کی زندگی اور ذہن پر نئے زاویوں سے روشنی پڑتی ہے۔ خاص طور پر ان کے فارسی خطوط سے۔ لیکن ان کی سوانح اور سیرت کے مطالعے میں غالب کے فارسی خطوط کی روشنی میں ان کا نیا سوانح نامہ مرتب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جب کہ ان کی سوانح حیات کے بہت سے گوشے ان مکتوبات ہی میں موجود تھے یہ جو سوانح عمریاں سامنے

آئیں ان میں قدیم فروگزاشتوں کی درستی اور تصحیح بھی نہیں کی گئی۔

ان کے سفر کلکتہ سے پہلے ان کے سفر فیروز پور جھرکہ بھرتپورا ور سفر لکھنؤ کی بہت سی کڑیاں ان کے سوانحی مطالعے سے غائب رہیں، جب کہ اس سفر کی بعض تفصیلات غالب کے خطوں میں موجود تھیں۔ سفر لکھنؤ کے بارے میں بھی بعض فروری صراحتیں اور تشریحات ان خطوط کی مدد سے تیار کی جا سکتی تھیں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ لکھنؤ سے واپسی پر باندا، باندا سے الٰہ آباد، وہاں سے بنارس اور بنارس کے بعد عظیم آباد اور مرشد آباد ہوتے ہوئے (غالب) کلکتہ پہنچے۔ وہاں کے زمانۂ قیام میں وہ برابر خط لکھتے اور اپنے حال احوال سے اپنے احباب کو مطلع کرتے رہے اور اپنے اہل خانہ کو بھی۔

کلکتہ کے انگریز حکام کا رویہ پنشن کے مقدمے سے وابستہ بعض کارروائیاں اور دہلی ریزیڈینسی کی طرف اس مرافعہ کی بازگشت یہ سب باتیں غالب کے خطوط میں موجود ہیں اور اس کے بعد کی بعض منزلیں اور مرحلے بھی۔ مگر ان خطوط سے استفادہ کے ساتھ، سوانح عمری کے ترتیب کاروں کی جانب سے غالب کی نئی سوانح عمری مرتب کرنے کی کوئی سعی مشکور عمل میں نہیں آئی۔

راقم الحروف کو اب سے بارہ تیرہ برس پہلے جب غالب اکیڈمی کی جانب سے "غالب میموریل لکچر" دینے کی دعوت دی گئی تو غالب کے تحقیقی مطالعے کے ضمن میں بہت سے نئے حقائق سامنے آئے۔ بعدہٗ میں نے "پنج آہنگ" میں شامل غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ "اوراق معانی" کے نام سے کیا جو دہلی اردو اکادمی کی طرف سے چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔

ان حقائق تک رسائی کی بدولت یہ بات ذہن میں آئی کہ غالب کے فارسی اور اردو مکتوبات کی روشنی میں ان کی نئی سوانح حیات مرتب کی جائے۔ زیر نظر کتاب اسی ادبی کاوش اور نئے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

اپنے مرتب کردہ غالب کے اس سوانح نامہ یا نئی سوانح عمری میں شامل مباحث کا یہ ایک بڑا حصہ ہے۔ اس کی ترتیب کا اسلوب بہت کچھ نیا ہے اور اس میں جو بھی مجھے کامیابی ہوئی ہے اس کے لیے میں غالب کی اپنی تحریروں ہی کا مرہون منت ہوں ۔

یہ خاکہ بہر حال مربوط ہے اور غالب کی زندگی کے بہت سے واقعات اور ذہنی واردے اس میں مرقوم ہیں ساتھ ہی ساتھ اس میں غالب کے سفر فیروز پور جھرکہ قیام لکھنؤ سفر کلکتہ اور اس سے متعلق تفصیلات خصوصیت سے قابل توجہ اضافہ کے ذیل میں آسکتے ہیں کتاب کی ضخامت اتنی ہوگئی کہ اس میں مزید کچھ باتوں کی شمولیت کی گنجائش نہ رہی ورنہ کچھ اضافی امور کی شمولیت بہر حال ممکن تھی۔
ان صفحات کے مطالعہ کے دوران آپ غالب کے حالات، خیالات کے سلسلے میں کچھ اہم واردوں سے گزریں گے جس میں اُن کے اپنے معاملات شامل ہیں۔ ان کی طرف یہاں بطور خاص اشارہ کیا جاتا ہے۔

غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ کی ہندوستان میں آمد اور یہاں شاہی دربار کی طرف سے ان کی پذیرائی یا امیرانِ وقت کی جانب سے ان کے ساتھ کسی سرپرستانہ رویے کی سند و شہادت دستاویزی صورت موجود نہیں۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں نے لکھنؤ، جے پور، حیدر آباد اور الور کی طرف رُخ کیا اس سے متعلق جو حالات ہماری معلومات کا حصہ ہیں وہ بھی غالب کے اپنے نوشتے ہیں ان کے واقعہ وفات بمقام راجگڈھ (الور) سے متعلق ہنوز ہمارا دائرہ معلومات ۔۔ تاریخی ثبوت سے محروم ہے۔
[مرزا نصر اللہ بیگ خاں غالب کے چچا مسٹر پیروں فرانسیسی افسر کے ساتھ اکبر آباد کے نائب قلعہ دار تھے]

غالب کا خود کہنا یہ ہے کہ "شاہجہاں آباد میں میرا باپ عبداللہ بیگ خاں عالم وجود میں آیا میری پیدائش اکبر آباد میں ہوئی ۔۔۔ میری عمر پانچ سال کی ہوگی کہ شفیق باپ کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے چاہا کہ ناز و نعم کے ساتھ میری پرورش کرے تو اس کو اجل نے امان نہ دی . . . . اور مجھے اس ویرانہ آباد میں تنہا چھوڑ دیا اور یہ حادثہ کہ میرے لیے جاں گدازی کا نشان اور آسمان کے لیے دشمنی نکالنے کا وقت تھا ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ میں پیش آیا۔
...... جنرل لارڈ لیک بہادر کی لشکر آرائی و کشور کشائی کے واقعات کے دوران ہوا چونکہ میرے عمِ مرحوم اہل فرنگ کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور چار صد سواروں کے ساتھ سرکشوں سے جنگ میں مصروف تھے۔ سرکار انگریزی نے ان کو اکبر آباد کے قریب دو پرگنے بطور جاگیر عطا کیے تھے"

سپہ سالار انگلشیہ نے آفتاب کے خوں بہا کے طور پر، ہم فقیروں کے کلبۂ تاریک کے لیے چراغ اور ہم بے نواؤں کے تئیں جاگیر کے عوض مشاہرہ مقرر کیا اور فکر معاش کے خار خار جستجو سے فراغ بخشا۔"

ان کے والد کی اچانک وفات کے بعد ان کے بیوی بچوں کی پرورش کے لیے مہاراجہ الور نے دو گاؤں بطور جاگیر دیے جن میں ایک کا نام پالڑا تھا۔ غالب کے اپنے خطوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ۔۔۔ اس سے متعلق کسی دستاویز یا فرمان کا بھی کوئی حوالہ موجود نہیں یا ایسا بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ معلوم ہو کہ غالب انکے چھوٹے بھائی ...... نیز انکی والدہ اور ایک بہن اس سے کب محروم ہوئے اور اس محرومی کی وجہ کیا تھیں۔ انکے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد وہ جاگیر بحق سرکار ضبط ہوئی جو ان کے چچا کو ملی تھی اور تنخواہ بھی باقی نہ رہی مگر چونکہ نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے بڑے بھائی کے یتیم بچوں کی پرورش اور سرپرستی اپنے ذمہ لے لی تھی اس لیے انہیں نصر اللہ بیگ کے وارثوں میں شامل کیا گیا اور لارڈ لیک بہادر نے جو اس وقت افواج انگلشیہ کے سربراہِ اعلیٰ تھے اس کے حق میں ایک دستاویز لکھ دی کہ مرزا نصر اللہ بیگ کے وارثوں کو بسلسلہ پرورش اتنی اتنی پنشن دی جائے

یہی دستاویز تھی جو مرزا نصر اللہ بیگ کے سانحۂ وفات کے بعد پسماندگان کی پرورش کے لیے لارڈ لیک کے دستخط کے ساتھ مرتب ہوئی اور جس کے زیر اثر غالبؔ اور مرزا ئے مرحوم کے دوسرے ورثا کا وظیفہ حیات نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھرکہ ولوہارو کی طرف سے بطور خراج سرکار کمپنی بہادر کو ادا کی جانے والی رقم میں محسوب ہوا۔

غالبؔ نے اپنے مکتوبات فارسی و اردو میں اپنے خاندانی حالات اور بالخصوص اپنے چچا کی جاہ مندی کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

غالبؔ کے خطوط سے ہم ان کے مختلف ادوار زندگی کی روداد ول اور افتادوں کا بھی پتہ چلا سکتے ہیں اور ان کے سوالات خیالات اور نقطۂ نظر سے بھی واقف ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان کی قدیم تاریخ اور اپنے ذہن میں موجود اس کے دیرینہ حال واحوال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

میں ایک طالع ناساز رکھنے والا شخص ہوں، اس جماعت کے حلقہ میں شامل ہوں، قسمت نے جس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اس پر بھی اب قرن بیت رہے ہیں۔ میں ایک ستم زدہ شخص ہوں جس نے کبھی فرخی و فیروزی کا منہ نہیں دیکھا۔ آرایش سخن میری پیش کش ہے میں ترک نژاد ہوں اور میرا نسب نامہ افراسیاب اور زادشم سے جا کر مل جاتا ہے۔ میرے اجداد اس وجہ سے کہ سلجوقیوں کے ساتھ رشتۂ ہم گوہری رکھتے تھے ان کے دور میں انھوں نے سپہ گری و کشور کشائی کا پرچم بلند رکھا۔ جب اس گروہ کی جاہ مندی و خوش نصیبی کا دور دورہ ختم ہوا اور بے نوائی و ناپزیرائی کا زمانہ آگیا تو ان میں سے ایک جماعت تو رہزنی و قزاقی کی طرف مایل ہوگئی، اور ایک نے کشاورزی و زراعت پیشگی کو اپنا وسیلۂ معاش قرار دیا۔"

میرے اجداد کی آرامش گاہ توران کا شہر سمر قند تھا۔ ان لوگوں میں میرا دادا اپنے باپ سے ناخوش ہو کر عازم ہندوستان ہوا اور لاہور میں نواب معین الملک عرف میر منو کی ہمراہی اختیار کی جب معین الملک کی بساط بھی وقت نے الٹ دی تو میرے جد بزرگوار نے دہلی کا رخ کیا اور ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں سے رسم وراہ پیدا کی۔

غالب کی شادی بھی انھی معزز و متموّل گھرانے میں ہوئی ان کی معاشی حالت کی درستی اور ان کی ضروریات کی کفالت میں ان کی بیوی کے مائکے کو کم و بیش دخل رہا۔ مگر وہ اپنی عہدِ شباب کی رنگ رلیوں اور رئیسانہ آزاد مزاجیوں کے باعث مقروض ہوتے چلے گئے۔

جب نواب الٰہی بخش معروف اُن کے خُسر کا انتقال ہوگیا تو قرض داریوں کا بوجھ اور قرض خواہوں کی روش و دوش ان کے واسطے بے حد پریشان کن ہوگئی تو انھوں نے نواب احمد بخش خاں سے ملاقات اور وظیفہ کی رقم پر ان کی طرف سے مزید توجہ فرمائی کی درخواست پیش کرنے کے خیال سے فیروز پور جھرکہ کا سفر کیا ان کی اپنی پریشانیوں میں مزید اضافہ سفر کلکتہ کے باعث ہوا۔

ان کی مالی حالات کی کمزوری میں بطورِ خاص اس قرض کو دخل تھا جس کا بڑا حصہ پنشن کے مقدمہ کے سلسلے میں سفر کلکتہ کے زمانے سے بطور خاص تعلق رکھتا تھا جس کی تلافی کی کوئی صورت آئندہ پیدا نہ ہوئی۔ شروع میں وہ یہ سوچتے تھے کہ جو روپیہ مجھے اتنے زمانے تک کم ملا ہے میرا استحقاق ثابت ہونے پر وہ بڑی رقم مجھے یک لخت مل جائے گی اور ساری مشکلات دور ہو جائیں گی۔

غالب نے اپنے وثیقہ سے متعلق دستاویز کی مخالفت میں جو دلائل اپنی عرض داشت میں پیش کیے اُن پر گورنر جنرل بانظمائے کونسل نے کوئی توجہ نہ دی اور نتھروں سے سر ٹکرانے کی بات جو انھوں نے کہی تھی وہ کلکتہ سے انگلستان تک دہرائی جاتی رہی۔

اپنی مالی پریشانیوں میں مبتلا رہنے کے دنوں میں بھی غالب کے خطوط ان کے کوائف حیات کے ساتھ اس دور گزراں کی ایک متحرک تصویر پیش کرتے نظر آئے اس میں نواب شمس الدین احمد خاں کے ولیم فریزر کے قتل کی سازش میں ملوث پائے جانے کی وجہ سے موت کی سزا اور ان کے مقدمہ کی کارروائی بھی شامل ہے۔ غالب کے اپنے زمانہ کی تاریخ کے واقعات ان مکتوبات میں مل جاتے ہیں اور دہلی کا وہ سیاسی اور انتظامی منظر نامہ بھی جس میں غالب کی زندگی گزری۔

غالب کی سیرت وسوانح پر ان کے دور حیات کے بعد جو خصوصی توجہ دی گئی اُنکے پیشِ رواُن کے شریک عصر اور بعد کے اردو شعرا اور ہندوستان کے فارسی ادب نگاروں میں کم ہی ایسے خوش قسمت اہل شعر و شعور اور ارباب فکر و فن ہوں گے جو اس سطح اور اس طرح کی توجہ فرمائیوں کے مستحق قرار پائے۔ مولانا حالی، مولانا غلام رسول مہر، جناب مالک رام (آنجہانی)، اور شیخ محمد اکرام جیسے صاحبان علم و خبر نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اپنی طرف سے اس سلسلۂ دید و دریافت میں گراں قدر اضافے کیے۔

غالب نے خود بھی شعوری و نیم شعوری طور پر اپنے کلام کی جمع آوری وا پنے نثری شہ پاروں کی شیرازہ بندی و تحفظ کاری میں حصّہ لیا — ان کے اردو کلام کے بعض قلمی مجموعے اور فارسی خطوط کے نادر نسخے ان کی وفات کے برسہا برس بعد دریافت ہوئے اور ان بازیافتوں نے ان کے ذہن اور زندگی کے بعض فکری اور ذہنی گوشوں کا اضافہ کیا اور تحقیق و تنقید کے دائروں میں نئی وسعت آئی اور جدید جہتوں کی طرف پیش رفت ممکن ہوئی۔

راقم الحروف نے ان کی چار سوانح عمریوں کا اس غرض سے بطور خاص مطالعہ کیا کہ ان سے روشنی اور رہنمائی حاصل کی جا سکے۔ اس سلسلۂ دید و دریافت میں ان کی بعض نارسائیوں اور تسامحات پر نظر گئی۔ ان پر ضروری گفتگو اور نشاندہی کو بعد کے ناقدین اور تبصرہ نگاروں نے شاید قابل اعتنا تصور نہیں کیا جب کہ تحقیقی زاویہ نگاہ سے ان کا سامنے آنا ضروری تھا۔

بعض نارسائیوں کی بڑی وجہ راقم سطور کی محدود نظر کے مطابق غالب کی اپنی تحریروں سے استفادہ نہ کرنا تھا، جب کہ اس کے مواقع بہر صورت موجود تھے۔ خاص طور پر پنج آہنگ میں شامل غالب کے فارسی خطوط جو غالب کی اپنی زندگی ہی میں اشاعت پزیر ہو چکے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر نے غالب کے فارسی خطوط سے کافی و شافی طور پر استفادہ کیا مگر ان کے یہاں غالب کے سوانحی مسائل پر تاریخی سلسلے سے گفتگو نہیں آئی ایک ہی موضوع پر شروع سے آخر تک سلسلہ بندیوں کو جاری رکھا اور تاریخی نقطۂ نظر سے سوانحی واقعات کو درج نہیں کیا جا سکا۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے " غالب کی کہانی ان کی اپنی زبانی " ایک مختصر کتابچہ کی صورت میں پیش کر دی جو سوانح غالب کے سلسلہ میں ایک لائق توجہ اور قابل تحسین کام ہے۔ غالب کے فارسی خطوط "مشمولہ پنج آہنگ" نیز نامہ ہائے فارسی غالب مرتبہ علی اکبر ترمذی کے ترجمہ کے وقت یہ احساس ہوا کہ غالب کے فارسی خطوط میں ان کے سفر کلکتہ، وہاں کے قیام لکھنؤ اور فیروز پور جھرکہ نیز لوہارو کے سفر اور مقصد سفر سے متعلق بہت سی بیش قیمت معلومات موجود تھیں جن سے ان کے سوانح ناموں کے مرتبین نے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ پنج آہنگ میں شامل غالب کے خطوط جو ان کی زندگی ہی میں چھپ کر سامنے آچکے تھے خود یادگار غالب، میں ان سے کوئی صرف نہیں لیا گیا۔ " نامہ ہائے فارسی " کی طباعت پر بھی ایک ثلث صدی کے قریب، مدت بیت رہی ہے مگر اس کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں کہ غالب کی سوانح اور سیرت کے مطالعہ میں ان سے کوئی خاص استفادہ کیا گیا ہو۔

راقم کے ذہن میں اس سے یہ بات آئی کہ غالب کے اردو خطوط اور بالخصوص فارسی مکتوبات کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی اور اس کے پس منظر میں موجود ان کے سوانح نامہ کو مرتب کیا جائے اور حیات غالب کے مزید کچھ گوشے ان کی اپنی تحریروں اور خاص طور پر خطوط سے اخذ و انتخاب کے ساتھ مکمل کیے جائیں۔

شروع سے آخر تک اس میں صرف انتخابات نہیں دیئے گئے بلکہ جو مواد اخذ کیا گیا اس کو شامل کرتے ہوئے اس پر ضروری گفتگو اسی کی روشنی میں کی گئی ہے تاکہ تحریر کا تسلسل اور مطالعے کا تاثر باقی رہے۔ اس اعتبار سے یہ تالیف سر تا سر غالب

کے اپنے مکتوبات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے لیکن اس کے ہر صفحے یا ہر ورق میں غالبؔ کی اپنی تحریر شامل ہو ایسا ضروری نہیں سمجھا گیا یہ غالبؔ کے خطوط سے اخذ مواد واستنباط نتائج کی ایک ادبی کوشش ہے۔ اور اس کے علاوہ مطالعہ یا اثر و تاثر ہے جو اس سے حاصل کیا گیا ہے۔

غالب کے خطوط کے ماسوا ان کی نظم ونثر کے بہت سے تخلیق پارول اور نگارش ناموں میں اُن کے سوانح نامہ کا کوئی ذہنی زاویہ اور سوانحی گوشہ سامنے آتا ہے یا آسکتا ہے مگر ایک ایک بات پر توجہ دہی اور اس مختصر سوانحی خاکے میں اس کی شمولیت اس کی اپنی کتابی حدود کو دیکھتے ہوئے ممکن نہ تھی۔

اس کے قارئین میں کچھ افراد اسے چند کلیوں پر قناعت کرنا کہہ سکتے ہیں اور اس گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں کی طرف اشارہ سنج ہوسکتے ہیں مگر میرا "فریم ورک" سردست یہی تھا جس کی نارسائیوں سے بھی کلیتاً صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ۔ ۔ غالبؔ کی تصانیف نظم ونثر کا ادبی وتنقیدی کام الگ ہے اور فارسی شاعری کا مطالعہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور اس کتاب کو ایک الگ حصہ کے طور پر فکر ونظر اور تحریر ونگارش کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔

غالب کے خطوط کی روشنی میں میری اس کوشش کے نتائج اس کتاب کی صورت میں آپکے سامنے ہیں اس کا تمام تر مواد غالب کے خطوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ اب یہ میری محدود نظر کم سوادی بلکہ کم استعدادی کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ ان کی سیرت اور سوانح کے بعض گوشے ہنوز تشنۂ توجہ رہ گئے ہوں۔

اب تک غالب کی جو اہم سوانح عمریاں شائع ہوئی ہیں ان میں یادگار غالب، حیات غالب اور غالب نامہ شامل ہیں۔ یہ سوانح عمریاں ہمارے بڑے اہلِ علم حضرات اور ماہرینِ غالبیات کی ترتیب فرمودہ دستاویزیں ہیں۔ ان سے استفادہ کیا جانا چاہیے اور اب تک یہی تصانیف ہمارے لیے روشنی اور رہنمائی

کا وسیلہ بنی رہی ہیں۔

اب یہ الگ بات ہے کہ یہ جس نوعیت کی سوانح عمریاں ہیں اس کی اپنی کچھ حدیں ہیں۔ اور ان حدوں میں رہتے ہوئے کچھ تسامحات اور نارسائیاں ایسی بھی ہیں ان کے مطالعے کے دوران، جن کا شدت سے احساس ہوتا ہے اسی احساس کے تحت ان کا ایک تنقیدی جائزہ الگ پیش بھی کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے ان اکابر کی یہ مستحسن کوششیں جو غالب کی سوانح عمریوں کی صورت میں سامنے آئی ہیں ان کی اپنی نارسائیاں کیا ہیں اس پر تعجب ہوتا ہے کہ ان نابغوں کی توجہ ان خامیوں کی طرف کیوں نہیں گئی۔ اور سوانح غالب کے تشنہ گوشے جن کی تکمیل غالب کے خطوط کی طرف توجہ دیے جانے کے بعد یہ ادنیٰ کوشش ممکن تھی، وہ ان تصانیف میں کیوں باقی رہے۔

فارسی زبان ان سب قابلِ احترام اشخاص کو آتی تھی اس کے باوجود انھوں نے مطبوعہ خطوطِ فارسی سے کوئی استفادہ نہیں کیا، نامہ ہائے فارسی غالبؔ بھی اب سے تیس اکتیس برس پہلے اشاعت کی منزل سے گزر چکے تھے ان سے بھی ضروری مواد کے حصول کی کوئی کاوش بعد کے مرتبین سوانح کی طرف سے عمل میں نہیں آئی۔ جیسا کہ پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے محبّی ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے ایک مختصر تالیف کی صورت میں غالبؔ کے مکتوبات سے ایک اردو سوانح نامہ ترتیب دیا ہے جو چھپ چکا ہے اس کے بعد غالبؔ کے اس نئے سوانح نامے کو ترتیب دینے کی خواہش اس لیے راقم الحروف کے دل میں باقی رہی۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم بھی یہ کام انجام دے چکے ہیں۔ ان کے ان خطوط سے ان کی زندگی کے بہت سے واقعات کو اخذ کیا گیا ہے جو ابتدائی دور جہات سے متعلق بھی ہیں اور بعد کے زمانے سے بھی، نیز آخری دور سے بھی ان کی ذہنی زندگی کے مرقعے، یہ کہیے کہ سرتاپا مکتوبات ہی سے تیار کیے گئے ہیں اور ان صفحات اور اوراق کے وسیلے سے ان کے زمانہ زندگی کی سیر، متحرک اور متاثر کن صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔

غالبؔ کی حیات اور ان کے ذہن و زندگی کے بیشتر مرحلے ان کے مکتوبات میں موجود ہیں۔ ان مکتوبات کی براہ راست یا بالواسطہ سیاحت کیے بغیر غالب کی روداد فکر و نظر کو پورے طور پر نہیں سمجھا جا سکتا ان کے واقعات زندگی کی ترتیب اور تسوید بھی ممکن نہیں یہاں تک کہ ان کی بعض شعری نگارشات کے مفہوم و مطالب تک پہنچنے میں بھی یہی خطوط اور ان کی تحریروں میں موجود منہ بولتی تصویریں ہمارے کام آتی ہیں۔

بہر حال آنے والے صفحات میں اس کتاب کے قاری اس کا مطالعہ کر سکیں گے اور استفادے کی نوعیت کو سمجھ سکیں گے میں اس کے لیے اپنی ان تمام شاگرداؤں کا خاص طور پر مرہونِ منت ہوں جنھوں نے ان صفحات و اوراق کی نگارش میں میری مدد کی اور ابتدا سے آخر تک تعاون کیا۔ اسی کے ساتھ غالب اکیڈمی اور اس کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر عقیل کا بھی تہہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو اپنی نگرانی میں چھپوانے کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

میں ان احباب کا بھی ممنونِ لطف و کرم ہوں جنھوں نے اس بارۂ خاص میں مجھے وقتاً فوقتاً اپنے مخلصانہ مشوروں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

تنویر احمد علوی

۲۲/جنوری ۲۰۰۳ء

غالب کا سوانح نامہ

(حسب و نسب)

تو ایکہ محو سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکر غالبؔ کہ در زمانہ تست

غالبؔ کے ادبی جینیس سے انکار کی گنجایش باقی نہیں۔ لوح و قلم کے اعتبار سے ان کی فتوحات کے درخشاں دائرے اور غیر معمولی عبقریت کے نشانات کا سلسلہ الگ ہے۔ اس پر گفتگو ہوتی رہی ہے اور آئندہ ہوتی رہے گی مگر جہاں تک ان کے نسب نامے کا سوال ہے اس سے متعلق ہماری معلومات محدود ہیں اور یہ محدود معلومات بھی غالب کے قلم اور زبانِ قلم ہی کی مرہون منت ہیں۔۔ ان پر کوئی اضافہ کسی اور وسیلہ سے ہنوز ممکن نہیں ہوا۔

وہ اپنے آپ کو "پشنگی" اور افراسیابی کہتے ہیں۔ افراسیاب قدیم ترک یا تورانی قبائل کا ایک معروف مگر نیم تاریخی کردار ہے جو ایران و توران کی روایاتِ کہن کا نمائندہ ہے اور دیرینہ داستانوں کی طرح زبان زدِ عوام و خواص رہا ہے۔ شاہنامے کے بار بار دہرائے جانے والے شعر میں رستم کی مراد یہی افراسیاب ہے

اگر جز بکام من آید جواب
من و گرز و میدان و افراسیاب

پشنگی بھی کبھی کبھی — قدیم نام کے ساتھ لکھا ہوا مل جاتا ہے۔ یادگار غالب میں پشنگ کی حاشیائی تشریح میں واضح کیا گیا ہے کہ پشنگ افراسیاب کے باپ کا نام تھا۔ غالبؔ کے ایک فارسی قطعہ میں پشنگ اور افراسیاب دونوں نام آئے ہیں۔

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم
دانی کہ اصلِ گوہرم از دودۂ جم است

میراثِ جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار
زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

ترجمہ: اے ساقی میں پشنگی و افراسیابی ہوں اور ان تورانی روایتوں کا امین ہوں، تجھے یہ بات معلوم ہے کہ میں اپنی اصل اور گوہر کے لحاظ سے جمشید کی نسل سے ہوں۔ جمشید کی میراث

شراب ہے (کہ اسی کے وقت میں افشردہ انگور سے مے کشید کی گئی تھی)۔ آج اس دنیا میں یہ میرا جائز ورثہ سمجھ کر مجھے لوٹا دے۔ آنے والی زندگی میں بہشت میری میراث ہوگی کہ میں ابن آدم ہوں۔ (باغ بہشت ہی سے آدم کو شجر ممنوعہ چھو لینے پر نکالا گیا تھا اور آئندہ خدائی بخشش وعطا کے طور پر یہ مجھے مل جائے گی)۔

اور اسی کے ساتھ ایک فارسی رباعی میں زادشم کا نام آیا ہے جسے مولانا حالی کی حاشیائی تشریح کے مطابق افراسیاب کے دادا کا نام قرار دیا گیا ہے' وہ فارسی رُباعی یہ ہے

غالب بہ گہر ز دودہ زادشمم ۔۔۔ زاں رو بصفائی دمِ تیغ است دمم
چوں رفت سپہ گری ز دم چنگ بہ شعر ۔۔۔ شد تیر شکستہ نیاگاں قلم"

ترجمہ: اے غالب میں اپنی اصل اور گوہر و نسل کے اعتبار سے زادشم کی اولاد سے ہوں اسی وجہ سے میرا نفس صفائی و جوہرداری میں تلوار کی تیز دھار کی طرح ہے جب سپہ داری مجھ سے چھوٹ گئی اور تیر و طبر سے رشتہ ٹوٹ گیا تو میں نے اپنے آبا کے شکستہ تیر سے قلم بنا لیا۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی زبان میں فکر شاعرانہ اور ادائے ترکانہ کے اعتبار سے تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھری ہوتی ہے اور اپنے قلم کو تیرِ شکستہ نیاگاں کا تراشا کہنا انہیں زیب دیتا ہے اپنے ذہن میں موجود اسی افراسیابی نسب نامہ کی وجہ سے وہ یہ کہنے میں بے باک نظر آتے رہیں۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

ان کے والدان کے عمّ نامدار دونوں سپہ داری کے پیشہ سے وابستہ تھے اور تا حیات وابستہ رہے مگر غالب کی اپنی زندگی سے سپاہی پیشگی کا رشتہ قلم اور زبان کی حد تک ہی رہا۔

بقول مولانا حالیؔ "مرزا نے اپنے عُلوئے خاندان پر جا بجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے"۔ یہ اشعار لطف سے خالی نہیں۔

قطعہ

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم ۔۔۔ لاجرم در نسب فرہ مندیم

ترک زادیم در نژاد ہمی | بہ سترگانِ قوم پیوندیم،
ایبکیم از جماعۂ اتراک | درتمامیٔ زِ ماہ ' دہ چندیم
فنّ آبائے ما، کشاورزیست | مُرزبان زادۂ سمرقندیم

ور زمعنی سخن گزار دہ | خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیضِ حق را کمینہ شاگردیم | عقلِ کُل را بہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش، بہ برق ہم نفسیم | ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم | بہ معاشے کہ نیست خرسندیم

ہمہ بر خویشتن ہمی گرییم
ہمہ بر روزگار می خندیم

(ترجمہ) اے غالب ہم خاکِ پاک توران سے تعلّق رکھتے ہیں۔ لازماً ہم اپنے نسب نامے کے لحاظ سے قابلِ احترام و لایق ستایش ہیں۔ ہم ترک نژاد ہیں اور اپنی زاد و بوم کی نسبت سے ہماری قوم اپنے بزرگوں کی صفات سے آراستہ ہے۔

ہم ترکوں کی جماعت میں "ایبک" کہلانے والے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں (مولینا حالی کی حاشیائی تشریح کے مطابق ایبک پورے چاند کو کہتے ہیں) جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم مکمل و کامل ہونے کی صفت میں چاند سے دہ چند ہیں۔ ہمارے جدّ و آبا کا پیشہ کشاورزی، (کاشت کاری و باغ بانی) رہا ہے اور اس معنی میں ہم سمرقند کے مرزبان زادوں میں سے ہیں۔

اور اگر کوئی سخن وری اور لفظ و معنی کی حُسن کاری کے زاویۂ نگاہ سے ہمیں دیکھے تو ہم اپنی زبان سے کیا کہیں کہ ہم کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ فیض حق کے تئیں ہم کمترین شاگردوں میں سے ہیں اور عقلِ کُل کی بہترین اولاد ہیں۔

ہم تابانیوں اور درخشانیوں میں بجلیوں کے ہم نفس ہیں اور بخشش و کرم گستری میں موتی برسانے والے بادل کی طرح ہیں۔ ہم جو بھی اپنی تلاش اور جستجو سے حاصل

کرے ہیں اُسے اپنی خوش بختی و فتح مندی خیال کرتے ہیں۔ اور جو حاصل نہیں کر سکے اس پر شکوہ سنج نہیں شکر گزار ہوتے ہیں۔

ہم اپنے ہی غموں پر آنسو بہاتے اور اپنی چشم نم کے ساتھ زمانے پر ہنستے ہیں۔

اس قطعہ کے شروع میں مرزا نے اپنے آبائی نسب نامے پر فخر و مباہات کا اظہار کیا ہے اور اس کے بعد اپنی نسلی برگزیدگی کے ساتھ کردار و اطوار اور رفتار و گفتار کے قابلِ تحسین پہلو نمایاں کیے ہیں کہ ہم کس طرح حسبی اور نسبی اعتبار سے دنیا پر خندہ زنی کا — حوصلہ رکھتے ہیں۔ اس میں غالبؔ کے اپنے شخصی کردار کی روشن و متحرک پرچھائیاں موجود ہیں۔

مرزا غالبؔ نے اپنے خاندان اور قبائل سلجوق سے نسبت رکھنے والی جس روایت کو "مہر نیم روز" کے دیباچہ میں پیش کیا ہے ہم اسے یہاں اس ترجمہ کی صورت میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

اس نامہ نگار کا خاندان افراسیاب و پشنگ کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

... "کیخسرو" کی آستینِ عداوت سے جب اس نور دیدۂ توران کا چراغ ہستی گل ہو گیا۔ تو پشنگیوں کی جہاں داری کا دن بھی بے نور ہو گیا۔ وہ لوگ جو کبھی صاحب تخت و تاج تھے اُن کے ہاتھ میں سوائے تیغ جوہر دار کے کچھ نہ رہا، یوں بھی یہ تورانیوں کی تمدّنی روایت تھی کہ باپ دادا کے ترکہ و میراث میں سے تلوار کے ماسوا اور کچھ نہ ملتا تھا۔

وہ شمشیر بدست لوگ دوسرے علاقوں کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور تیغ زنی کو اپنا وسیلہ معاش قرار دیا انہیں خس پوش فرودگاہوں اور پہاڑوں میں نشیمن رکھنے والے لوگوں میں سلجوقی بھی تھے جنھوں نے اپنے سروں کو تاج اور تاج کو گوہر و الماس سے سجایا اور اس چرخِ گرداں نے جیسا کہ اس کا کردار ہے ان کے کاؤس جیسے نقارہ و علم رکھنے والوں کو پھر ان بلندیوں سے نیچے گرا دیا۔

اس بیان کے ساتھ انھوں نے یہ دو فارسی شعر بھی قلم بند کیے ہیں۔

در مشرب ما خواہش فردوس نہ جوئی   در مجمع ما طالعِ مسعود نہ یابی

در بادۂ اندیشہ ما دُرد نہ بینی　　در آتش ہنگامۂ ما دود نہ یابی

ترجمہ:، ہمارے مشرب میں جنت کی خواہش کو تلاش مت کرو، ہمارے مجمعوں تمہیں خوش بختیاں نہیں ملیں گی ـــــ ہماری صہبائے فکر میں تلچھٹ کبھی نہ پاؤگے اور ہماری ہنگامہ آرائیوں کی آگ میں کبھی دھواں نظر نہ آئے گا' اپنے آبا و اجداد اور خاندانی سلسلہ کے بارے میں غالب نے لکھا ہے۔

دادائے من از پدر خود رنجیدہ آہنگِ ہند کرد و در لاہور ہم رہی معین الملک گزید چوں بساطِ معین الملک در نوشتند بدہلی آمد و بہ یاری ذوالفقارالدولہ مرزا نجف خاں بہادر پیوست ازاں پس پدرم مرزا عبداللہ بیگ خاں در شاہجہاں آباد وجود آمد و من　در اکبرآباد بلہ . . .

ترجمہ: "میرے دادا نے اپنے باپ سے رنجیدہ ہو کر ہندوستان کا رُخ کیا اور شہر لاہور میں معین الملک کی ہم راہی اختیار کی۔ جب معین الملک کی بساط اُلٹ گئی۔ وہ دہلی آئے اور ذوالفقارالدولہ مرزا نجف خاں بہادر کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئے میرے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں شاہجہاں آباد میں تولد ہوئے اور میری پیدائش اکبرآباد میں ہوئی"۔
مہر نیمروز کے دیباچہ میں بھی اسی صورت حال کو قدرے مختلف انداز سے پیش کیا ہے جس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

. . . اس قافلہ کے مسافرانِ دورِ آخر میں میرے دادا، جن کی ولادت علاقۂ ماوراالنہر کے شہرِ سمرقند میں ہوئی تھی' اس سیل رواں کی طرح جو بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے ہندوستان میں ورود فرما ہوئے اور ذوالفقارالدولہ کی شاہی سپاہ کے دفتر میں ان کا نام لکھا گیا اور پرگنہ پہاسو' اُن کے رسالے اور ذات کی تنخواہ و جاگیر میں مرحمت ہوا۔[لہ]

ا،[لہ] غالب، غلام رسول مہر: ۳۲ ـــــ ۳۳۔

غالب کے خاندانی سلسلہ کو ان کی اپنی روایت کی روشنی میں دیکھنا ہوگا کسی تاریخ کے ذیل میں نہیں کہ اس کے حق میں کوئی معاصر شہادت موجود نہیں ۔ غالب ایسا سوچتے اور کہتے تھے ممکن ہے یہ باتیں انھوں نے کسی صورت میں اپنی دادی یا پھوپی سے اپنے بچپن میں سُنی ہوں۔

ان کے دادا مرزا قوقان بیگ جو غالب کے اپنے بیان کے مطابق سلطان زادہ ترم خاں کی اولاد میں تھے کسی وجہ سے اپنے خاندان سے خفا ہو کر تلاشِ ملازمت اور فکرِ معاش میں ہندوستان آگئے اور کچھ زمانے تک وہ اپنے پیشۂ سپہ گری کے ساتھ نواب میر قمرالدین خاں عرف میر منّو کی سرکار سے وابستہ رہے وہ دور سلطنت کے انحطاط و انتشار کا دور تھا احمد شاہ ابدالی کے حملے شروع ہو چکے تھے ۔ نواب میر منّو کی وفات کے بعد جب وہ کارخانہ درہم برہم ہوا تو انھوں نے دہلی کا رُخ کیا اور نواب نجف علی خاں کے دامن دولت سے وابستگی اختیار کی کچھ وقت کے بعد امیر الامرا نجف علی خاں نے انہیں شاہِ عالم ثانی کے دربار میں پہنچا دیا۔

اگرچہ سلطنت میں ضعف آچکا تھا پھر بھی شاہ عالی جاہ نے ماورا النہر کے ایک سپاہی زادے کی قدر افزائی کی عَلَم و نقّارہ سے ممتاز کیا۔ پرگنہ پہاسو رسالے کی تنخواہ و جاگیر کے طور پر عطا ہوا۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے۔

"مرزا غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ شاہ عالم ثانی کے زمانہ حکومت میں علاقہ ماورالنہر سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے اگرچہ سلطنت میں ضعف آچکا تھا پھر بھی جوہر قابل دیکھ کر شاہ عالم پناہ نے فی الجملہ قدر دانی و سرپرستی کی شاہی ملازمت میں لیے گئے اور جاگیر و تنخواہ سے سرفراز کیے گئے۔"[1]

شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں ان کا مغل دربار سے تعلّق ہوا اور دہندوستان وہ محمد شاہ کے آخری دور میں ہو چکے تھے۔

مرزا قوقان بیگ کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں دو بیٹوں سے متعلق غالب کے یہاں ۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق اُن کی معاصر تحریروں میں کوئی اشارہ نہیں ملتا غالباً وہ گمنام رہے۔

---

[1] یادگارِ غالب:

مرزا فوقان کے ایک بیٹے مرزا عبداللہ بیگ خاں اور دوسرے مرزا نصراللہ بیگ خاں تھے اوّل الذکر مرزا غالب کے والد محترم اور دوسرے اُن کے عمِ مکرّم تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں نے بھی اپنی خاندانی روایت کی پیروی کی اور آبائی پیشہ "سپہ گری" کو اپنایا۔۔۔۔ دہلی میں قسمت آزمائی کے بجائے لکھنؤ، حیدرآباد اور آخر میں الور کی طرف رُخ کیا۔ مولانا غلام رسول مہر کا بیان ہے۔

"غالب کے والد پہلے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے پاس نوکر ہوئے پھر حیدرآباد چلے گئے اور نظام علی خاں کے پاس تین سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ ملازم رہے"۔

ان کی شادی خواجہ غلام حسین کمیدان کی صاحب زادی سے ہو چکی تھی آگرہ سے راجہ بختاور سنگھ والیِ الور کے پاس بغرض ملازمت پہنچے۔ لیکن کوئی صورت مُمد عابر آری کی پیدا نہ ہوئی مایوس ہو کر واپس ہو رہے تھے کہ ایک سرکش زمیندار کے خلاف جو ریاستی فوج بھیجی گئی اس میں ان کو بھی شامل کر لیا گیا۔ راج گڈھ کے مقام پر صف آرائی کے دوران ان کو گولی لگی اور وہ وہیں شہید ہو گئے۔ [1] غالب نے مہاراجہ شیو دھیان سنگھ کے متعلق ایک قصیدہ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست   در خاکِ راج گڈھ پدرم را بود مزار

مولینا حالی اور مالک رام صاحب نے بھی ــــــ اسی روایت کو دُہرایا ہے۔

اس سانحہ کے بعد ان کی کفالت و سرپرستی ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے کی جو آگرہ کے نائب صوبیدار تھے انگریزوں کی عمل داری کے بعد صوبہ داری کمشنری میں بدل گئی۔ غالب نے اس صورت حال کا ذکر اپنے ایک خط میں بایں الفاظ کیا ہے۔

" نصراللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کا صوبے دار تھا۔۔۔۔ اس نے مجھے پالا۔ جنرل (لارڈ) لیک کا عمل ہوا۔ صوبے داری کمشنری میں بدل گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز افسر مقرر ہوا۔ لارڈ لیک نے میرے چچا کو سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا بریگیڈیر مقرّر ہوا ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ سال کی جاگیر تاحینِ حیات مقرر ہوئی"۔ [2]

---

[1] غالب: ۳۷۔   [2] ایضاً ۳۹۔

نصراللہ بیگ خاں واب احمد بخش خاں کے بہنوئی تھے اور دونوں میں بہت خوش گوار تعلقات تھے۔ نواب صاحب کا لارڈ لیک بہادر سے بھی یک گونہ دوستی اور باہمی اعتماد کا رشتہ تھا۔

مرہٹوں کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد انھوں نے لارڈ لیک سے کہہ کر نصراللہ بیگ خاں کو انگریزی فوج میں رسالداری کا منصب دلوادیا اور ان کی ذات اور رسالے کے لیے نواح آگرہ کے دو پرگنے سونک اور سونسہ مقرر کرادئے۔"

ابھی زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ مرزا نصراللہ بیگ خاں کا ہاتھی سے گر کر انتقال ہوگیا۔ اس حادثہ میں ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ شدید طور پر زخمی ہوگئے تھے۔ یہی ان کی موت کا بہانہ ہوا۔

یہ سنہ ۱۸۰۶ء کا واقعہ ہے اس وقت مرزا غالب کی عمر آٹھ نو برس کے مابین تھی، مرزا یوسف ان کے چھوٹے بھائی اسی نسبت سے ان سے عمر میں اور بھی دو برس کم تھے۔

مرزا غالب نے لکھا ہے کہ اس کے بعد نصراللہ بیگ خاں کے پسماندگان کے لیے انگریزی حکام نے "خوں بہائے آفتاب" کے طور پر وظیفہ مقرر کردیا۔ حکومت کی منظور کردہ تجویز کے مطابق ایک شقہ نواب احمد بخش خاں کو لکھا گیا کہ کمپنی بہادر کو مرحوم مرزا نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندگان کی پرورش منظور ہے اور اس سلسلہ میں نواب کی جاگیر پہ جو پچیس ہزار روپے سالانہ زرِ خراج واجب ہوتا ہے اس میں سے دس ہزار روپیہ نصراللہ بیگ خاں کے متعلقین کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں، پندرہ ہزار کی رقم ان پچاس سواروں کے اخراجات کے سلسلہ میں معاف کی گئی۔ جو نصراللہ بیگ خاں نے مقرر کیے تھے۔"

یہی سند آگے چل کر غالب اور نواب احمد بخش کے مابین اختلاف رائے پیدا ہونے کی بنیاد بنی۔ (جس پر آئندہ گفتگو آئے گی)

غالب کی عمر آٹھ نو برس کے درمیانی عرصہ میں فارغ البالی اور خوش حالی کے ماحول میں گذری خواجہ غلام حسین کمیدان نے جو اُن کے جدِّ مادری تھے اپنے زمانۂ ملازمت و کار کردگی میں اچھی خاصی دولت اور شہری جائداد بنالی تھی ---- غالب کے والد

بھی خانہ داماد کی حیثیت سے اپنی سسرال ہی میں رہتے ہوں گے کہ غالب نے دہلی میں کبھی ایسے مکان کی موجودگی کی طرف اشارہ نہیں کیا جو ان کا جدّی یا آبائی مکان ہو۔

ان کی ننھیال میں جو حویلی ان کی سکونت گاہ تھی اس کا اور اس کے ہمسایہ مکانات کا ذکر ان کے ایک خط میں اس طور پر آیا ہے [یہ خط انھوں نے منشی شیو نرائن کو لکھا ہے اور اس میں اُن کے خاندان سے اپنے ننھیالی رشتے داروں نیز اپنے تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے۔]

"ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان میں تھے ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب لکھمی چند سیٹھ نے مول لے لی ہے اس کے دروازے کی سنگیں بارہ دری پر میری نشست رہتی تھی۔ ــــ اور پاس کی ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک اور کٹڑا کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹڑا کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا اُس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پیچ لڑا کرتے تھے۔"[1]

یہ متعلقہ مکانات کی تفصیل ہے اور یہ سب بظاہر مرزا غالب کے نانا کی ملکیت ہیں۔ مولینا حالی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس خط کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا کی آگرہ میں ایک اچھی خاصی سرکار تھی۔ . . . . اور مرزا کا بچپن اور عنفوان شباب بڑے ناز و نعم میں بسر ہوا تھا"[2]

ــــــــــــــــــــــــــــــــ

د آگے چل کر شادی ہوئی تو وہ بھی بحیثیت مجموعی ایک خوش حال خاندان اور شریف گھرانے میں ہوئی۔

تعلیم و تربیت کا ماحول ان حالات کے مطابق ہی رہا ہوگا لیکن مرزا غالب کی طبیعت میں جو آزادہ روی تھی اس نے بھی ممکن ہے کچھ اثر ڈالا ہو اور وہ روایتی سطح پر

ــــــــــــــــ

[1،2] یادگار غالب: ۱۶ ایضاً ۱۶

حصول تعلیم کی طرف کماحقہٗ توجہ نہ دے سکے ہوں۔

حالتِ صبا میں ان کو اپنے زمانہ کے کس عالِم یا کن عالِموں کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کرنے کا موقعہ ملا اس ضمن میں ہماری معلومات کچھ زیادہ آگے تک نہیں جاتیں مولینا حالیؔ نے اس بارۂ خاص میں مولوی محمد معظّم کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

"شیخ محمد معظم جو اس زمانے میں آگرہ کے ، نامی مُعلّموں میں سے تھے ان سے تعلیم پاتے رہے" زمانۂ طالب علمی یا اس کے کچھ بعد کا ایک ادبی لطیفہ بھی مولانا حالیؔ نے اس موقعہ پر درج کیا ہے جس سے غالبؔ کے حُسنِ طبیعت اور فارسی زبان اور اس کی ادبیات سے ان کے گہرے لگاؤ اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔

ایک دن مرزا غالب نے اپنی ایک فارسی غزل میں " یعنی چہ " کے بجائے " کہ چہ " ردیف استعمال کی . . . . مولوی صاحب نے اسے مُہمل قرار دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد مرزا نے مُلّا ظہوریؔ کے کلام سے اس کی سند پیش کی تو وہ اپنے ہونہار شاگرد کی خداداد ذہانت اور جدّت کے قائل ہوگئے۔"

ان کے عنفوانِ شباب کے اساتذہ میں مُلّا عبدالصمد کا نام بھی آتا ہے اس ضمن میں مولینا حالیؔ کی روایت یہ ہے۔

مرزا کی عمر چودہ برس تھی جب مُلّا عبدالصمد اُن کے مکان پر وارِد ہوا۔ اور کُل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ ایک برس آگرہ میں اور ایک برس دلی میں، مرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔" [1]

آگے چل کر مولینا نے یہ بھی لکھدیا ہے۔

اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبداءِ فیاض کے ماسوا کسی سے تلمّذ نہیں اور عبدالصمد ایک "فرضی نام" ہے چونکہ لوگ مجھ کو بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔" [2]

مولانا حالیؔ کا غالب رجحان یہ بھی ہے کہ "ملّا عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد شخص تھا۔

---

[1] × [2] یادگارِ غالب : ۱۴ —— ۱۳ ۔

مرزانے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی چنانچہ مرزا نے جا بہ جا اس کے تلمذ پر فخر کیا ہے اور اس کو بلفظ 'یمسار' سے یاد کیا ہے۔ جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے " لے

قاضی عبدالودود نے اپنے ایک تحقیقی مقالے میں ملا عبدالصمد کو غالب کا فرضی استاد قرار دیا ہے کہ اس پارسی نژاد شخص کا کوئی خارجی وجود نہیں۔ آگرے اور دہلی کا کوئی شخص اس کی آمد اور قیام سے کسی سطح پر بھی آگاہی نہیں رکھتا نواب شیفتہ نے اس کے سلسلہ میں غالب ہی کی روایت کو دُہرایا ہے کہ اس نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا

"کہ اے عزیز چہ کسی کہ بایں آزاد گیہا بار بار در خاطرم می گذری"

مالک رام صاحب کی رائے بھی وہی رائے ہے جو مولینا حالی کی ہے ہاں اس میں یقین و وثوق کی فضا حالی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔

مرزا کے اساتذہ میں میاں نظیر کا نام بھی آتا ہے نظیر سے مرزا غالب کے سلسلہ تلمذ کی روایت حکیم قطب الدین باطن صاحب "گلستان بے خزاں" کے بیان سے ماخوذ ہے' مولینا حسرت موہانی نے اسے صحیح مانا ہے شیخ محمد اکرام نے بھی دبی زبان سے اس کو تسلیم کیا ہے مگر مالک رام صاحب کی رائے اس کے حق میں نہیں ہے۔

زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ مرزا نے کسی خاص استاد سے باقاعدہ تحصیل علم کی ہو ایسا نہیں ہے' ہاں انھوں نے اپنے ماحول سے بہت کچھ استفادہ کیا' مطالعہ کتب کرتے رہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ فارسی زبان وادب سے ایک ازلی مناسبت اور شعر گوئی کا ایک فطری ذوق رکھتے تھے۔

شادی

مرزا کی شادی تیرہ[13] برس کی عمر میں سترہ رجب المرجب سنہ ۱۲۲۵ھ (مطابق ۱۸۱۰ء) کو نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی جب وہ آگرہ

لے ایضاً۔

سے نوشاہ بن کر آئے تو ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں نے عرف مرزا دولہا کی نسبت سے انہیں مرزا نوشہ کہہ کر یاد کیا اور اپنے اسی عرف کے ساتھ اُن کا نام مشہور ہوا۔

نواب معروف نواب فخرالدولہ احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی اور مرزا عارف جان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ کسی ضلع جاگیر کے تو مالک نہ تھے مگر ان کا شمار دہلی کے شرفا اور رعالی خاندان لوگوں میں ہوتا تھا۔ شعر وسخن کا ذوق رکھتے تھے اور شاہ نصیر دہلوی سے مشورہ سخن فرماتے تھے غالب اپنی شادی کے بعد دہلی کی گلیوں اور دوستانہ محفلوں کے مرزا نوشہ بن گئے جیسے ان کے والد کبھی آگرہ کے مرزا دولہا تھے۔ وہ سسرال میں گھر داماد کے طور پر قیام کرتے ہوں گے اس لیے کہ آگرہ کی سکونت ترک کرکے مستقل طور پر دہلی کافی بعد میں آئے اور اگر ان کے اپنے خطوط کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ شادی کے پانچ سات برس بعد تک آگرہ ہی میں رہے

اس اثنار میں ان کی بیگم بھی کبھی اپنی سسرال گئیں یا نہیں یہ بھی کچھ اسی طرح کا مسئلہ ہے جیسے ان کی والدہ کا دہلی آنا غالب کی کسی تحریر سے نہ اس پر روشنی پڑتی ہے نہ اس پر انھوں نے اپنے ایک فارسی خط میں جس کا حوالہ ان کے والد کے سلسلہ میں آیا ہے، یہ کہا ہے کہ ان کے والد کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی اور ان کی اپنی پیدائش آگرہ میں ہوئی۔

اُن کے بھائی مرزا یوسف کی شادی بھی دلی میں ہوئی تھی بگمان غالب اپنے نانا یا پھر والدہ کے انتقال کے بعد وہ آئندہ مستقل طور پر دہلی آگئے تھے۔ ان کے خسر محترم نواب معروف شریفانہ خصائل اور کریمانہ اوصاف کے انسان تھے شعر وسخن سے غیر معمولی شوق وشغف رکھتے تھے اور اساتذہ قدیم کے طرز پر شعر کہتے تھے۔

مرزا غالب خود بھی حالت صباہی سے شعر اور تخلیقی شعور کی کارفرمائیوں سے فطری دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر قدیمانہ رنگ کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا اپنا اندازِ طبیعت جدا تھا۔ بیدل کی طرف ان کا میلانِ خاطر خود ان کی ندرت فکر اور ذہن کی اختراع پسندی کی جانب اشارہ کرتا ہے اگرچہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

ان کی عنفوانِ شباب کی شاعری سے بخوبی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے نسخہ حمیدیہ اور نسخہ بھوپال (بیاض غالب) کے اوراق وصفحات پر ایک نظر ڈالنا بھی شاید اس کے لیے کافی ہوگا کہ کس طرح عام انسانی زندگی اور اپنے معاشرتی رویئے میں وہ اپنی "بے پروا خرامی" کا ذکر کرتے ہیں:

اس شہر دہلی میں اپنے زمانہ قیام کے آغاز میں کہ میرے پیمانے میں شرابِ غفلت کی تلچھٹ موجود تھی عمر کا ایک حصہ حادثاتِ کامرانی کی ہوس پیمائی اور آوارہ خرامی میں گزر گیا اس سرشاری اور اس عالمِ بے خودی میں رہ گزار شوق کو طے کرنے والے قدم لڑکھڑا گئے اور اندوہ وملال کی گرد سر و سینہ میں بھر گئی تو مجھے ہوش آیا۔"

یہ وہی حالات ہیں جنھوں نے غالبؔ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے پنشن کے مسئلے پر دوبارہ غور کریں اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر انھوں نے فیروز پور جھرکہ کا سفر اختیار کیا، نواب احمد بخش خاں سے ملے اور جب اپنے مقصد کو پہنچنے کی کوئی صورت نہ دیکھی تو کلکتہ کی طرف رُخ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ افواج انگلشیہ کے فوجی دستے بھرت پور کے آہنی قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور نواب صاحب اس محاربے میں ان انگریز لشکریوں کے ساتھ تھے۔

غالبؔ خود بھی نواب صاحب سے ملنے اور عرض معروض کے ذریعہ آپسی معاملات کو طے کرنے کی غرض سے وہاں گئے اور چند دن وہاں خیموں میں اپنی زندگی کی صبح و شام گذارتے رہے، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے غالبؔ نے لکھا ہے۔

"در سال یک ہزار و دو صد و چہل و یک (۱۲۴۱) ہجری (مطابق سنہ ۱۸۲۵ء) کہ گیتی ستانان انگلشیہ بر بھرت پور لشکر کشیدہ واں رویین دژ را درمیان گرفتہ و من دریں یورش ہا . . . . . عم عالی قدر فخر الدولہ (نواب) احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ دام اقبالہٗ رفیق ام و گرامی برادر ستودہ خو مرزا علی بخش بہادر تیز ہم سفر است روزانہ بر رفتار ہم قدم ہستیم و شبانہ بیک خیمہ فرود می آئیم۔" [1]

---

[1] پنج آہنگ: ۴۔

ترجمہ:

" سال ایک ہزار دو سو اکتالیس ہجری میں جب کہ انگلستان کے گیتی ستانوں نے بھرت پور پر لشکر کشی کی ہے اور اس آہنی قلعہ کا محاصرہ کر رکھا ہے، میں اس یورش میں اپنے عم عالی قدر فخر الدّولہ نواب احمد بخش خاں کے ہم رکاب ہوں اور برادر گرامی قدر مرزا علی بخش خاں بہادر بھی میرے ہم سفر ہیں ہم دونوں روزانہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم قدم رہتے ہیں اور رات بھی ایک خیمہ میں بسر کرتے ہیں۔"

بھرت پور کے قضیے سے متعلق مالک رام صاحب نے ذکر غالب کے حاشیائی گوشہ میں یہ صراحت کی ہے۔

بھرت پور کا قضیہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۲۳ء میں سر ڈیوڈ آکٹر لونی حاکم دہلی نے یہ منظور کر لیا کہ بلدیو سنگھ راج گدی پر بٹھایا جائے۔ وہ اس وقت نابالغ تھا اس کے چچیرے بھائی درجن سال نے اس کی مخالفت کی اور ریاست پر خود قابض ہو گیا اس پر آکٹر لونی نے بھرت پور فوج کشی کی مگر لارڈ ایمرسٹ اس لڑائی کو پسند نہ کرتے تھے انھوں نے آکٹر لونی کے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے۔ فوج کی واپسی کا حکم صادر فرما دیا۔

آکٹر لونی نے استعفیٰ دیدیا سر چارلس مٹکاف اس کی جگہ آیا تو پھر اس پر زور دیا گیا کہ درجن سال کے خلاف کارروائی ہونی چاہئے اس پر اس دور کے کمانڈر ان چیف کی سرکردگی میں انگریزی فوج روانہ کی گئی سخت مقابلہ کے بعد ۱۸ جنوری سنہ ۱۸۲۵ء کو بھرت پور پر افواج انگلشیہ کا قبضہ ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ غالب کا سفر بھرت پور ۱۸۲۴ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔

نواب صاحب اسی معرکہ میں اپنے فوجی دستہ کے ساتھ انگریزی حکام کے ہمرکاب تھے۔ اس میں وہ زخمی بھی ہو گئے تھے۔

نواب صاحب فیروز پور جھرکہ واپس آئے تو غالب نے ان کے سامنے اپنی مشکلات اور اپنا معاملہ پیش کیا اس ضمن میں ذکر غالب میں یہ وضاحتیں ملتی ہیں کہ نواب فخر الدّولہ بھرت پور کے معرکے سے واپس آئے تو ان کی صحت خراب ہو چکی تھی ان کے جو زخم آئے تھے ان کی اذیتیں الگ تھیں اور اس وقت جو کچھ انھوں نے کہا وہ ایک تسلی بخش جواب خیال کیا جا سکتا تھا۔

نواب صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ سر چالس مٹکاف کو آنے دو۔ ۔ ۔ ۔

اسی زمانہ میں مرزا نے اپنے اس برادر نسبتی علی بخش خاں بہادر کو پنج آہنگ میں موجود بعض ابواب پڑھائے تھے جس کی طرف مرزا علی بخش خاں بہادر کی اس تحریر میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جس کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

برادر خجستہ کردار اسداللہ خاں متخلص بہ غالبؔ کہ نظم و نثر میں یگانہ اور مشہور زمانہ شاعر ہیں از راہ نوازش میری تعلیم و تربیت سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ہم دونوں کے درمیان قرابت داری کا اٹوٹ رشتہ بھی ہے اور ہم ایک دوسرے سے دلی تعلّق اور قلبی محبت رکھتے ہیں اس لیے اُن برادر مہرباں نے میرے التماس پر چند اوراق آداب القاب اور مکتوب نگاری کے دوسرے امور میں تحریر فرمائے اور مجھے عطا کر دیے۔[1]

غالبؔ فیروز پور جھرکہ گئے اور اس امّید میں وہاں قیام کیا کہ نوّاب صاحب ان سے بات کریں گے تاکہ مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے مگر نواب صاحب اسے "بلطائف الحیل" ٹالتے رہے غالب کو اس کی وجہ سے شدید ذہنی کوفت سے گذرنا پڑا۔ اور ان کی زبانٔ حرف شکوہ سے آشنا ہوئی۔

"ہر چند میرا یہ شیوہ نہیں کہ میں دراز نفسی اختیار کروں اور جو میرے ہمدم و غم خوار ہوں اپنے دکھوں میں اُنہیں شریک کروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم میرے بھائی بھی ہو اور میرے دوست بھی اُس لیے میں تم سے کہتا ہوں اور اسے اپنی ناچاری خیال کرتا ہوں کہ ایک اچھا خاصہ وقت میں نے اسؔ "خوش اندیشی" اور اسؔ "اُمیدِ موہوم" میں گذارا کہ نوّاب صاحب میرے لیے کچھ کریں گے۔

کیا کہوں کہ میں اس انتظار کی آگ میں کس طرح سلگتا رہا ہوں اور کس طرح اس آگ کے شعلوں اور اس عذاب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے بیٹھا ہوں' یہ وہ اذیت ہے' وہ دکھ ہے جو گوشۂ زنداں میں کسی مجرم کو بھی نہیں دیا جاتا ، اور وہ دیکھ رہا ہوں کوئی کافر جہنم میں بھی جس کا سزاوار نہیں ہوگا۔

---

[1] پنج آہنگ : ۳

"میں فیروز پور جھرکہ اس لیے نہیں آیا تھا کہ پھر یونہی بے نیلِ مرام واپس ہو جاؤں، نواب صاحب نے بہت طفل تسلّیاں دیں اور وہ اندازِ ستم روا رکھا جو بظاہر التفات معلوم ہوتا تھا اس سلوک نے مجھے گمراہ کیا اب اس پر کہاں تک صبر کروں اور اس ناہوتے ہیں تہی دستی پر کس طرح چُپ بیٹھا رہوں۔"

"شاہجہاں آباد کے درو دیوار سے مصیبتیں برستی اور قیامتیں نازل ہوتی ہیں۔ میرے دن بھی میری سیاہ بختی کے باعث، راتوں کی طرح کالے ہو گئے ہیں۔ سو چو تو سہی کہ کوئی انسان جو مسلسل بارش سنگ میں ہو خود کو شیشہ مے سے کب تلک بہلاتا رہے گا۔"[1]

مرزا علی بخش بہادر کے نام اس خط میں جس کے بعض حصّے ترجمہ کی صورت میں یہاں پیش کیے گئے ہیں، غالب کے سفر فیروز پور جھرکہ اور اس کے پس منظر و پیش نظر پر جو روشنی پڑتی ہے اس سے غالب کی نفسیات کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس وقت غالب اگر فیروز پور میں ہیں تو نواب صاحب کسی دوسرے مقام پر ہیں جہاں غالب نے میر امام علی نامی کسی شخص کے ہاتھ اپنی عرض داشت ان کی نظر گاہ میں پیش کیے جانے کی غرض سے روانہ کی ہے اور مرزا علی بخش بہادر سے یہ خواہش کی ہے کہ وہ اس گذارش نامہ کی پیشی کے وقت وہاں موجود رہیں اور ان کے حق میں کلمۂ خیر کہنے سے گریز اختیار نہ کریں۔

میر اما می کو میں نے اپنی عرض داشت کے ساتھ نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے ..... میرے ساتھ زمانہ سازی نہ کرنا اور نواب صاحب سے "محابانہ" برتنا جب یہ عرض داشت پیش ہو اور پڑھی جائے اس وقت تمہیں بھی موجود ہونا چاہیے تاکہ تم میری نگارش کو اپنی گذارش سے تقویت بخشو اور میر امام علی کو حوصلہ ملے۔[2]

یہاں انھوں نے واشگاف انداز میں جو کچھ کہا ہے وہ بھی اس وقت مرزا کی ذہنی حالت اور نفسیات کو سمجھنے میں مدد دینے والا "بیان نامہ" ہے تاہم وہ، ـــ نواب صاحب کے رویّے سے پوری طرح مایوس ہو گئے ہوں، شاید ایسا نہیں تھا

[1،2] اوراق معانی: ۵۰۔ [2] ایضاً

اسکا اندازہ اسی خط میں موجود ان الفاظ و کلمات سے ہوتا ہے۔

"میں طلبِ مدعا میں اتنا بھی بے صبر یا آتش زیر پا نہیں ہوں کہ میری خواہش کو"ابرام" تصوّر کیا جائے۔ میرے دوست مجھے کہتے رہتے ہیں کہ میں نوّاب صاحب سے خود کیوں نہیں ملتا، یہ ممکن ہی نہیں کہ نوّاب صاحب میری چارہ گری اور کار برآری پر آمادہ نہ ہوں الحال جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ ان ادا ناشناسوں کی زبان بندی کے لیے ہے۔"

"خدارا ایسا کرو کہ میر امام علیؑ جلدی سے واپس آجائیں اور مجھ سے ملیں تاکہ میں ان دوستانِ ناصح کو خیرباد کہہ سکوں اور اپنی بے سروسامانی کے ساتھ دیارِ مشرق کے سفر پر آمادہ ہو جاؤں۔"

اس خط کے اوّل و آخر کی فضا میں خاصا زمینی اور زمانی فاصلہ معلوم ہوتا ہے" میں فیروزپور اس لیے نہیں آیا تھا کہ پھر یونہی بے نیل مرام واپس ہو جاؤں کہ اس وقت وہ فیروز پور جھرکہ میں ہیں اور روانگی سے پہلے انھوں نے مرزا علی بخش بہادر کو جو خط لکھا ہے اس میں وہ نواب صاحب کی طفل تسلیوں کا ذکر کرتے ہیں اور بظاہر ان سے ایک سے زیادہ ملاقاتیں بھی ہو چکی ہیں اور اتمام حجت کے طور پر وہ میر امام علی کے ہاتھ یہ خط بھیج رہے ہیں اور دیارِ مشرق کے سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کر چکے ہیں۔

کم و بیش اسی زمانے میں لکھے گئے ایک اور مکتوب میں حال و خیال کی یہی دھوپ چھاؤں ملتی ہے۔

"مداری خاں پہنچ رہا ہے اور اسی کے ساتھ یہ خط بھی میرے کالائے بد میں سے جو کچھ وہاں ہو اُسے سونپ دیں اور جو کچھ منا خاں حقّہ بردار کو ودیعت کیا گیا ہے، وہ بھی میرے نام سے لے کر دیدیں۔" [1]

اس سے نمایاں طور پر مترشح ہوتا ہے کہ وہ فیروز پور جھرکہ سے رخصت ہو چکے ہیں اور واپسی کے سفر میں ہیں — نگارشِ مکتوب میں اسی کے ساتھ یہ فقرے بھی زبان قلم پر آئے ہیں۔

"یہ سننے میں آ رہا ہے کہ نواب صاحب دہلی پہنچ رہے ہیں بارے اس خبر کے جھوٹ یا سچ ہونے سے متعلق جو بھی صورت، سو مجھے مطلع کرو نیز یہ بھی کہ تم نواب صاحب کے ساتھ آرہے ہو یا نہیں۔" [2]

---

[1] اوراق معانی [2] ایضاً

اس خط میں مزید یہ لکھا ہے کہ اگر نواب صاحب کے عزم سفر کی خبر غلط ہو تو میں خود فیروز پور پہنچوں اور عم عالی مرتبت کا شرفِ قدمبوسی حاصل کروں۔

یہاں یہ سوال ذہن کو چھوتا ہے کہ مرزا دوبارہ فیروز پور پہنچنا چاہتے ہیں یا یہ ان کا پہلا ہی عزم سفر ہے ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ اس صورت میں فیروز پور جو سامان چھوٹ گیا اس کے واپس منگانے کی بات کیسے درمیان میں آئی؟ واپسی کے سفر میں ان کا پانی پت میں بھی قیام رہا ہو اور مرزا علی بخش بہادر کو انھوں نے وہیں سے خط لکھا ہو یہ بھی قرین امکان ہے۔ شہزادۂ والا قدر بہادر مرزا سلیمان شکوہ کے آدمی (سید قاسم علی خاں) سے اسی مقام پر ان کی ملاقات ہوئی تھی اور بگمان غالب سلیمان شکوہ کے شقہ کے جواب میں جو عرض داشت غالبؔ نے روانہ کی تھی وہ بھی یہیں سے اور انہیں کے بدست روانہ کی گئی تھی ـــــ غالبؔ کی اس عرض داشت کے ضروری حصہ کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے . . .

"جس کام کی انجام دہی کے لیے حکم فرمایا گیا ہے آپ کے مبارک قدموں کی (خاکِ پاک) کی سوگند اگر میرا دل قابو میں ہوتا تو میں اپنے سر کو قدم بناتا اور پیشانی کے بل اس وادی میں قدم رکھتا ـــ میرے مشفق خان صاحب سید قاسم علی خاں نے اس صورت حال کا مشاہدہ کیا ہے کہ یہ بندۂ خانہ زاد کس طرح غم واندوہ سے دست و گریبان رہتا ہے۔"

"میں پا بہ رکاب ہوں اور اس عرض داشت کی نگارش سے اگلے دن دشت آوارگی میں گام فرسا ہو جاؤں گا ـــ اور اتفاق یہ کہ میرا کوئی شہر کیا کوئی مقام بھی معیّن نہیں ہر روز کسی نئی جگہ اور ہر رات کسی نئی بستی میں ہوں گا۔"

"سید قاسم علی خان نے اس خانہ زاد کے منع کرنے کے باوجود کسی راہ اور کسی رائے کو پیش نظر نہیں رکھا وہ پانی پت پہنچے اور حاکم کو نہ پا کر واپس لوٹ گئے چند باتیں بطور مشورہ خان صاحب موصوف کو سمجھا دی گئیں اُمید کہ اگر اس رائے کے مطابق چلیں گے تو شاہی امور کی انجام دہی میں کامیاب ہونگے۔"[1]

---

[1] اوراق معانی : ۵۵ ـ ۵۴ ـ

اس نگارش و گذارش میں غالب کا ما فی الضمیر اور معہودِ ذہنی کیا ہے، اس کا اندازہ تو مرزا سلیمان شکوہ بہادر کے لیے شقہ ہی سے ہو سکتا تھا قرین قیاس یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غالب نواب صاحب کے رویّے سے ہنوز کچھ خوش آیند توقعات رکھتے ہیں ـــ اس لیے امید اور ناامیدی کے دو راہے پر کھڑے ہیں۔ اگر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو۔

مرزا علی بخش خاں بہادر جو نواب فخر الدولہ کے بھتیجے بھی تھے نواب کے زیادہ مزاج شناس ہوں اس کا بالکل امکان ہے وہ نواب صاحب ہی کی خدمت میں رہتے بھی تھے۔ جس کا اندازہ ان کی پنج آہنگ کے دیباچہ میں موجود اس حصہ عبارت سے بھی ہوتا ہے جس کو بصورت ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے ـــ

"جس زمانہ میں کہ میں عمّ (مرحوم) کی بساط قرب میں باریاب و سرفراز تھا اور آں محترم فخر الدولہ دلاور الملک نوّاب احمد بخش خاں کے سایۂ عاطفت میں رہتا تھا ہر چند دہلی سے فیروز پور اور فیروز پور سے دہلی آنے جانے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔"

"میرا زیادہ وقت فیروز پور جھرکہ میں گذرتا تھا۔ عنفوان شباب کا دور تھا اور اسباب عیش مہیا۔ اقبال مندی کے پھول شگفتہ تھے اور دولت و ثروت کے دروازے مجھ پر کشادہ تھے فخر الدولہ کا سایۂ لطف و کرم میرے سر پر تھا۔ ناز و نعمت اور ہر طرح عیش و راحت میں زندگی گذرتی تھی۔ کیا تھا جو اس وقت میرے پاس نہیں تھا، مختصر یہ کہ میری عمر لہو و لعب اور عیش و طرب میں بسر ہوتی تھی۔" [1]

غالب کا معاملہ اپنے خسر والا نظر کی زندگی میں کچھ ایسا ہی رہا ہو یہ ممکن ہے مگر اب وہ حال ہے کہ شاہجہاں آباد کے دیوار و در سے مصیبتیں اُترتی اور قیامتیں نازل ہوتی تھیں۔

مرزا نے فیروز پور جھرکہ کے سفر اور وہاں کے زمانے قیام میں مولوی فضلِ حق خیرآبادی کو صنعت تعطیل (بے نقط) میں جو خط لکھا وہ اگرچہ ایک ادبی کاوش تھی اور صنّاعی و ہُنر کاری کا ایک عجیب و غریب نمونہ پھر بھی اس میں ایسی بہت سی باتیں موجود ہیں جن کو اس وقت مرزا کی ذہنی زندگی کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ پنج آہنگ: ۱۔ (احوالِ ثانی)

جس کا کچھ اندازہ اس کے بعض حصوں سے بھی ہوتا ہے جن کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

"عرضِ مدّعا کے اُن اسرار کی شرح نگاری کے لیے ممکن ہو جن کے ساتھ دورِ جدائی کی ہزار در ہزار اذیتیں شامل ہوں . . . . . اللہ بہتر جانتا ہے کہ میں سرتا سر گم کردہ حواس ہوں اور سرتا پا وہم و وسواس ——— ایزدِ پاک جو دلوں کے بھید جانتا ہے، اس سے آگاہ ہے اور میری دُکھوں سے بھری ہوئی ہر سانس اس کی گواہ ہے کہ میں حرص و ہوس کا زاویہ نشین ہو گیا ہوں اور میرے دلِ حسرت منزل پر گردِ ملال بے طرح چھایا ہوا ہے اور اس نے مجھے ہلاکت کے بھنور میں ڈال رکھا ہے، میری عمر ہے جو تل تل بڑھ نہیں رہی ہے بلکہ پل پل گھٹ رہی ہے۔"

آگے چل کر لکھا ہے ———————————

"میرے مخدوم آج کل میں نے دِلاورُالملک کے در دولت کو اپنا کعبہ مراد بنا رکھا ہے اور میری آرزوؤں کا سر رشتہ اس امیدگاہ سے وابستہ ہے۔"

یہاں غالب کے ایک اور خط بنام رائے چھج مل سے رجوع کیا جائے تو قیام فیروزپور کے سلسلہ میں مزید ان کی نفسیات اور وقت و حالات کی پیدا کردہ ذہنی الجھنوں کی ایک متحرک تصویر چشم خیال کے روبرو آجائے گی۔

"اگرچہ میں وطن میں نہیں ہوں لیکن وطن سے قریب ہونا بھی قیامت سے کچھ کم نہیں، ابتک اہلِ کاشانہ کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہے لیکن جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے، وہ آشوب چشم کا درجہ رکھتا ہے اور جو سننے کو ملتا ہے وہ زحمتِ گوش کے سوا کیا ہے۔"

"میں موجِ بلا کے تھپیڑوں سے اپنے جس تن نیم جاں کو لے کر باہر آیا ہوں، شاید وہ خاک فیروزپور کی امانت ہے کہ مجھے بہ جبر و اکراہ اس قیام پر راضی ہونا پڑا۔ اپنی موت، جو میں ہزار آرزو کے ساتھ خدا سے چاہتا ہوں، شاید اس کے لیے ارضِ موعود یہی خاک فیروزپور ہو لیکن بوجہ افتادگی یہاں کے قیام میں

اس قدر درنگ واقع ہو رہی ہے۔"

"نواب معلّے القاب کی سعادتِ ورود کی خبر سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس سے میرے مُدّعا کے پورے ہونے کی کوئی راہ نہیں نکلتی، اب مجھ میں ستم کشی کی طاقت ختم ہو گئی اور زحمت انتظار اپنی حد سے گزر گئی۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے جو میدان کار زار میں اپنے پیر پر کاری زخم لگ جانے کی وجہ سے حریف کے سامنے سے نہ گریز و فرار کی راہ اختیار کر سکتا ہو اور نہ دشمن سے مقابلہ اور مقاتلے کی تاب لا سکتا ہو۔ میری طبیعت بے طرح متوحش ہے، دل کہ صد ہا تشویشوں میں مبتلا ہے اس کی بے قراری حد سے بڑھ گئی ہے۔"

اس ذہنی حالت ابتلا اور تشویش کے ساتھ غالب نے فیروز پور جھرکہ سے لوٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ فیروز پور جھرکہ میں جس طرح کی الجھنیں تھیں ان کا تعلق نواب صاحب سے تھا۔

"فیروز پور کو اپنی توقعات کے لیے دام گاہ مرادات بنایا ہے اور میں اس طمع میں یہاں آیا ہوں کہ میں ساہو کار کے روپے کو رئیس حال کے علم میں لاؤں اور اس کے بعد اپنی راہِ سفر کا رخ مرحلہ پیمائی کی طرف موڑ دوں۔ تاکہ میرا یہ دل کہ دشمن کے ارادوں پر والہانہ رقص کرتا ہے، دشت و صحرا میں جا کر کچھ بہل جائے۔"

غالب ایک حسّاس آدمی تھے ہزار انھوں نے اپنا وقت لہو و لعب میں گزارا ہو لیکن انھیں اس کا احساس تھا کہ ان کی اپنی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ان لمحات میں انھیں بے طرح یہی احساس ذمہ داری ستاتا رہا ہو، یہ ممکن ہے۔ ______

فیروز پور جھرکہ میں جو صورت حال پیش آئی وہ ان کی توقعات کے بالکل خلاف تھی یہاں پہنچ کر انھیں علم ہوا کہ ان کے بارے میں کیا کہا اور کیا سوچا جا رہا ہے، چنانچہ آگے چل کر انھوں نے فیروز پور کی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے۔

"میرے عمِ عالی قدر نے اس وہم و گمان کے زیر اثر جو دشمنوں نے خوف و ہراس کی طرح ان کے دل میں بٹھا رکھا ہے سرکار سرمور سے محصولات کی عدم وصول یابی کا ذکر کیا۔ فیروز پور جھرکہ سے مایوس ہو کر غالب نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

قیام پانی پت کے بارے میں کوئی خاص تفصیل یا وضاحت ہنوز دستیاب نہیں، وہ فیروز پور جھرکہ سے واپسی پر ارادتاً دہلی نہیں گئے، حالات کی ناسازگاری اور قرض کی واپسی کے لیے تقاضا اور اصرار کرنے والوں کی دار و گیر سے خود کو بچانا ......
اور جن حالات سے وہ گذر رہے تھے ان میں اپنے آستین و دامن کو اس وقت ناموافق کی دست درازیوں سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔
ضمیمہ ۳ مشمولہ نامہ ہائے فارسی کی یہ عبارت اس کی طرف واضح اشارہ ہے
ترجمہ "نواب احمد بخش خاں کے وعدہ کی اُمید پر فیروز پور کے سفر میں بے طرح پریشان و سرگشتہ ہونا قرض خواہوں کے شور و غوغا اور وہاں پہنچ کر بے آبروئی کے خطرہ سے خوف زدگی کے باعث دہلی نہ جا سکنا۔ سیدھے کانپور پہنچنا اور راہ سفر میں بیمار ہو جانا، (اس کا سبب بنا)۔"
مرزا کا یہ بیان از روئے قیاس اور مصلحت وقت کو دیکھتے ہوئے صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن انھوں نے مولانا فضل حق خیر آبادی کو صنعت تعطیل میں جو "اعتذار نامہ" لکھا ہے اس کے حوالہ سے نامہ ہائے فارسی کے موجودہ متن میں جو عبارت آئی ہے وہ یہاں نقل کی جاتی ہے "قصہ مختصر چوں سررشتہ ہر کار بزمانے بازبستہ است و رای کشاکش نوانم بدر جست بے خودی گریبانم گرفت و باز بدہلی آورد۔" (ممکن ہے یہ بعد کا اضافہ ہو)
" روزگارے دراز بخاک نشینی سپری شد و چرخ گردند چپے بگرد ایں تیرہ خاکداں بگشت، غنودگی ہائے مرا بامداد رسید، و مرغِ سحر خواں شوق نو بر آورد ازاں کہ اسباب پریشانی دست بہم داد، قماشِ آوارگی را تار و پود پدید آمد ..... و پائے خوابیدہ بر فتار ..... و راہے بجائے نبردہ تحت اشتقاق ورود بہ لکھنؤ افتاد۔"
(ترجمہ) قصہ مختصر یہ کہ ہر کام کا سر رشتہ وقت سے وابستہ ہے اس کشاکش میں اپنے بند گراں کو نہ توڑ سکا کہ اس سے باہر آجاؤں، میری بیخودی گریباں گیر ہوئی اور پھر دہلی لے آئی۔

نقش نیم رخ ۶۵

پنج آہنگ میں اس موقع پر نظم کے عنوان سے جو اشعار آئے ہیں وہ اس قصیدہ سے تعلق رکھتے ہیں جو انھوں نے وزیر اودھ کے لیے ارقام کیا تھا۔ ان میں یہ شعر شامل تحریر ہیں۔

اندریں بقعۂ جمہور ز دل تنگیٔ خویش — حسرت آگیں چو گنہ گار بزنداں رفتم

جلوہ در طالع خاشاک من افتادہ زبوں — بر غلط جادۂ گلخن بگلستاں رفتم

سبزۂ رنگ طراوت بخزاں بافتہ ام — خس شدم تا بچراگاہِ غزالاں رفتم

تشنہ بحر تماشا شدنم صرف نکرد — کہ ز جوش عرق شرم بطوفاں رفتم

کاش می سوختم و داد فنامی دادم
شرم بادا کہ بداں تازہ خیاباں رفتم

اس بقعۂ جمہور میں اپنی دل تنگی کے باعث، میرا دل حسرت واندوہ سے بھرا تھا جب میں ایک گنہ گار اور مجرم شخص کی طرح زنداں میں داخل ہوا میرے خاشاک وجود کے طالع ہی نامبارک ونامسعود تھے اور رہے۔ بد انجامی اُن کا مقسوم بن چکی تھی۔ کہ راستہ غلط ہوگیا اور میں گلخن کے بجائے (جو خس و خاشاک کی صحیح منزل ہے) صحن گلستاں میں پہنچ گیا۔

میں بحر تماشا میں ایک "تشنہ لب" کی طرح ڈوب گیا مگر اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا عرقِ شرم کے جوش فراوانی کے باعث، میں پہلے ہی طوفانِ آب میں گھر چکا تھا اور پانی پانی ہوگیا تھا — میں نے حسن طراوت سے آراستہ سبزے کو بادِ خزاں کو سونپ دیا اور میں گھاس پھوس بن کر غزالانِ صحرا کے علف زار میں پہنچ گیا۔

کاش میں جل جاتا اور اس طرح دادِ فنا دے سکتا، شرم تو اس بات پر آتی ہے کہ میں گیاہ خشک تھا اور اس تازہ خیاباں میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ایک زمانہ وہیں خاک نشینی میں بسر کیا۔ اور یہ گھومنے والا آسمان اس تاریک خاک دان کے گرد بہت گھوما کہ میری غنودگیوں کی صبح ہوئی مرغِ سحر کے نغمۂ صبوحی نے مرے اندر شوق نو پیدا کیا اور میرے سلسلۂ شوق نے زنجیر خودداری کو توڑ دیا اور پریشانی کی موجوں نے میری کشتی کو روانی کے سپرد کر دیا۔ میرے سوتے ہوئے پیر میں جنبش آگئی اور پہلی منزلِ سفر لکھنؤ قرار پائی۔

اِن عبارات میں لکھنؤ پہنچنے کا ذکر ہے جو اُن کے سفرِ دیارِ مشرق کی منزلِ اوّل ہے اس میں کانپور کا کوئی تذکرہ نہیں۔

غالب ۱۸۲۵ء کے وسط میں دہلی سے فیروز پور جھرکہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ جنوری ۱۸۲۶ء میں وہ کانپور کے ارادہ سے عازم سفر ہوئے یہاں انھوں نے بغرض علاج کتنے دنوں قیام یا آرام کیا موجودہ معلومات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ہاں لکھنؤ میں ان کے قیام کی مدّت پانچ ماہ اور کچھ دن ہے۔

زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ غالب فیروز پور جھرکہ سے واپسی کے بعد دہلی نہ گئے ہوں بلکہ پانی پت یا کسی اور مقام پر، جو شہر دہلی سے قریب رہا ہو، چندے قیام فرما رہے ہوں؟ ان کے مکتوب میں اس کی طرف اشارے موجود ہیں کہ وہ اپنے اہل خانہ سے قریب ہیں اور ساری خبریں ان کو مل رہی ہیں۔

پانی پت کے ماسوا ایسے کسی مقام سے موجودہ معلومات کی روشنی میں ہم آگاہ نہیں۔ پانی پت سے کانپور کا سفر انھوں نے کن وسائل کے ساتھ کیا اس کے بارہ میں غالب نے کہیں کچھ لکھا ہی نہیں یہ ہماری معلومات کا حصّہ نہیں جبکہ کلکتہ کے سفر کے نوشتہ خطوط میں سفینہ رہوار کا ذکر آتا رہا ہے یہاں ایسی کوئی صورت نہیں۔

لکھنؤ کا سفر — اور قیام اودھ: یہ شہر اس وقت مشرقی علوم وفنون کا ایک مرکز تھا اور بقول مولانا محمد حسین آزاد یہاں نکتہ کو کتاب کے مول خریدنے والے (فن کے قدر داں) موجود تھے۔ خان آرزو اور میر و سودا سے لے کر میر انشاء اللہ و مصحفی تک نہ جانے کتنے اہلِ سخن اور اربابِ فن نے لکھنؤ کا رُخ کیا یہاں بھی اصحاب دانش کی قدر افزائی، محسنانہ کرم گستری اہل شہر کی طرف سے مہمان نوازی کا تصوّر اور اپنی کار برآری کی توقع لے کر یہ بھی وہاں گئے۔ اس زمانے کی تہذیبی روش اور ارباب ثروت کی کشش کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تو یہ ایک عصری تقاضہ بھی تھا۔ — اب یہ الگ بات ہے کہ وہاں جس ماحول یا جن حالات سے انھیں واسطہ پڑا وہ ان کی توقعات کے برعکس تھے۔

لکھنؤ میں وہ کس کے مہمان تھے اُن کا زیادہ تر وقت کس طرح اور کس کے ساتھ گذرا موجودہ معلومات کی روشنی میں یہ کہنا مشکل ہے غالب نے اس ضمن میں بس اتنا لکھا ہے۔

مرے مہربان وکرم فرما میرے چاروں طرف جمع ہوگئے اور بزرگان انجمن بن گئے اور شدہ شدہ انھوں نے میری خاکساری کو آغا میر کی بزم ریاست تک پہنچا دیا یہ اس دیار کے زمرۂ سادات میں سے تھا اور اس زمانہ میں خطاب معتمد الدولہ کی بلند آہنگیوں کے ساتھ یاد کیا جاتا تھا اور اس کشور کے سررشتہ انتظام اور عہدۂ مدار المہامی سے ممتاز و سرفراز تھا۔"

اِدھر سے بھی جذب و کشش کا اظہار ہوا اور اُدھر سے شوق و تمنّا نے دل میں جوش مارا۔ جب ملاقات باہمی کی بات درمیان آئی اور تاریخ طے پا گئی تو میں نے اظہار خلوص و عقیدت کے طور پر پیش کش کی غرض سے ایک قصیدہ لکھا، جسے جہانِ بندگی و عبودیت کا رہ آورد کہنا چاہیے میرے شوق فراواں نے اس کے باوصف ایک گونہ دل تنگی محسوس کی اور اسے بقدر ذوق نہ پایا تو ایک قطعہ اور اسی کے ساتھ صنعت تعطیل میں ایک نثر پارہ ترتیب دیا۔

امیر الامرا، معتمد الدولہ آغا میر سے غالب کی کوئی شناسائی نہ تھی انھوں نے لکھنؤ کی داد و دہش اور عطا و بخشش کے بارہ میں بہت کچھ سنا ہوگا اور پھر اس خاص موقع پر ان کی مشکلات کا تقاضہ بھی یہ تھا کہ وہ جیسے بھی بن پڑے اپنے زاد راہ کے لیے کچھ کریں۔

؎ اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں۔ نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں!

اس وقت انھوں نے جو نثر پارہ ترتیب دیا وہ ایک خاص ادبی صنعت اور طُرفہ انداز نگارش کا نمونہ ہی نہیں تھا۔ بزبانِ قلم اس طرزِ نگارش میں اُن کے سارے غم بھی سمٹ آئے تھے۔

اس کے کچھ حصّوں کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

"میں نے بھی کہ وابستۂ در اُمید ہوں اس ارادہ سے اِدھر رُخ کیا تاکہ اس بارگاہ تک رسائی کے ذریعے گُلِ مُراد کے حصول اور عطر و پان کی پیش کش سے اپنے دامانِ دل کو عطر بیز اور دامان ہوس کو گلریز کروں۔"

"تمنّاؤں کے تیر اپنے زخم سینہ میں پیوست کیے اور گوناگوں اوہام دھواں اپنے سر سودا زدہ سر میں بیٹھے' میں اس دور و دراز سفر پر نکل کھڑا ہوں۔ اور سفر کے اس مرحلہ میں کسی راہوار کا مُتلاشی ہوں۔"

"ایزدِ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں دو صد کوس کی منزلیں طے کر کے سلسلۂ آلِ محمد کے ایک فردِ فرید کے درِ دولت تک پہنچ گیا ہوں اگرچہ میں عرصہ گاہِ عالم میں ارباب کمال کے قافلہ کی گرد اور سر راہ طلب "مُشت غبار" کی حیثیت رکھتا ہوں' مگر گردِ سر راہ اور مشت غبار ہونے کے باوجود اس سرکارِ ابد کردار کا مدّاح ہوں۔"

لکھنؤ کے قیام کے دوران مرزا غالب نے اپنے باہر کے دوستوں سے بھی خط و کتابت جاری رکھی' اس کا کچھ اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ قیام لکھنؤ کے آخری ایام میں انھوں نے رائے چھجمل کھتری کو جو خط لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رائے صاحب بھی انہیں خط لکھتے تھے اور دریافتِ احوال کرتے رہتے تھے۔

اوراق معانی:

"اگرچہ وقت و بخت نے ملاقات و معانقہ کے تقاضہ کی تکمیل و صورت واقعہ کی نمود کا موقع نہ آنے دیا لیکن وہ مسودہ میرے پاس موجود و محفوظ ہے"۔ [1]

یہ دونوں نثر پارے یا تحسین نامے مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کو ایک خط میں ہم نورد کر کے ارسال کیئے گئے تھے لیکن اوّل الذکر کا زمانہ تحریر غالب کے قیام فیروز پور جھرکہ کے دوران ہونا چاہیئے جیسا کہ اس فقرے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

" والحال کہ محرّر درِ دلاور الملک را وامگاہ ورود کردہ"۔ [2]

اور دوسرا بہر حال اس وقت ترتیب دیا گیا جب وہ لکھنؤ میں فروکش تھے اسی کے ساتھ مدحیہ قصیدے قطعہ تہنیت اور اس نثری نگارش کا مرقع بھی یہی شہر تھا مرزا غالب کے سفر لکھنؤ اور سلطنت اودھ کے اس نئے شاہی شہر میں مرزا کے قیام سے متعلق یادگار غالب میں مولانا حالی نے لکھا ہے۔

"جب مرزا نے دہلی سے کلکتہ جانے کا ارادہ کیا تھا اس وقت راہ میں ٹھہرنے کا قصد نہ تھا مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں اس لیے کانپور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیئے"۔ . . . .

آگے چل کر مولانا حالی نے تحریر فرمایا۔

"اس وقت نصیر الدین حیدر فرماں روائے لکھنؤ تھے اور روشن الدولہ نائب السلطنت' اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوانِ شایقہ ان کی تقریب کی گئی مرزا سے اس پریشانی کے زمانہ میں قصیدہ سرانجام نہیں ہو سکا مگر ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں (جو اُن کے مسودات میں موجود ہے) نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھی"

مرزا نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں ایک یہ کہ نائب السلطنت تعظیم دیں' دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے اسی وجہ سے

---

[1] [2] اصل عبارت ملاحظہ ہو: ۶۵ - [2] : ۶۴۔

مرزا بغیر اس کے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور نثر پیش کریں وہاں سے کلکتہ کو روانہ ہو گئے۔" [1]

یہاں مولانا حالی کو تسامح ہوا۔ مرزا جب لکھنؤ پہنچے تھے وہ نصیر الدین حیدر کا دورِ فرمارروائی نہ تھا، سنہ ۱۸۲۶ء میں غازی الدین حیدر سریر آرائے سلطنت اودھ تھے اور نائب السلطنت روشن الدولہ نہیں معتمد الدولہ آغا میر تھے۔ مرزا نے اپنے زمانۂ قیام میں جو خط لکھے ان میں روشن الدولہ کا کوئی ذکر نہیں آیا جو بھی معاملہ ہے وہ آغا میر سے ہے بعد میں مرزا نے ___ جب یہ قصیدہ مولوی محمد علی خاں صدر امین ریاست باندا کو ایک ادبی و شعری تخلیق کے طور پر ملاحظہ فرمائی کے لیے بھیجا تو اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ وہ ابھی اس بات کو اپنے ہی تک رکھیں کہ مرزا اسے نواب ہمایوں جاہ رئیس مرشد آباد کو پیش کرنا چاہتے تھے۔

یہ قصیدہ کلیات فارسی غالب جلد دوم (قصائد) میں نصیر الدین حیدر ہی کی مدح و ستایش سے منسوب کیا گیا ہے لیکن اس کے ذیلی حواشی میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ ابتداءً یہ غازی الدین حیدر کے لیے لکھا گیا تھا بعد میں ممدوح کا نام بدل دیا گیا۔ [2] بہر حال مولانا حالی سے یہاں صورت واقعہ کے بیان میں فکری لغزش ہوئی ہے" یہ قصیدہ ۱۸۲۶ء کی شعری تخلیق ہے" اس کے بعد وہ کلکتہ روانہ ہو گئے (غازی الدین حیدر کا انتقال ۱۹ / اکتوبر سنہ ۱۸۲۷ء / مطابق ۲۷ / ربیع الاول ۱۲۴۳ھ) کو ہوا۔ لکھنؤ میں جو ناخوش گوار صورت اس ضمن میں دورانِ سفر پیش آئی، اُسے غالب کے اپنے نگارش ناموں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

مولوی سبحان علی کے نام ایک خط میں یہ عبارت آتی ہے (جس کا مطالعہ غالب کے سوانحی کوائف کے ذیل میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔

(ترجمہ) "اس دورِ آشفتگی میں فرماں روائے اودھ کے آستانے کے سوائے

---

[1] یادگارِ غالب: ۴۵۔ [2] کلیات غالب فارسی جلد دوم: ۱۱۲۔

میں نے کسی اور کی چوکھٹ پر سر نہیں جھکایا . . . . اور اس جستجو میں خانِ رفیع الشان کی طرف رجوع کرنے کے سوا کسی اور کا احسان نہیں لیا۔ اس آرزو کا کانٹا میرے دامن دل سے اُلجھا ہوا ہے اور اس شور انگیزی نے میرے دل میں غوغائے قیامت جیسی شورش بپا کر رکھی ہے کہ یہ عرض داشت شرقستانِ اودھ کے آصف ثانی کی نگاہ قبول سے فروغ پائے اور یہ قصیدہ شاہ اودھ کی بزم بہشت آئین میں پڑھا جائے تاکہ مجھے کہ سخن سنج و ستایش نگار ہوں انعام ضروری سے امتیاز حاصل ہو اور یہ صلہ بھی اُس گراں مایگی کے ساتھ عطا ہو کہ یہ مری نام آوری کا سبب بنے اور خود اپنی نگاہ میں بھی مجھے سربلند کر دے۔" ؎[1]

اس میں صاف طریقہ سے یہ بات سامنے آگئی کہ غالب قصیدہ لکھ چکے تھے اور مسند آرائے لکھنؤ کی نظر گاہ میں پیش کر کے دربار اودھ سے اس کے شایان شان صلہ چاہتے تھے آگے چل کر انھوں نے اس اندیشہ کا اظہار بھی کیا ہے کہ یہ ایک امر دشوار ہے" میں جانتا ہوں کہ میں اس تگ و دو میں ایک رہروِ تشنہ لب سے مشابہ ہوں اور اسی پر اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔

"کاش یہ میرے اسرارِ مدّعا کی پردہ کشائی میں معاون ہو اور یہ لب تشنہ و سادہ لوح مسافر صاحب والا مناقب سبحان علی خان کی نظر گاہ میں بجز مہربانی و لطف کے کسی اور بات کا مستحق و سزاوار نہ ہو۔" ؎[2]

سبحان علی خان کے نام ایک دوسرے مکتوب میں اپنی آرزومندیوں کا ذکر ایک ایسے لب و لہجہ میں کیا ہے جس سے احساسِ محرومی اور تصوّرِ مایوسی صاف جھلک رہا ہے۔

"اگر میں حق سے نہ گزروں تو آرزو بھی اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ میں پیش گاہ قبول میں قلندرانہ ہو حق کروں، گداؤں کی طرح شیئاً للّٰہ کہوں اور

---

[1] اوراق معانی: ۵۷۔ [2] ایضاً: ۵۷۔

روزینہ ڈھونڈتا ہوا اُفتاں وخیزاں آپ کی بارگاہ تک پہنچوں ۔ سائل کی ریزشِ آبرو جو فرطِ لطافت سے کسی کان کے پردے میں خراش نہیں پیدا کرتی آپ کی سماعت کے لیے وجہ گرانی کیوں بننے لگی۔"

یہ قصیدہ اور عرض داشت کسی وسیلہ سے پہنچ بھی گئی اور سُبحان علی خان نے ان نگارش ناموں کو آگے بھی بڑھا دیا لیکن خود صاحب تحریر و نگارش کو حاضری دربار کی سعادت و مسرّت حاصل نہ ہوئی اور گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔

ایک اور خط سے اس صورت حاصل پر مزید روشنی پڑتی ہے اور لکھنؤ میں غالب کے شب و روز کا اضطراب سامنے آتا ہے۔

"۔ ۔ ۔ میں نے صرف اتنا سُنا ہے اور یہی خبر مجھے آتش زیرِ پا رکھتی ہے۔ کہ وہ اشعار وزیر اعظم کی انجمنِ ہمایونی میں پڑھے گئے اس کے ماسوا یہ ہنوز نہ معلوم ہو سکا کہ ان پر کس حد تک توجہ مبذول ہوئی اور چونکہ اصل مقصد اس خاص معاملہ میں "کشودِ کار" سے ہے اسے بارگاہِ خسروی میں کیسے پہنچایا جائے۔"

"آرزوے صلہ یابی کی شورش اور عطاو بخشش کے شور انگیز تقاضے کے ساتھ عطاے وزیر اور بخشش سلطانی کا سودا میرے سر میں سمایا ہے اور بہت سے رنگوں کو ملا کر میں نے ایک انوکھا مرقع تیار کیا ہے کہ اسے بادشاہ کی رہگذار میں نقشِ نظارہ بنایا جائے تاکہ "فرماں رواے کشورِ عقل و دانش" جب اسے دیکھے تو یہ جان لے کہ اس راہ رو کی تمنا کیا ہے۔"[2]

غالب کے ساتھ دربار اودھ کی روش اور خان رفیع الشان کی توجہ بے کشش کے ماسوا لکھنؤ کے قیام اور وہاں پیش آنے والے معاملات پر مزید اس خط سے روشنی پڑتی ہے جو انھوں نے منشی محمد حسن کو لکھا ہے۔

---

[1] [2] اوراق معانی: ۶۱ — ۶۰۔

"اس سے پیشتر میں نے ایک خط بنام خان والا شان سبحان علی خان اور ایک عرض داشت بحضور والا۔ وزارت پناہ معہ بادشاہ کے ایک قصیدے کے لکھ کر اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم نورد کر کے اس مجموعۂ اوراق کو صاحب والا مناقب راجہ صاحب رام وکیل شاہ اودھ کی خدمت میں روانہ کر دیا اور یہ درخواست کی کہ آرزوے محال کا یہ خاکہ خان صاحبِ والا مقام کی نظر کیمیا اثر سے گذر جائے اور بعد ازاں اسے سلطنت کے دستورِ اعظم کے حضور میں پیش کر دیا جائے۔" لہ

"اور یہ سب اس اُمید کے ساتھ کیا ہے کہ یہ قصیدہ حضور سُلطانی میں پڑھا جائے اور قصیدہ نگار کو اس کے صلہ میں دسترخوان شاہی سے آذوقہ پرورش حاصل ہو ــــــ آجتک کہ پورے چالیس دن بیت گئے۔ اس نیرنگ وافسوں کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا۔"

"اُس گدائے نابینا کی طرح کہ کسی عصا کش کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتا، میں اُمید و بیم اور ردّ و قبول کی کشمکش میں گھرا ہوا ہوں۔" لہ

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ غالبؔ قصیدہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام ہی میں مکمل کر لیا تھا کہ ان کاغذات کو بھیجنے کے بعد چالیس دن تک غالب نے جواب کا انتظار کیا تب یہ خط لکھا ہے۔ مالک رام صاحب کا یہ خیال ــــــ کہ لکھنؤ میں قصیدہ مکمل نہیں ہوا تھا محلِ نظر ہو جاتا ہے جب غالب اس گومگو کے ماحول سے واقف ہوگئے تو انھوں نے مولوی کرم حسین خاں (سفیر شاہ اودھ) کو خط لکھا اور اس میں اس صورت حال پر شکوہ سنجی کے انداز میں اس طرح اظہار خیال کیا۔

"میرے قبلہ و کعبہ کے خاطر نشان ہو کہ میں اس قطعہ کی نگارش کے صلہ میں، جسے میں اپنا دست مزد تصور کرتا ہوں ــ بادشاہ سے روشناسی،

لہ/ لہ اوراق معانی: ۸۹۔

تشریفِ قبول نویدِ التفات وعطیۂ فتوح ہے لیکن اس طلسمِ مُدعا کی کشائش منحصر اس بات پر ہے کہ ممدوح کو ستائش گر کے مرتبہ ومقام کا احساس دلایا جائے تاکہ عطا وبخشش اس کی قدر ومنزلت کے مطابق ہو ورنہ ظاہر ہے باد خوانوں کا جائزہ کتنا اور مدح گستروں کی آبرو کیا۔" لہ

غالب کی نظر صحیح نکتہ پر گئی اس موقعہ پر اُن کے تجزیے کو غلط نہیں قرار دیا جا سکتا اب یہ دیگر بات ہے کہ ان کے حسب دل خواہ بات کو آگے نہ بڑھایا جاسکا، مولوی سبحان علی خاں سے اب انھیں کوئی خوش آیند توقع نہ تھی کہ وہ ردّ وقبول کے اس نازک مرحلہ میں کچھ کر سکیں گے اسی لیے انھوں نے مولوی کرم حسین کو لکھے جانے والے زیرِ نظر مکتوب میں آگے چل کر یہ بھی لکھا۔

"سبحان علی خان کی گفتار کے انداز سے یہ کام نہ ہو سکے گا کہ سائل کی خاکساریوں کی آبرو خود ان کی نظر میں بھی نہیں اور وہ اُسے "ایک شاعرِ صلہ جو" کے ماسوا کچھ نہیں سمجھتے۔"

"اگر میرے مخدوم کو بیکس نوازی کا خیال ہے تو عرض داشت کے ساتھ اس قطعہ کو بھی شامل کر دیں اور جو کچھ اس نامہ نگار کے حق میں مناسب تصوّر فرمائیں، وہ بھی لکھ دیں تاکہ میں بادشاہ کی نگاہ میں ذی وقار بھی ہو جاؤں اور صلہ وانعام سے بھی نوازا جاؤں"۔ ٢ہ

غالب اس وقت کس ذہنی کشمکش کا شکار ہیں، مذکورہ سطور میں ان کے اپنے قلم سے اس کی ترجمانی کی ایک اچھی اور سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

اس پریشاں حالی و درماندگی میں وہ مولوی امداد حسین خان بہادر سے اس بارۂ خاص میں دستگیری کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ اس سلسلہ میں وہ اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لائیں اور اُن کے حق میں کلمۂ خیر کچھ اس طرح کہیں کہ وہ اپنے مقصد کو پہنچیں اور

لہ ٢ہ اوراق معانی : ٦٠۔

ان کی راہ سفر آسان ہو جائے۔

"میں عہد موجود میں جناب والا کی فرخندہ روئی نجستہ طبعی اور رسائی اندیشہ کے بارہ میں برابر سنتا اور سوچتا رہا ہوں اور یہ مدعا میرے ذہن وخیال میں گشت کرتا رہا ہے کہ ایسا کیا کیا جائے کہ میں روشناس التفات ہو جاؤں ــــ سلطانِ دارا دربان کی مدح میں قصیدے کی بات درمیان میں آئی ذوق گذارش کی تشنگی باقی رہی اور ایک دوسرا قطعہ کہ روانی میں زلالِ خضر کی مثال ہے رگِ کلک سے تراوش پا گیا یہ دونوں قطعات کہ اس عرض نامے کے ساتھ ملفوف ہیں نظر والا سے گذریں گے میں بہر نوع آصف دوراں کی دستگیری سے عہد موجود کے سلیمان تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

لکھنؤ کے بڑے لوگوں کو لکھے گئے یہ خطوط اور ان کے وسیلے سے سامنے آنے والے کوائف غالب کی روداد سفر کا اہم حصہ ہیں اور ان کی مدد سے ہم یہ بھی جان سکتے ہیں کہ لکھنؤ آنے کا باعث کیا تھا ہوس سیر و تماشا تو بلاشبہ کم رہی ہوگی لیکن زادِ راہ کی طلب اور وسائلِ سفر کے حصول کی خواہش اُن کو کشاں کشاں اُن اُمرائے لکھنؤ کے قریب لے گئی۔ اب لکھنؤ میں "کشش کاف کرم" اُن کے کام نہ آئی یہ قسمت کی نارسائی ہے کہ یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا۔

رائے چھجمل کے نام اسی زمانے میں تحریر کیے جانے والے ایک خط کے اِن کلمات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے

" اضطراب دل میں جوش مار رہا ہے اور جس قدر میری طبیعت اس سے آشفتگی محسوس کرتی ہے میری یہ سعی رائیگاں بڑھتی جاتی ہے کہ میں دامن آوارگی کو اپنی کمر سے باندھ لوں اور ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاؤں۔ کیا کروں میرا دست قدرت پتھر کے نیچے آیا ہوا ہے" (آگے چل کر لکھا ہے) اس رنج بیدلی کا کوئی علاج بھی میری نظر میں نہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا۔ ظاہر ہے کہ جو طائر قفس سے نکل کر پھر جال میں پھنس گیا ہو اس کا حال اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے" یہ فیروز پور کے واقعات کی طرف اشارہ ہے لکھنؤ کی کہانی بھی اس سے مختلف نہیں۔

مالک رام صاحب نے غالب کے سفر لکھنؤ کے سلسلہ میں ان کی بیماری کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ "وہ چلنے پھرنے کے لایق بھی نہیں رہ گئے تھے:"

"بدقسمتی سے. جوں ہی کانپور پہنچے وہاں بیمار پڑ گئے یہاں تک کہ چلنے پھرنے کی بھی سکت جاتی رہی اس لیے انہیں مجبوراً ایک کرایہ کی پالکی میں لکھنؤ جانا پڑا...

... وہ پانچ مہینے سے کچھ زیادہ دن بستر پر لیٹے رہے یہاں انھوں نے گورنر جنرل کی اس طرف آمد اور رئیس اودھ کے ان کے استقبال کے لیے جانے کی خبر سنی لیکن ان دنوں وہ چارپائی سے اٹھنے کے لایق بھی نہ تھے۔" [1]

اس صورت حال کا کچھ اندازہ ان کے اس شعر سے ضرور ہوتا ہے:

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہمکو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہمکو

لیکن ان کے خطوط سے جو لکھنؤ میں رہتے ہوتے انھوں نے بعض عمائد کو تحریر فرمائے ..... اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا کچھ دنوں کی بات تو الگ ہے لیکن لکھنؤ کا تمام زمانہ قیام پانچ ماہ سے زیادہ مدت انھوں نے اس طرح صاحبِ فراش رہ کر گذاری اس کو ماننے میں بجا طور پر تامل ہوتا ہے۔

رفتم ردیف کے ساتھ غالب کے جو شعر ملتے ہیں انہیں سے مفہوم کے اعتبار سے وابستہ یہ شعر بھی ہیں لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

یہ شہر اُن کی امیدوں کا مرکز ضرور تھا مگر ان کے سلسلہ سفر کا مقطع نہیں ہے اُنہیں آگے جانا تھا رائے چھجمل کو لکھتے ہیں.

---

[1] ذکر غالب ::

"... مخفی نہ رہے کہ آپ کے مودت نامہ کے جواب میں تاخیر ہوئی اس کا سبب تغافل نہ تھا اس لیے کہ جس زمانے میں عطوفت نامہ صادر ہوا میں سفر اور اقامت کے مابین تذبذب کے لمحے گذار رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میرا دل نقشِ مدعا تک رسائی پا جائے اور میری خواہش پوری ہو جائے تو پے تامل خط لکھوں اور اس میں تمام باتوں کا جواب ہو۔"[1]

اس سے اندازہ ہوا کہ غالب کا ذہن لکھنؤ کے اس شہری ماحول اپنے وہاں کے قیام اور وہاں سے واپسی کے بارہ میں کس طرح سوچ کا سفر طے کر رہا تھا آگے چل کر جو کچھ ان کی زبان قلم پر آیا ہے وہ بھی "خیال" نہیں "حال" ہے۔

"خلاصہ گفتگو یہ کہ اعیان سلطنت لکھنؤ میرے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آئے مگر جو کچھ حصول ملازمت کے بارے میں قرار پایا وہ خویشتن داری کے اصول کے خلاف اور شیوۂ اخوان پرستی کے تئیں باعث تنگ تھا اس اجمال کی تفصیل ... زبانی بیان کی جا سکتی ہے، وفور بے ربطی کے باعث اسے دام تحریر میں نہیں لایا جا سکتا"[2]

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مرزا غالب اب اسی منزل میں خود کو سانس لیتا اور سفر کرتا ہوا محسوس کر رہے تھے جس کی ترجمانی ان کے مذکورہ قطعہ سے ہوتی ہے ؎

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

آگے چل کر انھوں نے معتمد الدولہ آغا میر کے لیے جو کچھ لکھا ہے، وہ بے حد افسوسناک ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کا شاہی ادارہ اور نیا شہری ماحول اپنے معاشی، معاشرتی نظام اور اپنے داخلی استحکام کے اعتبار سے کس طرح معلوم و نامعلوم اسباب شکست و ریخت کا شکار تھا۔

سخن کوتاہ جو کچھ اس شہر میں اس سلطان صفت امیر کے بارہ میں سننے میں آتا تھا حق یہ ہے کہ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ابتداء کار میں جس شخص کو اپنی مقصد براری کے لیے اس نے اپنی دانست میں مناسب تصور کیا اس سے چپک گیا۔ اب کہ اپنی دولت

---

[1] اوراق معانی: ۶۶ (مصر خط بنام رائے چھج مل)

[2] ۶۵

کے استحکام کی طرف سے، اس کی خاطر جمع ہے، وہ روپیہ بٹورنے میں لگا ہوا ہے۔
.... لکھنؤ کے تمام خاندان اس بے رحم کی بیداد کی وجہ سے سیلاب بلا کی نذر
ہو گئے۔ اس شہر کے ناز پروردہ اب اِدھر اُدھر دوسرے شہروں میں دھکے کھاتے
پھر رہے ہیں اور وہ خود اپنی طبیعت کے اسراف بیجا سے پریشانی میں گرفتار اور اپنے کردار
کی پستی سے دل تنگ اور برگشتہ خاطر ہے۔[1]

غالب نے اس ضمن میں اس کا بھی اظہار کیا کہ ساہوکار اور تاجر پیشہ لوگ خفیہ طور پر
اب شہر سے اپنا کاروبار بنج بیوہار کانپور منتقل کر رہے ہیں، بہت آگے گئے باقی جو
ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے اس میں شاعرانہ مبالغہ کو بھی دخل ہو کہ نفسیاتی طور پر وہ
خود کو آسودگی و اطمینان سے بہت دور تصور کر رہے تھے، اسی کشمکش میں انھوں
نے لکھنؤ سے رخصت اور باندا میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا تھا: "جب اس دیار کا یہ حال ہے
تو یہی بہتر ہے کہ اسے چھوڑ کر میں اپنا سفر حال بیان کروں":

"ذی قعدہ کی ۲۵ر تاریخ کو میں جمعہ کے دن اِس ستم آباد سے باہر
نکلا اور ۲۹ر تاریخ کو دارالسرور کانپور پہنچا۔ دو تین مقامات سے ہوتا ہوا
بالآخر باندا پہنچ جاؤں گا۔ اور وہاں چند روز آرام کر کے اگر خدا نے چاہا اور
مرگ نے امان دی تو عازم کلکتہ ہو جاؤں گا۔"[2]

غالب اس اثنا میں باندا بھی ٹھیرے اور مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا
کے مہمان رہے۔ مولوی صاحب سے غائبانہ روشناسی لکھنؤ کے قیام میں مولوی
کرم حسین خاں کے وسیلے سے ہوئی تھی اور انہیں کی طرف سے تعارفی خط
لے کر وہ باندا گئے بھی تھے۔

ان کی طبیعت کانپور ہی میں ماندی ہو گئی تھی، رائے صاحب رام کے نام ایک خط میں

---

[1] ملاحظہ ہو: اوراق معانی ۶۶۔ [2] ایضاً: ۶۶۔

اس کی (تھوڑی سی) تفصیل بھی ملتی ہے جس سے مرض کی نوعیت کا بھی کچھ حال معلوم ہو جاتا ہے۔

"کیا لکھوں لکھنے کے لائق باتوں سے تو میں بالکل تہی دست ہو گیا ہوں اگر داخلیات کی بات کی جائے تو نہ ہی معدہ اور آنتوں کی تکلیف کا سلسلہ ہے کہ برابر چل رہا ہے اسی کے ساتھ برودتِ جگر، حرارتِ مزاج اور ضعفِ قلب کو بھی اس میں شامل کر لیجیے۔"[1]

یہ صورت حال کافی دنوں سے مرزا کی ہم سفر اور شریک حال تھی اور ایک ہمزاد کی طرح ہر مرحلہ میں ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کو انھوں نے جو خط "مودہا" سے لکھا، اس سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

"باندا سے رخصت کے بعد بخار اور درد سر جو باندا میں ساتھ تھا اب اس رہ آورد کا کوئی نشان نہیں، اگر کمزوری کا کچھ اثر باقی بھی ہے تو فکرمندی کی کوئی بات نہیں کہ وہ رفیق سفر ہے جو شروع ہی سے میری ہمراہی پر کمر بستہ ہے اس کی حق گذاری کا رشتہ بھی قوی ہے اور اس کی ہم سائیگی اور وفاداری بھی کہ میرے لیے طبیعت ثانیہ کا درجہ رکھتی ہے۔"[2]

نامہ ہائے فارسی میں بطور خاص اس کا ذکر ہے غالب نے "صنعت تعطیل" میں لکھی ہوئی دو تحریریں بھی مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کی خدمت میں روانہ کی تھیں، ان میں اپنی صحت کی خرابی اور کمزوری کا بھی ذکر کیا ہے جس کے سامنے وہ بے طرح درماندہ نظر آتے ہیں۔

— (یہ خط لکھنؤ سے روانگی کے بعد لکھا گیا ہے۔)

"میں کافی وقت کے بعد حاضر خدمت ہوتا ہوں، اسے ہرگز ہرگز میرے جذبۂ شوق اور جوشِ عقیدت کی کمی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ میری نارسائی

---

[1] اوراق معانی: ۴۷۔ [2] ایضاً

قسمت خیال کیا جائے۔ میری درماندگی کی عذر خواہی دراصل میری ناتوانی کی شدّت ہے۔ جس نے بیمار کے بستر کی طرح میرے پیکرِ وجود میں بہت سی شکنیں پیدا کر دی ہیں۔"

"میرا جسم ناتوانی ضعف و کمزوری کے ہجوم کے باعث اس نازک اور مہین ریشمی کپڑے کی طرح نظر آتا ہے جس میں موج ہوا سے اَن گنت شکنیں پڑ گئی ہوں ـــــــ مزید برآں یہ کہ اس خشک سالی و برگ ریزی کے موسم میں جسے پت جھڑ کا زمانہ کہنا چاہیے، تاب و تواں کا تصوّر بھی رنج سفر کے برابر ہو گیا ہے اور کامیابی کا خیال ناکامی کے مُترادف ـــــــ عمر گذری مگر کیا ہی ناخوش و نامراد گذری۔"

ممکن ہے ناتوانی کا یہ وفور اُن کے رنج سفر کا رہ آورد بھی ہو، مالک رام صاحب نے مرزا کی شدید کمزوری اور ضعف و ناتوانی کا ذکر جو لکھنؤ کے زمانۂ قیام سے وابستہ کیا ہے اس کا تعلق باندے کے سفر اور اس کے دورزمانی سے نسبت رکھتا ہو۔

لکھنؤ سے کانپور اور وہاں سے باندا تک کے سفر میں گام فرسائی اور راہ پیمائی کے ماسوا کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں مگر رودادِ سفر میں سلسلۂ حال و خیال کی جو پرچھائیاں ملتی ہیں انہیں اس مرحلہ پیمائی سے نسبت کے ساتھ اُن کے اس مکتوب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جو انھوں نے مودہا سے روانگی کے بعد لکھا۔

". . . اس مکتوبہ کا ہاتھ آجانا محض حسن اتفاق ہے یہ اس معنی پر گواہی دے گا کہ میں کس عالم میں یہ خط تحریر کر رہا ہوں پنج شنبہ کے دن مودہا میں پہنچ کر یک شنبہ تک آرام کیا۔ دوشنبہ کو کوچ کا نقارہ بجایا اور ایک رات ایک گاؤں میں بسر کر کے سہ شنبہ کو چلہ تارا پہنچا۔ خدا کا شکر ہے کہ دردِ سر کی تکلیف باقی نہیں رہی اور بخار نے سوادِ طبع سے رختِ سفر باندھ لیا۔

خاطر جمع رہے میں چلہ تارا پہنچوں گا اور کل صبح اگر زندگی باقی رہی تو فتحپور تک راستہ طے کیا جائے گا۔[1] یہ تحریریں جو اُن کے خطوں کی شکل میں ایک طرح سے اَن کا

---

[1] اوراق معانی: ۷۸۔

..... سفرنامہ بھی ہے گاہ گاہ روزنامچہ یا ڈائری کا انداز اختیار کر لیتا ہے اور اگر غالب کے یہ تمام خطوط ایک مجموعہ کی شکل میں پیشِ نظر رہیں تو انہیں غالب کا سفرنامۂ دیارِ مشرق بھی کہا جاسکتا ہے۔

"میں موڈہا (Modaha) سے نکلا اور ایک بیل تانگہ جس کو یہاں "لڑھیا" کہا جاتا ہے، بارکشی کے لیے کرایہ پر لیا چونکہ یہ مجھ سے بھی زیادہ ضعیف الخلقت اور آہستہ خرام بلکہ محزام تھا دس بارہ کوس بھی راہ طے نہ کرسکا اور موڈہا سے چلہ تارا تک اس کا پہنچنا مشکل ہوگیا ناچار رات تک ایک گاؤں میں رکنا پڑا — سہ شنبہ آخر شب میں روانہ ہوا اور دو پہر دن چڑھے چلّہ تارا کی ایک کارواں سرائے میں پہنچا اور یہ "ہیج محزام" جبتک ایک پہر رات نہ گذر گئی مجھ تک نہ پہنچ سکا۔[1]

غالب نے یہ اپنے سفر کا حال ہی نہیں لکھا بلکہ اس زمانے اور اس کے بہت بعد کے زمانے تک بھار کسوں، بیل گاڑیوں یا چھکڑوں سے جو سفر ہوتا تھا اور اس میں سست روی یا سست قدمی کے جو اسباب ہوتے تھے ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔

چلّہ تارا میں یک شنبہ قیام کی روداد غالب نے آگے چل کر لکھی ہے اور اس تحریر یا بزبان قلم تقریر کی مدد سے ہم کچھ وقت کے لیے غالب کے شریک سفر ہو سکتے ہیں۔

"اس وقت میں نے ایک خط رات کے سواد ظلمت میں لکھا ۔ ابھی تک ایک پہر رات نہ گذری تھی ملازموں نے چراغ بھی روشن نہ کیے تھے ... مرزا مُغل صاحب نے باندا میں فرمایا تھا کہ مولوی صاحب کو ارسال کیا جانے والا خط تھانے دار چلّہ تارا کو سپرد کیا جاسکتا ہے وہ پہنچا دیں گے"۔[2]

اب یہ اتفاق تھا کہ مرزا جب اس بیل گاڑی کے انتظار میں بیٹھے تھے (جسے فارسی خط میں "گردونکہ" کہا گیا ہے) جو ابھی پہنچی نہ تھی اور کچھ شریک سفر اُسی سے آرہے تھے اور پیچھے رہ گئے تھے کہ ناگاہ تھانیدار کارواں سرا میں پہنچا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

مرزا نے ترسیل خط میں اس سے اعانت چاہی بقول غالب ———

"اس نے قبول کر لیا مگر اس ناشائستہ انداز میں کہ قبول کرنے سے

---

[1] [2] اوراق معانی ،،

نہ قبول کرنا زیادہ اچھا لگتا، چنانچہ طبیعت نے ابا کیا اور اُسے خط دینا گوارا نہ کیا۔

ایک مسافر نے جس سے کوئی شناسائی بھی نہ تھی جب حضرتِ والا کا احوال مجھ سے سنا۔ تو بڑی انکساری کے ساتھ خط طلب کیا میں نے چند سطریں کہ جلدی جلدی رات کی اس تاریکی میں لکھی تھیں اس کے سپرد کیں۔" [1]

اس کے بعد انھوں نے بیل گاڑی کے بجائے الہ آباد تک کشتی میں سفر کو ترجیح دی، اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اسی نگارش نامہ میں لکھا:

" خلاصہ تحریر یہ کہ اس "گردونِ دوں" کی بیدادگری سے تنگ آکر میں نے خود کو دریا میں ڈال دیا اور "بسم اللہ مجریہا ومرساہا" کہہ کر خود کو سفینے اور سفینے کو رودِ جمنا کے سپرد کر دیا" [2]

ارے توبہ شہر الہ آباد بھی کوئی شہر ہے اس خراب آباد پر خدا کی لعنت۔۔۔ ارضِ الہ آباد اپنے نام نہاد بلکہ بے بنیاد شہر کے باعث آفاق کے تئیں وجہ روسیاہی ہے اس ہولناک وادی کو شہر کا نام دینا کتنی بڑی ناانصافی ہے۔"

قصہ مختصر۔ غالب یک شبانہ روز دیوزادوں کی اس سرزمین ناخوش آئین ۔۔۔۔ میں بھارکس کا انتظام نہ ہو سکنے کے باعث فروکش رہے اور جب کرایہ کی بیل گاڑی مل گئی تو صبح سویرے گنگا کے کنارے پہنچے بغیر کسی مزید تاخیر کے ہوا کے جھونکے کی طرح سطحِ آب سے گذر گئے۔

---

* غالب چونکہ یہ سوچتے ہوئے آئے تھے کہ وہ الہ آباد میں ایک ہفتہ ٹھہریں گے لیکن ایک ہفتہ دریائی سفر کی تکالیف معدے اور آنتوں میں ریاح بھر جانے کی وجہ سے وہ بہت پریشان بھی رہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو اوراقِ معانی: ۴۷ / [2] ایضاً۔

الہ آباد گنگا اور جمنا کے سنگم پر آباد یہ تاریخی شہر مرزا کو پسند نہ آیا۔ وہ جس مکان میں فروکش ہوئے وہ بھی ناپسند یدہ تھا کہ اس میں ان جیسے ایک سفر نصیب شخص کے لیے نہ راحت و آرام کا کوئی سرو سامان تھا نہ ان جیسے ایک مریض کے لیے دوا دارو کا بھی کوئی خاص اہتمام بازار خرید تک بھی وہ نہیں پہنچ پائے۔

ان کے فارسی خطوط کے ایک دوسرے مجموعہ "نامہ ہائے فارسی" میں اس ضمن میں جو تحریر نامہ ملتا ہے وہ قابل دید ضرور ہے چاہے لائق داد نہ بھی ہو۔ اس خط کے شروع ہی میں غالب نے وہ انداز گفتگو اپنایا ہے جو ان کی گلہ مندیوں کی طرف اشارہ سنج ہے۔ اس کی فارسی عبارت سے چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔

در مذمت شہر الہ آباد

آه از الہ آباد و لعنت خدا بر ایں خرابہ آباد . . . . کہ سوادش سرمایہ سیاہی آفاق ـــ چہ ناانصافیست ایں وادی ہولناک را شہر نامیدن . . .

ترجمہ: معدہ اور آنتوں میں پیچ و تاب ریح کی وجہ سے سخت کش مکش کا عالم دل بے چین و مضطرب بخار کی حرارت غریبہ کی وجہ سے بدن جیسے شعلہ بن گیا تھا اس طرح ہرج مرج کھینچتا ہوا ساتویں دن الہ آباد پہنچا۔ اس شہر الہ آباد پر صد آہ اور اس خرابہ معمور پر خدا کی ہزار بار لعنت جس کا سواد نامہ تمام ربع مسکوں کے وجود کے لیے روسیاہی کا سبب ہے اس ہولناک وادی کو شہر کہنا کتنی بڑی ناانصافی ہے۔"

وہ دریائی راستے سے الہ آباد پہنچے اور چند روز وہاں قیام کرنا آرام پانا اور ضروری اشیاء کی خریداری کر کے بنارس کا سفر کرنا چاہتے تھے۔ کچھ شب و روز گزر گئے، تو بہتے دریا میں کشتی کا یہ سفر آگے بڑھتی لہروں کے ساتھ ہوا۔

لہ نامہ ہائے فارسی: ۲۰۔

شہر الہ آباد سے متعلق انھوں نے جو کچھ سوچا اس کے اسباب و وجوہ جو بھی رہے ہوں بے آرامی مسلسل بے چینی و پریشانی اِس پر مستزاد ان حالات میں ان کی زبان قلم "سیاہی" میں ڈوب گئی اور وہ سیہ بر سفید کے انداز سے الہ آباد کی شہری فضا اور غیر صحت افزا آب وہوا کے خلاف لکھتے چلے گئے۔

ورود بنارس

اس شہر گنگ و جمن کے مقابلہ میں بنارس انہیں بہت پسند آیا شب مالوا، اور شام اودھ کی دل آویزیوں کے بارہ میں تو خیر غالب نے کبھی کچھ نہیں لکھا مگر بنارس اُس کے شب و روز صنم پرستوں کے اس شہر جمیل اور اس کے کافرانہ حُسن سے وہ اس طرح متاثر بلکہ مسحور ہو گئے کہ ان کا قلم اس حسین بتکدے بلکہ نورستان کی تعریف میں خوبان جہاں کی طرح گل کترتا ہوا آگے بڑھا۔

شیخ علی حزیں اور مرزا عبدالقادر بیدؔل کی شعری تخلیقات اور بالخصوص موخر الذکر شاعر کی دل آویز مثنوی کی یاد غالب کی مثنوی "چراغ دیر" نے تازہ کر دی۔ بنارس پہنچ کر غالبؔ نے رائے چھجمل کو، جو خط تحریر کیا ہے، اس سے دونوں کے مابین خوشگوار تعلقات اور خلوص خاطر کے رشتوں کا بھی حال معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ دیارِ مشرق کے سفر و حضر کے مابین غالب کی خط و کتابت کن کن لوگوں سے رہی

"آوارہ خراموں کے غم خوار اور درماندہ دلوں کے یارِ وفادار ....

" سخن مختصر، ماضی معلوم ہے اور مستقبل مجہول کیا لکھا جائے اور کیا کہا جائے۔ خدا کرے آئندہ جو صورت پیش آئے وہ لایق تحریر ہو....

تین خط اس کے ساتھ ملفوف ہیں ایک بنام مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں دوسرا مولوی فضل حق کی خدمت میں اور ایک غالب ناکام کے غم خانہ میں۔" [1]

بنارس کی سیر و سفر کے تاثرات غالب کے ادبی ذہن اور فن کارانہ حال و خیال

---

[1] اوراق معانی: ۶۷۔

پر مرتب ہوئے۔ بنارس کے ذکرِ جمیل کے ساتھ حسنِ کلام و لطفِ اظہار کی وہ کیفیت ہوتی ہے "گویا بتکدے کا در کھلا"۔

بنارس کی صنمستانی فضا سے غالب نے جس ذہنی رشتے اور جمال پرستانہ تعلق خاطر کا اظہار کیا اس کا اندازہ ان کی مثنوی چراغِ دیر سے ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے صنم پرستوں کے اس شہرِ آرزو کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

فرشتے اس کی خوشبوؤں کو اپنے شانوں پر لے کر فضائے قدس میں پرواز کرتے ہیں۔ اور اس کا سراپا اہلِ عشق و عقیدت کے تئیں "نظارہ گاہِ جمال" ہے۔ بنارس کے لیے کوئی کہتا ہے کہ یہ نگار خانہ چین ہے میں اسے بتِ چینی کہتا ہوں اور دریا گنگا کی لہریں اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی شکنیں ہیں، اس کے پیکر وجود کی طرفہ طرفہ دل آویزیوں کی وجہ سے، دہلی جیسا شاہی شہر اس کو دعا درود سے یاد کرتا ہے [1]

"یہ شہر حسین اپنے حسنِ بے نقاب کی ادانمائیوں کے ساتھ فرنگستانِ جمال کا ایک مرقعِ حسن ہے اور اس کی خاک کا ذرہ ذرہ آفتابِ جہاں تاب کی طرح تابناک ہے، اس کے بت اپنے حسن کشش میں شعلۂ طور کا سا انداز رکھتے ہیں اور ان کی پیشانیوں پر نورِ ایزدی برستا ہے۔

ان کی کمریں نازک اور دل مضبوط ہیں، یہ اپنی بھولی بھالی شکل و صورت میں بالکل ہی معصوم و نادان ہیں لیکن اپنی اداؤں سے دلوں کو شکار کرنا خوب جانتے ہیں، ان کے برگِ گل جیسے ہونٹوں کے لیے مسکراتے رہنا ایک فطری صورت اور طبعی تقاضہ ہے اور ان کے غنچوں جیسے دہن موسم بہار یا فصلِ ربیع کے پھولوں کے واسطے بھی رشک کا باعث بنے نظر آتے ہیں۔

بنارس اگر اپنے حسین وجود اور پر کشش نمود پر فخر و ناز کا اظہار کرے تو بھی

---

[1] ملاحظہ ہو نامہ ہائے فارسی غالب:

تو اس کے معنی کیا ہو سکتے ہیں۔

اُن کے یہاں بنارس کے ذکر کا آغاز ہو یا شعر و سخن میں اس کی یادوں کا سلسلہ ان کی صریر خامہ نوائے سروش ہی نظر آتی ہے۔

تعالیٰ اللہ بنارس چشمِ بد دور   بہشتِ خرّم و فردوسِ معمور

"سبحان اللہ یہ شہر اور اس کے اطراف کے یہ سبزہ زار — اور ہجوم لالہ و گُل۔ جس کے باعث اس شہر صنم آباد کو بہشت روئے ارض تصور کر لیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس کی تازگی بخش ہواؤں کو مُردوں کے قالب میں روحِ تازہ پھونکنے کی خدمت سپرد ہے اور اس کی خاک کے ذرّہ ذرّہ کو، جو کہربا کی سی خاصیت رکھتا ہے، یہ خدمت سونپی گئی ہے کہ وہ مسافرانِ راہ کے قدموں سے کانٹے چُن لے اور ان کی راہ میں ریشم بچھا دے۔

مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا سے اس خواہش کے ساتھ اپنے قلم کو اذنِ قیام دیتے ہیں، کہ ہم ایسے آوارگانِ دشتِ بلا کی غم خواری کی طرف متوجّہ ہوں اور ایک نوازش نامہ بلا کسی تاخیر کے انگریزی ڈاک میں روانہ فرما دیں جس سے مزاجِ اقدس کا حال بہ تفصیل معلوم ہو جائے۔

بنارس غالب کے سفرِ دیارِ مشرق کے نہایت خوبصورت تجربوں اور دلنشیں تاثرات میں سے ہے یہاں انھیں جو ذہنی راحت اور روحانی خوشی میسّر ہوئی نہ اس کا مقابلہ وہ دلی سے کر سکتے ہیں نہ لکھنؤ سے کہ وہاں جس اُمّید میں وہ گئے تھے وہ پوری نہ ہوئی اور اُن کے ذہن پر ایک سفرِ دور و دراز کا خیال اُن کے تصوّرِ حال کو اپنی گرفت میں لیے رہا۔

یہاں بے تکلف دوستوں کی محفلوں اور کوچہ و برزن کی سیر سے وہ اپنا دل نہ بہلا سکے۔ مگر بنارس کا تاثر تو عجیب ہے۔

خس و خارش گلستانست، گوئی | غبارش جوہر جانست، گوئی
سروشِ پائے تختِ بُت پرستاں | سراپایش زیارت گاہِ مستاں
بنارس را کسے گفتہ کہ چین است | زموجِ گنگ چینش بر جبیں است
بخوش پر کاریِ طرز وجودش | زِ دہلی می رسد ہر دم درودش

فرنگستانِ حسنِ بے نقاب است | زخاکش ذرہ ذرہ آفتاب است
بتانش را ہیولے شعلۂ طور | سراپا نورِ ایزد چشمِ بد دور
میانہا نازک و دِلہا توانا | زِ نادانی بکار خویش دانا
تبسم بسکہ بر لبہا طبیعی است | دہن ہا رشکِ گلہائے ربیعی است
بلند افتادہ تمکینِ بنارس | بود بر اوجِ او اندیشہ نارس

ترجمہ : شہرِ بنارس اے سبحان اللہ۔ اور اس شہرِ جمیل کا حسن مرحبا صد مرحبا یہ شہر نہیں خوشیوں کی جنت اور لطف و انبساط کا "بیت المعمور" ہے۔ اس کے خس و خار بھی شگوفہ زار کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کو چمن زار رنگ و بو کہا جاسکتا ہے۔ اس کی راہوں کا غبار بھی گلگونہ حیات سے کم نہیں۔ اسے اس شہر آئینہ تمثال کا جوہر کہنا چاہیے۔ یہ بت پرستوں کے تئیں ایک ایسا تخت رواں ہے جسے پرستان آرزو کا پرتو کہہ کر یاد کیا جاسکتا ہے۔

اس کا سراپا زیارت گہ رندان جہاں ہے بنارس کے لیے کوئی کہہ سکتا ہے کہ نگارخانہ حسین اور گنگا کی چنچل موجوں سے اس کے حسین ماتھے پر شکنیں پڑی ہیں۔ اس کے وجود جمیل کی پُرکاریوں کے باعث شہر دہلی اس پر درود و سلام بھیجتا ہے۔

یہ حسن بے نقاب کا فرنگستان ہے اور اس کا ذرہ ذرہ اپنی جگہ آفتاب تاباں ہے اس کے بتوں کا عکس جمیل چراغ طور ہے جسے نور ایزدی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اس کی حسیناؤں کی کمریں نازک اور دل سخت ہے اور وہ نادان ہونے کے باوصفت محبوبیت میں بڑی چالاک ہیں ان کے لبوں کا تبسم، موسم بہار کے پھولوں کی نظر گاہ ہے۔

بنارس میں رہتے ہوئے جہاں غالب حسین خیالات میں کھوئے رہے اور اس شہر بتاں میں ان کی آنکھیں جیتے جاگتے ہوئے حسین خواب دیکھتی رہیں، وہاں وہ لمحے بھی آئے جب ان کو شہر دہلی اور اپنے متعلقین کا خیال آیا اور انھوں نے بہت ہی اثر انگیز اور درد خیز اشعار لکھ کر دہلی کی یاد کو مثنوی چراغِ دیر میں دودِ چراغ محفل بنا کر پیش کیا، یہ اشعار اور ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

الا اے غالبِ کار اوفتادہ
ز چشم یار و اغیار اوفتادہ

چو بوئے گل ز پیراہن بروں آئے
بہ آزادی ز بندِ تن بروں آئے

مدہ از کف طریقِ معرفت را
سرت گردم بگرداں شش جہت را

فرو ماندن بہ کاشی نارسائی است
خدا را ایں چہ کافر ماجرائی است

بہ کاشی لختے از کاشانہ یاد آر
دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آر

دریغا در وطن دہ ماندہ چند
بخونِ دیدہ ز ورق راندہ چند

ہوس را پائے در دامن شکستہ
بہ امید تو چشم از خویش بستہ

بہ شہر از بیکسی صحرا نشیناں
بروئے آتشِ دل جاگزیناں

نگر کاں قوم را دہر آفریدہ
چو سیمابے بہ آتش آرمیدہ

ہمہ در خاک، برافگندۂ تو
بہ حکم بیکسی ہا بندۂ تو

چو شمع از داغِ دل آزر فشاناں
بہ بزمِ عرضِ دعویٰ بے زباناں

سر و سرمایہ غارت کردۂ تو
ز تو نالاں وے پروردۂ تو

از ایشاں انت تغافل خوشنما نیست
بہ داغ شاں ہوائے گل روا نیست

ان کی بیوی تو اس زمانے میں خود کو اور بھی زیادہ درماندہ اور بے سہارا محسوس کرتی ہوگی، کہ وہ اتنی دور کے سفر پر نکلے ہوئے تھے۔

سچ یہ ہے کہ غالب کے حالات کبھی بھی اطمینان بخش نہیں رہے آمدنی تھوڑی

اور اخراجات زیادہ اور پھر اس میں غالب کی آزادہ روی مسلسل قرضداری، پینے پلانے کی عادت اور رئیسانہ زندگی گزارنے کی خواہش اس کی تکلیف ان سے بھی کچھ زیادہ ان کی بیوی کے حصے میں آتی ہوگی۔

قابل تذکرہ بات یہ ہے کہ غالب نے اس موقع پر جب کہ وہ بنارس کی دل آویزیوں اور صنم پرستوں کے اس دیار کی رنگینیوں سے دل بہلا رہے ہیں انھیں اپنی بیوی یاد آتی ہے، وہ خاموش مزاج عورت جس کی زبان سے ہم کبھی کچھ نہیں سنتے کہ اپنے شوہر کی اس زندگی کے بارے میں اس کا اپنا ذہنی ردِ عمل کیا ہے کیا رہتا ہے۔ غالب اس نیک بخت بیوی کی شرافتوں کا کوئی جواب تو نہ دے سکے لیکن اپنی دل کی گہرائیوں میں انھیں اس کا احساس رہا۔

اس وقت اُن کے سامنے ایک سفر دور و دراز کے مرحلے ہیں اس کا ذکر بھی انھیں اشعار کے ذیل میں آیا ہے لکھتے ہیں۔ ؎

تُرا اے بے خبر کارے است در پیش	بیابانے وکہسارے است در پیش
تُرا زاندہ مجنوں بودہ باید	خرابِ کوہ دہاموں بودہ باید
تن آسانی بہ تاراجِ بلا دہ	چو بینی رنج خود را رونما دہ
شررآسا فنا آمادہ، برخیز	بیفشاں دامن وآزادہ برخیز

ترجمہ:

"ہاں اے غالب ناکام و نامراد آوارہ بخت و برگشتہ قسمت دوستوں اور دشمنوں کی آنکھوں سے گرے ہوئے انسان پھول کی خوشبو کی طرح پیراہن سے باہر آ اور جسم کے قید و بند سے نجات حاصل کر۔ آزادی کی فضا میں سانس لے۔ اپنے ہاتھوں سے معرفت کی ڈور کو مت چھوڑ۔ میں تیرے قربان ہوں اس شش جہت میں سفر کر اطراف عالم کو دیکھ۔ کاشی میں مستقل طور سے فرد کش ہونا ایک طرح کی نارسائی ہے کبھی یہ تو سوچ کہ یہ کیسی کافرا جرائی ہے جو تیری زندگی میں

داخل ہوگئی ہے۔

اس دیرِ ستان یا شہرِ صنم پرستاں میں رہ کر تو اپنے کاشانے کو بھی بھول گیا اس ارضی بہشت کو کچھ دیر کے لیے بھلا دے اور اس گوشۂ ویران کو یاد کر جو تیرا اپنا غم کدہ ہے افسوس افسوس وطن میں رہنے والے افراد جن کی آنکھوں سے خون کے آنسوؤں کی ندی رواں ہے اور وہ اسی لہو کے سیلاب میں اپنی زندگی کی کشتی کھے رہے ہیں۔

"کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں"

والی کیفیت ہے۔ انھوں نے ہوا و ہوس کے پیروں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے بلکہ یہ کہیے کہ وہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے ہیں تیری طرف اپنی چشمِ اُمید کو لگائے ہوئے ہیں۔ اگرچہ شہر میں رہتے ہیں لیکن بے کسی کی حالت میں گویا وہ صحرا نشین ہیں۔ جہاں دور تک سوائے خاک اور گرد و غبار کے کچھ نہیں انھوں نے اپنے دل کی آگ پر اپنے آپ کو فروکش کر لیا ہے۔

گویا اس قوم کو زمانے نے اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ آگ اور انگاروں پر قرار پکڑے ایک ایسے پارے کی بوند شعلہ سیماب کی طرح جسے شیشے میں بند کر کے آگ پر رکھ دیا گیا ہو لیکن وہ اپنے دل کے شعلوں ہی میں پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔ یہ وہ انسانی افراد ہیں جن کو بے طرح وقت نے تیرے نام پر غبارِ راہ بنا رکھا ہے اور خاک پر پھینک دیا ہے۔ انھوں نے صبر و ضبط اختیار کیا ہے اور تیرے پابند ہو کر بیٹھ گئے ہیں وہ شمع کی طرح اپنے دل کے داغ سے آتش افشانیاں کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہر طرف شور و غوغا ہے۔ وہاں وہ بے زبان خاموش بیٹھے ہیں اور کسی سے کچھ کہتے بھی نہیں۔

اے غالب وہ شخص تو ہی ہے جس نے ان کے سر و ساماں کو غارت کیا ہے وہ تیرے فریادی ہیں مگر انھوں نے تیرا ہی دامن پکڑا ہے اور تیرے ہی اس دامنِ تار تار میں پناہ لی ہے۔ اور جب ان کا دل داغوں کی کائنات بن گیا ہو تو اے غالب تیرے

لیے پھولوں کی خواہش کہاں جائز ہے"

(اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب ہزار آزادہ رو شخص ہوں اور خانگی زندگی کی ذمہ داریوں سے گھبراتے ہوں لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ یہ ضرور محسوس کرتے تھے کہ وہ لوگ کتنے دکھی ہونگے جو ان کی زندگی میں شریک ہیں (خاص طور پر ان کے اہل خانہ)

(ترجمہ:)

"اے بے خبر تجھے تو ایک بڑی مہم درپیش ہے ایک بڑا کام جسے انجام دینے کے لیے بڑی ہمت چاہیئے اور تیرے راستے میں تو کہیں بیابان ہے کہیں کوہسار کہیں دریا ہیں کہیں پہاڑ تجھے تو مجنوں کی طرح بیابانوں کا سفر کرنا اور دشت و کوہ سے گزرنا ہے جو ایک بہت ہی دشوار مرحلہ ہے صبر آزما سفر کی منزل ہے اس تن آسانی کو چھوڑ اور اسے بلاؤں اور مصیبتوں کے راستے پر ڈال دے تجھے تو معلوم ہے کہ تیرا سفر کس قدر رنج و مصیبت کا سفر ہے۔ جو تیری آنکھوں کے سامنے ہے اور کوئی اس سفر میں تیرا ساتھی، تیری رہنمائی کرنے والا اور تجھ سے ہمدردی رکھنے والا بھی نہیں۔ اب تجھے شرر کی طرح خود کو آمادۂ فنا کر کے اٹھنا ہے۔ ۔ دامن جھاڑ دے اور آزادوں کی طرح بنارس سے دل اُٹھا کر اپنی منزل (کلکتہ) کی طرف روانہ ہو جا۔"

غالب کی نثر ہو یا نظم، غزل ہو، یا قصیدہ، مثنوی ہو یا قطعہ مرقع نگاری کے نمونے ان کی زندگی اور ذہن کی پرچھائیاں مسلسل ان شعرناموں میں ملتی چلی جاتی ہیں۔ جتنا جتنا ان پر غور کیا جاتا ہے غالب کی سوانح اور سیرت کے مختلف مرقع سامنے آتے جاتے ہیں۔

چمنستان بنارس میں قیام کے آخری دن کی روداد کچھ اس طرح ہے۔

"آج کہ جمعہ کا دن ہے، ایک گروہ کے نزدیک ماہِ رواں کی ۹/تاریخ ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ آج نو نہیں دس ہے میں رخت سفر باندھنے کی فکر میں پڑا ہوا ہوں اگر رات خیریت سے گذر گئی اور میرا وجود موہوم معدوم محض نہ ہو گیا تو میں کل کہ شنبہ کا دن ہو گا بنارس سے رخصت ہو جاؤں گا ــــــــــ"

باقی ماندہ سفر ایک اچھا خاصا طویل مرحلہ تھا: بنارس سے عظیم آباد تک گھوڑے پر سواری کے وسیلہ سے راہ سفر طے ہوئی اور وہاں سے پھر کشتی بانوں کے رحم و کرم پر وہ آبی رہگذر سے سفر کرتے ہوئے آگے بڑھے نہ عظیم آباد میں قیام کیا نہ مرشد آباد میں۔ کشاں کشاں ان کا خواب انھیں کلکتہ لے گیا۔

دہلی سے بھرت پور، پھر بھرت پور سے فیروز پور جھرکہ (ممکن ہے اس میں لوہارو بھی شامل ہو) وہاں سے پانی پت۔ پانی پت سے کانپور۔ لکھنؤ۔ وہاں سے باندا۔ باندا سے مودہا، فتحپور چلہ تارا۔ الہ آباد۔ بنارس۔ عظیم آباد وغیرہ شہروں اور بستیوں کا سفر کرتے ہیں۔

کہیں بیل گاڑی کہیں کشتی، کہیں گھوڑا کہیں بھارکس مختلف شہر و دیار آبادیاں، بستیاں اور ویرانے راہ میں آئے ــــــ لکھنؤ، باندا اور بنارس کا قیام مختلف بڑے اور چھوٹے لوگوں سے معاملہ۔ طرح طرح کے وسوسے پریشانیاں قرض خواہوں کی دار و گیر۔ بھائی کی دیوانگی، کتنی باتیں تھیں جو سایہ کی طرح پیچھا کرتی رہیں۔

یہ تجربہ بالکل نیا تجربہ تو نہیں تھا اُردو کے کئی ادیب اور شاعر وہاں جاچکے تھے لیکن غالب کے یہاں فکری اور فنی اعتبار سے اس تجربے کا اثر و تاثر غیر معمولی ہے براہ راست بھی اور بالواسطہ بھی، ان کی آئندہ زندگی کی نفسیات پر یہ تجربہ کہیں خواب اور کہیں شکست خواب کی صورت میں اپنی پرچھائیاں بکھیرتا رہا۔

کیا غلط ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم اس کے حُسنِ کشش کی بلندیوں کو نہ چھو سکیں اور ہمارے خیال کی اُن تک رسائی نہ ہو۔

آگے چل کر غالب نے جن خیالات اور جذبات کا اظہار کیا ہے وہ بنارس کے شہر اور حسن شہریت کے ساتھ اُن کی شیفتگی کا جذباتی رویہ ہے جسے وہ بے تکلف مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کو لکھ بھیجتے ہیں۔

"اس تماشا گاہ کی دل فریبی کے باعث میرے دل سے غریب الوطنی کا خیال محو ہو گیا اور میں اپنے وطن سے دوری کو بھول گیا۔ یہاں معبدوں سے جب نغمۂ ناقوس بلند ہوتا ہے تو اس کی انبساط آفریں آواز میرے دل میں عجیب خوشی اور مسرت کی لہر پیدا کرتی ہے۔ یہاں میرا ذوقِ جمال پرستی و انبساطِ نظر کچھ اس طرح دیر نشین بتوں کے نظارۂ حسن میں محو ہوا کہ میں نے اس عالم بے خودی میں یاد وطن کو اپنے دامانِ دل سے گردِ راہ کی طرح جھاڑ دیا۔ اور اس شہر حسین کی دید میں میری طبیعت کچھ اس طرح از خود رفتہ ہو گئی کہ دہلی کے لیے طاقِ نسیاں کے ماسوا کوئی جگہ نہ رہی۔

"یہ عجیب صورت حال ہے کہ اگر میرا دل دشمنوں کی طعنہ زنی کے خوف سے زخمی نہ ہوتا تو میں اپنا دین چھوڑ دیتا اپنی پیشانی پر قشقہ لگا لیتا اپنے دوش کو زنار سے آراستہ کرتا۔ اور اس وضع کے ساتھ اتنے دن دریائے گنگا کے کنارے بیٹھتا کہ غبارِ ہستی سر تا سر اپنے پیکر وجود سے دھو ڈالتا۔ اور قطرے کی طرح دریا میں مل جاتا۔"

آگے چل کر اسی مکتوب کے ذیل میں یہ تحریر بھی آتی ہے۔

"یہاں پہنچ کر جس کو "ارم آباد" کہنا چاہیے، کسی علاج معالجہ یا دوا دارو کے بغیر،

لہ ملاحظہ ترجمہ، نقش نیم رُخ : ۶۴۔

جن عوارض نے مجھے گھیر رکھا تھا ان کی تشویش میرے دل سے محو ہو گئی بلکہ اصل مرض میں بھی تخفیف محسوس کر رہا ہوں، جو مرکبات معمول کے مطابق کام میں لائے جا رہے ہیں اُن کا سبب بھی حزم و احتیاط ہے، ورنہ اس وقت تو یہ حال ہے کہ نہ ماضی کی تکلیفوں کی تلافی منظور ہے نہ رعایتِ حال۔"

یہ خط غالب کی تحریر نہیں بزبان قلم حُسن نفز بر ہے۔ جس کو ایک سننے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ غالب کے قلم کی آواز درِ دل پر دستک دے رہی ہے اور اپنے ساتھ چلنے پر دل و نگاہ کو آمادہ کر رہی ہے۔

"میرے قبلہ گاہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ غالب کا دل خیرہ سری اور پریشان نظری کے سبب بنارس میں اس طرح پھنس گیا ہے کہ جیسے مکھی شہد میں پھنس جاتی ہے اور پھر مجھ ایسے کسی افلاس زدہ اور مصیبت میں گرفتار انسان کے لیے ٹھہرنے کا خیال بھی "خیال محال" کا درجہ رکھتا ہے۔"

"سیر و تفریح کی غرض سے یہاں رہوں یہ دل و دماغ کہاں بعض دواؤں کی فراہمی جن کی اکثر ضرورت پڑتی رہتی ہے اور اسی طرح جاڑے کی آمد آمد کا خیال کرتے ہوئے کپڑوں کی خریداری کی غرض سے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"پانچ دن سرائے نیرنگ آباد میں جسے لوگ "سرائے نورنگ آباد" کہتے ہیں۔ ایک مکان اسی محلہ اور اسی سرائے کے عقب میں ملا جو بخیل کی گور سے بھی زیادہ تنگ اور تاریک ہے۔ بہر حال بستر کھول دیا اور اس کے کنارے لیٹ گیا۔ آرام کیا۔ اگرچہ دواؤں کو جوش دینا اور اسی سلسلہ کی دوسری کارگزاریاں بحالت سفر کسی چادر میں پیوند پر پیوند لگانے کے مترادف ہیں۔ ایسے کام فرصت و فراغت کا تقاضہ کرتے ہیں چار ہفتے یہاں قیام رہے گا اور جو ایک ہفتہ غفلت میں بسر ہو گیا وہ بھی اسی میں محسوب ہوگا۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ غالب ایک ماہ جس میں یہ ایک ہفتہ بھی شامل ہے وہاں قیام پزیر رہے اور یہ جاڑے کے موسم کی آمد آمد کے پیشِ نظر اکتوبر کا مہینہ ہونا چاہیے۔ ممکن ہے نومبر بھی

اس میں شریک ہو گیا ہو۔ اب یہاں سے انھیں عظیم آباد جانا ہے وہاں سے مرشدآباد جس کے آگے بڑھ کر ان کی منزل سفر کلکتہ ہے انگریز کمپنی بہادر کی راجدھانی۔

وہ دشت و دریا کے مسئلہ میں الجھے ہوئے ہیں کہ آخر کیا ہو کبھی دل میں یہ بات آتی ہے کہ وہ خشکی کے راستے سے عظیم آباد جائیں اور وہاں سے کشتی کرایہ پر لیں اور کبھی جی میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ یہیں سے کیوں نہ دریا کا سفر اختیار کر لیا جائے۔ جس مکان میں وہ فروکش رہے وہ سرائے نورنگ آباد کا ایک گمنام گوشہ تھا جس کا اتا پتہ جیسے کچھ تھا ہی نہیں اور اس پر وہ شرمندہ بھی ہیں۔

"یہ شرم نارسائی اس بات پر ہے کہ جہاں میں ٹھیرا ہوا ہوں، وہ ایک بوڑھی عورت کا مکان ہے، وہ اتنی مفلس ہے کہ اس کے چراغ میں اکثر تیل نہیں ہوتا . . . . نہ یہاں کوئی نامی بازار ہے نہ شاندار مکان نہ شاندار حویلی ہے کہ جس کے جوار کی وجہ سے نام و نشان تلاش کیا جاسکے اور دوسرے اسے جانتے ہوں۔" [1]

"کوئی نامہ بر چاہے وہ پیکر خیالی ہی کیوں نہ ہو، آخر کس شہری پتہ اور کس نشانی سے یہاں پہنچے میرے مخدوم (یعنی آپ) جب مکتوب روانہ فرمائیں تو اسے سپرد خدا فرمادیں، یہ پتہ لکھدیں سرائے نورنگ آباد قریب مکان گھوسی خان ساماں، مٹھائی کی حویلی . . . . اسد اللہ خاں (غریب الوطن) کو ملے ۔۔۔۔

شاید کہ محکمۂ ڈاک کے لوگ ایک ایسی دعا کے تیر کی طرح جو مقبول ہوتی ہے، اسے بھی نشانے تک پہنچادیں۔" [2]

اس سے اور دوسرے اسی اثنا میں لکھے ہوئے خطوط سے غالب کے کوائف ذہنی کا بھی حال معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اس دور زندگی میں ڈاک کی آمد و رفت کے وسایل کیا تھے۔

---

[1]/[2] نقش نیم رخ : ۶۶۔

ناخداؤں (ملاحوں) نے کشتی کے معاملہ میں بڑی بے رحمی کا مظاہرہ کیا اور بنارس سے کلکتہ تک کا کرایہ مبلغ سو روپے طلب کیا اور عظیم آباد تک تیس روپے سے زیادہ مانگا ناچار گھوڑے پر سوار ہو کر اس بقعۂ زمین میں سفر کرنے کی بات طے کی ابھی کشتی کا خیال میرے دل سے رخصت نہیں ہوا

ورود کلکتہ:

اس مختصر سے بیان نامہ سے ہم دیار مشرق کی راہ سفر کا کچھ حال جان سکتے ہیں، یہ صورت حال "عذر نارسائی" کے ضمن میں بھی ان کے بیان کا حصہ بنی لیکن غالب کے سفر اور مشکلات سفر کے سلسلہ میں اس کی اہمیت کلیدی ہے۔

"ہنگامۂ دیوانگی برادر ایک طرف اور قرض خواہوں کا شور و شر دوسری طرف عجیب پُرآشوب دور تھا کہ نفس نے لبوں کی راہ فراموش کر دی اور آنکھوں کی روشنی پتلیوں کے روزنوں کو بھول گئی۔ دنیا میری نگاہوں میں تاریک ہو گئی۔ میں نے اپنے لبوں کو سی لیا اور اپنی طرف سے خود ہی آنکھیں بند کر لیں۔ جہاں جہاں شکستگی اور عالم عالم خستگی میرے وجود کا حصہ بن گئی۔ زمانے کی بیداد سے فریاد بہ لب تلوار کی دھار پر سینے کے بل چلتا ہوا کلکتہ پہنچا۔"[1]

مرزا غالب ۲۷ فروری ۱۸۲۷ء کو کلکتہ پہنچے تھے اس تکلیف دہ سفر کی روداد نہیں اس کی افتاد کا حال احوال ان کو بہت دنوں تک یاد آتا رہا میر اعظم علی مدرس، مدرسہ اکبر آباد کے نام ایک خط میں اسے پھر یاد کیا ہے۔

"جہاں جہاں شکستگی اور عالم عالم خستگی کو میں نے رخت سفر کے طور پر اپنے ساتھ لیا زمانہ کے ظلم و ستم سے فریاد کناں اور تلوار کی دھار پر سینہ کے بل سفر کرتا ہوا کلکتہ پہنچا۔"

نواب احمد بخش خاں کا انتقال

---

[1] [2] اوراق معانی: ص ۸۶ — ۱۸۵۔

کلکتہ پہنچنے سے پہلے فضل مولے خاں نام کے اپنے ایک دوست کے ذریعہ انہیں فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی ۔ اس کے باوجود کہ نواب مرحوم اس مقدمہ کے سلسلہ کی ساری مشکلات اور پیچیدگیوں کے سرچشمہ تھے پھر بھی غالب کی شرافت نفس تھی کہ انھوں نے نواب صاحب کے سانحہ ارتحال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا اور کلکتہ پہنچ کر جلد از جلد اپنے برادر نسبتی علی بخش خاں بہادر کو خط لکھا۔ فضل مولے خاں میرے ایک دوست ہیں مرشد آباد میں اچانک ان سے ملاقات ہو گئی سلسلہ گفتگو میں یہ بات ان کی زبان پر آئی کہ نواب فخرالدولہ کا انتقال ہو گیا۔ کلکتہ پہنچا تو مرزا افضل بیگ اور دوسرے کچھ دوستوں سے بھی یہی معلوم ہوا۔

افسوس کہ اس خاندان کا چراغ روشن نہ رہا اور اس کے شبستان آرزو میں اندھیرا چھا گیا۔

"فکر مند ہوں اور اندیشہ یہ ہے کہ اب جو کچھ ہوگا وہ تمہارے حسب دل خواہ نہ ہوگا ناکسوں کی بن آئے گی اور نا اہلوں کا دور دورہ ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ انجمن درہم برہم ہو جائے ناکردہ کار و بد خواہ جمع ہو جائیں خوش بختی کنارہ کرے اور آسودگی رخصت ہو۔"[1]

مرزا علی بخش بہادر کو نواب صاحب کی سرکار سے سو روپیہ ماہوار وثیقہ بھی ملتا تھا نواب صاحب، بھتیجہ ہونے کی وجہ سے بھی ان کی سرپرستی فرماتے ہوں اس کا بالکل امکان ہے اسی لیے اس موقع پر ان کی طرف سے غالب زیادہ فکرمند اور تشویش کا شکار رہیں۔ (آگے چل کر لکھا ہے۔)

"دیکھو پوری طرح دور اندیشی سے کام لیتے رہو اپنے احوال پر نظر رکھو . . . . اور اس آشوب ماتم کے بعد جو صورت حال بھی وہاں سامنے آئی ہو مجھے اس سے مطلع کرو۔"[2]

---

[1] [2] اوراق معانی : ۸۴ ۔

کلکتہ پہنچ کر مرزا غالب نے مولوی محمد علی کو جو خط تحریر کیا ہے اس میں راہِ سفر کے باقی ماندہ مرحلوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

اُس سنگ درئے جسے سجدۂ عقیدت کے لیے "مُہرِ نماز" قرار دیا جاسکتا ہے اتنی دوریاں موجود ہیں جنھیں "کعبتین" کے فاصلوں سے کم نہیں کہا جا سکتا ——— عطوفت نامہ نے بنارس کی خاک نشینی کے زمانہ میں میری چشم بخت کو نور اور بخت چشم کو سرور بخشتا تھا۔ اس تحریر والا کے جواب میں ورقِ بندگی روانہ کیا اور خشکی کے راستے عظیم آباد کا سفر اختیار کیا۔

فی الجملہ توجہ قدسی کی بدولت کہ سرچشمۂ فیوض و برکات ہے گردِ راہ کی طرح کوہ و بیاباں میں افتاں و خیزاں سفر کرتے اور خارِ خارِ مصائب کے باعث سینہ کو دم تیغ سے گذارتے ہوئے کبھی شدتِ سرما کے باعث یخ بستہ راتوں کے لمحات میں افسردہ خاطر کبھی گردش ایام کی چیرہ دستیوں سے نالاں ——— بروز چہارشنبہ رمضان المبارک کی چوتھی تاریخ کو دن چڑھے کلکتہ پہنچ گیا۔[1] اس طرح یہ داستان سفر ختم ہوئی اور غالب ایک طویل راہ سفر کے اس تجربے سے گذرے جس گذرگاہ کے وہ تنہا مسافر تو نہ تھے۔ مگر اس رہگذار اور فیروز پور جھر کہ سے کلکتہ تک راہ نوردی اور جادہ پیمائی کا جو تجربہ اور تجزیہ ان کے حصہ میں آیا اس میں وہ بہت منفرد تھے۔

شہر کلکتہ جو اس وقت ہندوستان کی نئی فرماں روا قوم کا مرکزِ حکومت تھا اپنی فضا اور آب و ہوا کے اعتبار سے انہیں بہت پسند آیا۔ جو مکان ان کو رہائش کے لیے صرف دس روپے ماہوار کرایہ پر مل گیا وہ بھی ہوادار روشن اور کشادہ تھا۔ مرزا غالبؔ نے اس پر بطورِ خاص اظہارِ طمانیت کیا ہے علی بخش خاں کے نام ایک

---

[1] نقش نیم رُخ : ۷۔

خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

. . . . غالب راہ رو کا زمانۂ دشت نوردی تمام ہوا اور اس نے اپنی منزل مراد پر پہنچ کر رختِ سفر کھول دیا ـــــــ کلکتہ ایک ایسا دیار ہے جہاں ہر نوع کے ساز و سامان کی فراوانی ہے جس کے ہنرمندوں کے تئیں بجز چارۂ مرگ ہر مرض کا علاج آسان ہے اور خوش نصیبی کے ماسوا اس کے بازاروں میں ہر شے بہ افراط ملتی ہے اور بکثرت دستیاب ہے۔

میری قرار گاہ شملہ بازار میں واقع ایک کاشانہ ہے جس روز میں یہاں پہنچا اسی دن یہ مکان بغیر کسی زحمت اور تردّد کے مجھے کرایہ پر مل گیا۔ [1]

اسی مکان کا ذکر، بعض ان رہائشی سہولتوں کے ساتھ جو اس میں موجود تھیں ایک دوسرے خط میں بھی آتا ہے۔

(اس گھر سے متعلق مولوی محمد علی خاں کے نام اپنے خط میں غالب نے لکھا ہے)

"میں اپنے خداوند کا شکر بجالاتا ہوں کہ ایک ایسے مقام میں جہاں میں اجنبی محض ہوں ایک ایسا گھر جس میں ہر طرح کی راحتیں موجود ہیں بغیر کسی محنت و کاوش اور کسی شخص کی منت پزیری کے کچھ روپے ماہوار کرایہ پر مل گیا ہے ـــــ اس میں آزاد طبع لوگوں کی خاطر جیسی راحت بخش فضا ہے اور حریفوں کے کشادہ دہانوں جیسا بیتُ الخلا ـــ ایک گوشہ میں ایک کنواں ہے جو آبِ شیریں سے پُر ہے اور اس کی بالائی منزل میں ایک کمرہ ہے جو صاحب ثروت لوگوں کے لیے آرام گاہ کے طور پر کام آسکے میں نے اسے تکیہ گاہ بنا لیا ہے۔ [2]

مرزا غالب کو کلکتہ پہنچ کر سب سے پہلی فکر یہ تھی کہ وہ جلد از جلد ان انگریز

---

[1] اوراق معانی : ۵۱۔

[2] نقش نیم رُخ : ۷۵۔

حکام سے ملیں۔ جو اُن کے مقدمہ کی کارروائی کو آگے بڑھا سکیں اور اس راہ کی قانونی دشواریوں اور پیچیدگیوں کو کم یا ختم کرنے میں ان کے مددگار و معاون ثابت ہوں ـــ مسٹر اندرو اسٹرلنگ ایسے ہی انگریز افسران میں تھے۔

مرزا علی بخش بہادر کے نام اپنے اسی خط میں اُن سے پہلی ملاقات کا تذکرہ اس طور پر کیا ہے۔

"اسے ایزدی نوازشوں میں شمار کرنا چاہیئے کہ مجھ ایسے ایک نووارد کو جس کی مثال کسی ایسے شخص کی سی ہے۔ جو ہنوز خوش خوابی سے بیدار بھی نہ ہوا ہو اور ہاتھ منہ دھوئے بغیر حکامِ بالادست و عالی مرتبت کی بارگاہ میں پہنچ گیا ہو۔ اُسے حاکمانِ والاشان اپنے دل و نگاہ میں جگہ دیں اور اپنی انجمن میں وہ رُتبہ عطا کریں جو اس کی اپنی خواہشوں سے بھی کچھ فزوں تر ہو۔ . . . . "

مسٹر اندرو اسٹرلنگ کو میرے حال پر رحم آیا ـــ یہ ایک انگریز افسر ہیں اور اعیانِ کونسل میں سے ہیں ـــ نیز ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ دردمندوں کے چارہ ساز اور خستہ خاطروں کے غم گسار ہیں۔ [1]

مرزا غالب اس وقت اپنی ذہنی پریشانیوں کی وجہ سے پژمردہ خاطر اور مستقبل کی طرف سے مایوسی اور احساس محرومی کا شکار ہیں۔ اسی خط میں آگے چل کر ان کی زبان قلم پر یہ فقرے بھی آئے ہیں۔

"اگرچہ میرا دل کہ ایک مدّت سے مایوسیوں کا خوگر ہے یکایک ناامیدی کے رشتے کو منقطع بھی نہیں کرسکتا۔ پھر بھی یہ مردِ توانا دل . . . . . مجھ میں اور میرے احساس محرومی میں دائمی جدائی کی طرح ڈال دے تو کوئی تعجب کی

---

[1] اوراق معانی : ۵۱۔

بات نہ ہو گی۔

مسٹر اینڈ رواسٹر لنگ سے غالب بہت متاثر ہوئے اور یہ تاثر ایک کے بعد دوسری ملاقات میں برابر آگے بڑھتا رہا انھوں نے ایک سے زیادہ خطوط میں اس کی ذاتی خوبیوں اور آفیسرانہ حیثیت کا تعارف کرایا ہے اور اُس سے بڑھ کر اس کی تعریف میں بزبان فارسی ایک قصیدہ بھی لکھا۔

نواب علی اکبر خاں طباطبائی (مہتمم وقف، امام باڑہ ہگلی بندر)

چند روز بعد غالب نواب صاحب سے ملنے گئے اس کیلئے تعارفی خط مولوی محمد علی خاں نے دیا تھا اور براہ راست نواب صاحب کو بھی خط لکھ دیا تھا غالب نے مولوی صاحب کے نام اپنے مذکورہ مکتوب میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

" دو دن دو رات میں نے اس راحت کدے میں آرام کیا اور ایک طویل راہِ سفر کی تھکن سے نجات پائی بعد ازاں آپ کے منشور لامع النور کو مشعل ہدایت بنایا اور اپنی منزل مراد کی طرف قدم بڑھا دیا کشتی میں بیٹھ کر ہگلی بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا۔

پہلے میں نے اس مقدس ایوان کی طرف رخ کیا جہاں حضرت امام حسین کی "ضریح مبارک" رکھی ہوئی ہے اور اس متبرک مقام کی زیارت کی۔ جب حضرت کی بساطِ قرب تک پہنچا تو فرط عنایت سے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ تمہارے انتظار میں تو کئی روز گذر گئے۔ ...

میں دو تین ساعت نواب عالی جناب کی خدمتِ اقدس میں ٹھہرا پھر اجازت طلب کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے غم کدے کی طرف واپس آگیا۔[1]

ایک اور خط میں نواب صاحب سے ملاقات کا ذکر درمیان میں آتا ہے اور ہم غالب سے اس ملاقات کی روداد سنتے ہیں۔ توان فقرات سے گذرتے ہیں۔

[1] اوراق معانی : ۸۷

پرسش وارتباط کی صورت درمیان میں آئی مقدمہ کا حال میں نے بہ تفصیل بیان کیا۔ حضرت نے اس طرح سے دل دہی نہ فرمائی کہ میں اسپر خوشی کا اظہار کرسکوں اور نا اُمید بھی نہیں فرمایا کہ میں اس کا خیال ہی ترک کردوں۔ ۔

جہاں بے مہر و گیتی دُشمن و دلدار مُستغنی
مرا بر آرزو ہائے سنائی خندہ می آید

(دنیا جس کے ساتھ بے مہری کا سلوک کر رہی ہو زمانہ جس کا دُشمن ہو اور محبوب جس کی طرف سے بے پرواہو اِن حالات میں مجھے تو سنائی کی آرزومندیوں پر ہنسی آتی ہے)

میرے بخت نارسا کی آشفتگی پر نظر فرمائیے کہ آج کل نوّاب صاحب کو ان زمینات دنفد کے بارے میں، جو امام باڑہ ہگلی سے تعلق رکھتی ہیں، ہگلی کے کلکٹر کے ساتھ معارضہ در پیش ہے اور ان کا دل اپنے اس معاملہ میں بے طرح اُلجھا ہوا ہے یہ باتیں نہ صرف یہ کہ نوّاب صاحب کی اپنی گفتگو سے معلوم ہوئیں بلکہ خارج سے بھی اس باب میں بہت کچھ سننے میں آیا۔"

اسی خط میں آگے چل کر فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں کا ذِکر اُن کی زبانِ قلم پر آیا اور ایک حد تک حریفانہ انداز سے آیا۔

" نوّاب احمد بخش خاں (مرحوم) کے واقعۂ وفات کی خبر حضرت والا کے گوشِ اقدس تک پہنچ چکی ہوگی۔ نواب صاحب کے پیکرِ عنصری کا معدوم ہو جانا اگر میرے اس مقدمہ کو فائدہ نہیں پہنچاتا تو نُقصان کی بھی اس سے کوئی صورت مُتصوّر نہیں لیکن اس صورت حال کے بارہ میں سوچ کر بے خود ہوا جارہا ہوں' ایک یہ کہ مجھے مستقبل کے

لہ نقشِ نیم رُخ : ۷۶۔

بارے میں جو خطرا تھا وہ ابھی سامنے آ گیا یعنی اپنے بھائیوں کے سامنے گدائی
کے لیئے ہاتھ پھیلانا نہ پڑے۔

دوسرے یہ کہ جو مسرّت مجھے نوّاب صاحب سے مقدمہ جیت کر ہوتی
اب اس کا موقع ہی نہ آئے گا یعنی کسی غاصبِ قوی سے انتقام لینا اور
پھر اس پر فخر و مباہات کا اظہار کرنا۔"

اس کے یہ معنی ہیں کہ غالب اس بارۂ خاص میں نواب فخرالدولہ کو "غاصب قوی"
خیال کرتے تھے کہ وہی دراصل اُن کی تمام حق تلفیوں کے ذمّہ دار تھے۔

یہ بہت عجیب اور نازک صورت حال تھی کہ ایک طرف تو غالب نوّاب امین الدین احمد خاں اور
ضیاء الدین احمد خاں سے برادرانہ اور دوستانہ تعلق رکھتے تھے اور رکھنا چاہتے
تھے اور دوسری طرف نوّاب احمد بخش خاں سے اس قدر شدید اختلاف تھا کہ
ان کی وفات کے بعد وہ ان کو " غاصبِ قوی " کہہ کر یاد کر رہے ہیں۔ انھیں
یہ یقین ہے کہ وہ یہ مقدمہ ضرور جیتیں گے کہ وہ حق پر ہیں۔

مسٹر اِنڈرو اسٹرلنگ سے غالبؔ کی مُلاقات کا ذِکر اس سے پہلے آ چکا ہے ایک
اور خط میں جو کلکتہ میں ان کے ابتدائی زمانۂ قیام سے تعلق رکھتا ہے اس
شہرِ نو آئین کی تعریف آئی ہے۔

"یہ اللہ پاک کی رحمتوں کے عجیب آثار میں سے ہے کہ آب و ہوائے
کلکتہ مجھے پوری طرح راس آ گئی ہے اور میں اس بُقعۂ زمین میں اس
سے زیادہ آرام و راحت سے ہوں جتنا کہ اپنے وطن میں تھا۔"

بر چید یبوست از دِماغم یکسر
بنگالہ عجب آب و ہوائے دارد

میرے دماغ سے اس نے "یبوست" کے اثرات یکسر ختم کر دیئے بنگال کی آب و ہوا

لہ / ٢ہ اوراق معانی : ۷۷۔

بھی عجیب تاثیر رکھتی ہے۔

ایک دوسرے خط میں غالب نے کلکتہ کی آب و ہوا کی خوش گواریوں کے ساتھ اپنی تدبیر علاج کا بھی ذکر کیا ہے۔

"گرمی کی شدت کے ایام میں ناریل کا تازہ پانی قند و نبات کے اضافے کے ساتھ' میری صحت کے لیے بہت سود مند ثابت ہوا لیکن اب کہ برسات کا موسم ہے' میں نے اُسے ترک کر دیا ہے۔

مختصر یہ کہ مجھے عوارض جسمانی کی اب بالکل شکایت نہیں بلکہ اس شہر میں دہلی کی بہ نسبت مجھے زیادہ راحت و آسودگی میسّر ہے۔

اس کے بعد اندرو اسٹرلنگ اور مسٹر فریزر سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ وہ پورا منظر نامہ اس تحریر میں ایک متحرک تصویر بن کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

". . . . میں مسٹر فریزر صاحب سے ملنے گیا شائستہ طریقہ پر ملاقات ہوئی چند قدم آگے بڑھ کر استقبال کیا اور مشایعت کے ساتھ معانقہ کی رسم عمل میں آئی۔ عطر و پان سے تواضع کی۔ اس خوش صفات افسر کی دید سے میں بہت شگفتہ خاطر ہوا۔ اور اس ملاقات نے مجھے تازہ دم اور توانا دل کر دیا۔

یہاں ایک دوسرے افسر مسٹر اندرو اسٹرلنگ ہیں جو ایک بہت ہی صائب الرائے اور صاحب دانش و فرہنگ انسان ہیں۔ یہ اس نظام کی "قوس صعودی کا نقطۂ آغاز اور قوس نزولی میں نشانِ آخر ہیں چونکہ یہ افسر ایک صاحب علم و آگہی شخص ہے میں نے اس کی شان میں پچاس اور پانچ پچپن بیت کا ایک قصیدہ لکھا ہے اور قصیدہ کے آخر میں اپنا حال بھی درج کیا ہے۔[1]

---

[1] اوراق معانی: ۷۹۔

غالب کی زندگی میں یہ بات ایک طرفہ اتفاق کا درجہ رکھتی ہے کہ انھیں کلکتہ کے سفر کا موقع ملا۔ اس کی دشواریاں اور مشکلات اپنی جگہ جس میں اخراجات ایک خاص کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انھیں دوسروں کا احسان لینے میں تو کوئی تکلّف نہیں تھا مگر اس موقع پر قرض کی بھاری رقومات کے باعث زیادہ گراں بار ہوئے' ابتدائی سطح پر انھیں کامیابی کی جو صورت نظر آئی' وہ اس سے بھی خوش وقت نظر آئے اور اس خاص معاملے میں انھوں نے خود کو خوش بخت تصوّر کیا کہ وہ اس بات سے خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں ان کی یہ عرض داشت مسترد نہ ہو جائے۔ ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے والے انگریز افسروں نے بھی یہی بتلایا کہ ان کا مرافعہ لائقِ سماعت ہے۔ غالب نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اس دادگاہ میں درخواست گزاری اور عرضیوں کو قبول کرنے کا طور طریق کیا رہتا ہے۔

"بہر حال یہ خطرناک مرحلہ جہاں لغزشِ پا کا بے حد خطرہ تھا جو طے ہوا اور میری عرضی پیش ہو گئی۔ وقتِ رخصت عطر و پاندان طلب کیا گیا اور صاحبِ موصوف نے اپنے دستِ خاص سے مجھے عطر و پان عطا کیا اور کرسی سے تمام قد ایستادہ ہو کر میرے سلام نیاز کو قبول فرمایا۔

د اب میں نیرنگیِ تقدیر کا تماشائی ہوں کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ ایسی کوئی صورت پیش آسکتی ہے بلکہ اس طرح کی کار برآری کو میں "احیائے اموات" میں گنتا تھا، اس کا اس طور پر پیش آنا ایزد توانا کی خاص بخشائشوں میں سے ہے جس نے میرے مغزِ جاں کو مسرّتوں کی خوشبو سے معطر کر دیا۔

ملاقات کے دوران میری عرضی جسے نواب گورنر جنرل کی نظر گاہ میں پیش ہونا ہے' اس کا معاملہ بھی درمیان میں آیا۔ یہاں کے دستور کے مطابق وہ درخواست مسٹر پاٹن کے سپرد ہوئی' آن کا عہدہ ہی ایسی درخواستوں کی

پذیرائی سے متعلق ـــــ وہ دادخواہوں کی درخواستوں کا زبان فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کرکے انھیں فریزر صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

فریزر صاحب، اصل و نقل کا مقابلہ کرکے اسے "نظمائے کاؤنسل" کی خدمت میں روانہ کرتے ہیں ـــــ دوشنبہ کے دن میں فریزر صاحب سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔ موصوف نے ادائے تعظیم اور پرسشِ مزاج کے بعد اس سے قبل کہ میں اپنی عرض داشت کا ذکر زبان پر لاؤں (انھوں نے) بزبان انگریزی لکھا ہوا ایک پرزۂ کاغذ مجھے دکھلایا اور کہا یہ تمہاری عرضی ہے۔ اس کے مقابلہ سے ہم نے ابھی فراغت پائی ہے، اب یہ صاحبان کاؤنسل کی عرض گاہ میں پہنچے گی۔ لے

غالب کے وَرودِ کلکتہ کے ابتدائی دور ہی میں مرزا افضل بیگ وکیل بادشاہِ دہلی بن کر، کلکتہ وارد ہوئے۔ غالب سے بھی ملاقات ہوئی یہ صاحب خواجہ حاجی کے برادر نسبتی تھے اور حرفوں کے بنے ہوئے تھے۔ مرزا غالب کو خواجہ حاجی کی شخصیت سے یہ کہیے کہ بَیر تھا۔ اپنے خاندانی وظیفہ کی رقم میں نوّاب احمد بخش کی طرف سے ان کی شمولیت غالبؔ کو بہت ناگوار تھی۔ اس نفسیاتی ماحول کے زیر اثر مرزا افضل بیگ اور غالب کے درمیان دھوپ چھاؤں جیسے اس تعلق پر غالب نے ایک سے زیادہ خطوط میں روشنی ڈالی ہے۔

کبھی وہ ان کے انحراف واکرام پر انھیں مبارک باد دیتے ہیں اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں اور کبھی ان کی قصہ پردازی اور غلط باتیں مشہور کرتے اور مقام تک پہنچانے سے پریشان ہوکر ان کے خلاف شکوہ سنج بھی ہوتے ہیں۔

گھر کے لوگوں سے بھی ان کی خط وکتابت ہے کہ وہ ان کے حالات سے باخبر رہنا چاہتے تھے
ان کی اس باخبری اور احساس ذمہ داری کا اندازہ چراغ دیر میں
آمدہ اشعار سے بھی ہوتا ہے اور کلکتہ میں موصول ہونے والے مرزا یوسف
کے خط پران کے اظہار مسرت اور وفور شادمانی سے بھی۔
غالب اگرچہ ایک آزاد طبیعت آدمی تھے کئی بار ہم انھیں اپنے خطوط میں اس خواہش
کا اظہار کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ میں آزاد زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔
پھر بھی انھیں اپنے بعض عزیزوں اور اہل خانہ کا بہت خیال رہتا تھا اپنے بھائی
مرزا یوسف کی بیماری اور دیوانگی کے ہنگامہ کی وجہ سے وہ بہت پریشان رہتے تھے۔
اس پر مولانا محمد علی کو لکھے جانے والے اس خط سے بطور خاص روشنی پڑتی ہے۔

"اسی اثنا میں مجھے دہلی سے ایک ملفوف ملا یہ فی التحقیقت نگارستان مطالب (میں سے) ہے اس نکتہ کی وضاحت اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میرزا یوسف میرا چھوٹا بھائی جو ہمہ وقت دیوانگی و آشفتہ سری کے عالم میں رہتا تھا[۲] اہل عرب کی طرح عریاں رہنا اور برہنہ گشت کرنا جس کی عادات میں شامل تھا۔ اضطراب و اضطرار ہر ساعت بلکہ ہر لمحہ اس کی زندگی میں دیکھنے کو ملتا تھا۔ وہ اپنی اس آشفتہ مزاجی کی بدولت نہ ماں کو ماں کہتا تھا نہ بہن کو بہن سمجھتا تھا۔

مجھے رمضان کی ۲۷ تاریخ کو دہلی سے (بذریعہ ڈاک) آنے والا ایک لفافہ ملا۔ جب میں نے اس کے سرنامہ کو کھولا فوراً ہی میری نظر ایک پرزہ کاغذ پر پڑی جو میرے بھائی یوسف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، میں نے تحریر کو بغور پڑھا مجھے یقین ہوگیا کہ یہ نگارش میرے بھائی کے اپنے قلم سے ہے۔
القاب و آداب کا سلسلہ بھی ہوش مندی کے ضابطہ کے مطابق تھا میں مارے خوشی کے اچھل پڑا اور رقص کرنے لگا اور مجھ پر ایک گریۂ بے اختیار

---

۱ اوراق معانی: ۱۲۸

طاری ہوگیا اور میں زار و قطار رونے لگا۔ جب اس عالم بے اختیاری سے باہر آیا اور میں نے اپنے ہوش و حواس کو جمع کیا تو خطِ خانگی کو پڑھنے پر توجہ دی
تمہارے بعد جیسا کہ ہم سب ڈر رہے تھے میرزا یوسف کی شورش و دیوانگی میں اور اضافہ ہوگیا۔ ہر وقت شور و فریاد زدوکوب کا سلسلۂ پراگندگی حواس و شوریدہ سری بڑھتی گئی۔

حضرت والا کے قبلہ لوں میں سے ایک جادو ٹونے کا علاج کرنے والی ملتا ان کے علاج کی سعی کی۔ کسی ذریعہ سے ایک خادمۂ محل بہم پہنچی اور چارہ گری کی طرف متوجہ ہوئی اس نے میرزا یوسف کے آثار جنوں کو سر زدگی کا نتیجہ قرار دیا اور بعض جادو بھری باتوں کی سُراغ رسی کی۔

چنانچہ شہر پناہ سے باہر ایک درخت کی جڑوں میں کھُدائی کرنے اور وہاں ایک کنویں کے برآمد ہونے کی طرف اشارہ کیا جب ہم نے وہاں کھدائی کی تو جو اس نے کہا تھا وہی نکلا۔

غرض مرزا یوسف کو دو طرفہ کوشش سے افاقہ ہوا، اس علاج میں پانچ ماہ لگے۔ تا اینکہ کپڑے پہننا، ستر عورت کرنا، پیشاب پیخانے کی احتیاط رکھنا، دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھانا، اور بیٹی بیوی اور ماں کو، دختر، زن اور مادر سمجھنا اب پھر اس کی انسانی عادات میں داخل ہوگیا۔

یہ باتیں گھر سے آنے والے مکتوب سے بھی معلوم ہوئیں اور میرزا یوسف کا اپنا خط بھی اس کی ہوش مندی کی طرف اشارہ سنج تھا — میں اپنے چھوٹے بھائی کی اس صحت یابی اور افاقہ کی صورت کو اپنے مردہ باپ کے دوبارہ زندہ ہوجانے سے زیادہ خوش آئند بات سمجھتا ہوں۔

امید کہ جناب والا بھی اس فقیر کی اطلاع دہی پر اُسے اپنا فرزند تصور فرمائیں گے اور میرے بھائی کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔[1]

[1] اوراق معانی : ۱۳۲

مرزا نے کلکتہ کے زمانۂ قیام میں رائے چھجمل کو جو خطوط لکھے، ان کے مطالعہ سے اُن ذہنی کوائف کا اندازہ ہوتا ہے جن سے ان ایام میں وہ برابر گزرتے رہے، غالب نے نواب فخرالدولہ احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد جاگیر فیروز پور جھرکہ اور لوہارد کے واقعات پر گہری نظر رکھی کہ غالب کی خود اپنی پنشن کے مسائل کا تعلق بھی اسی جاگیر سے تھا ایک خط میں بڑی تاکید سے رائے صاحب کو لکھا ہے۔

"آپ سے یہ التماس ہے کہ تھوڑی سی زحمت برداشت کریں۔ کچھ بھی وقت ضائع نہ فرمائیں اور فخرالدولہ بہادر کی سرکار کے حالات۔ جو ان کے سانحہ وفات کے بعد وقوع پزیر ہوئے ہوں، وہ مجھے لکھ بھیجیں اور تحریرِ حالات میں حشو و زوائد سے بھی صرفِ نظر نہ کریں۔ جو کچھ معلوم ہو اور جو ہنوز معلوم نہ ہوا ہو، اُسے معلوم کرنے کی سعی کریں۔" [1]

چونکہ غالب کے مُقدمے کی پیش کش کا رُخ کلکتہ سے دہلی کی طرف مڑ گیا ہے اس لیے اب وہ کچھ زیادہ ہی ذہنی اضطراب اور فکر و پریشانی کا شکار نظر آتے ہیں۔ زیرِ نظر خط میں انھوں نے دہلی ریذیڈنسی کے حال و احوال کے بارے میں بھی جاننا چاہا ہے اور خود کو شدت سے اس کا متمنی ظاہر کیا ہے:-

"ریزیڈینسی کے دربار کا حال جدید و قدیم اہل کاروں کے نام اور مسند نشینِ میوات کے ساتھ نئے حاکم کے تعلقات کی نوعیت پر بھی روشنی ڈالیں کہ میں ان حالات کو جاننا اور ان پر نظر رکھنا چاہتا ہوں، یہ خیال نہ فرمایئے کہ میں جناب سے

---

[1] اوراقِ معانی: ص ۶۹

کوئی قصہ کہانی سننا چاہتا ہوں، مقصد کچھ اور رہے اور اس میں جو نکتہ پیش نظر ہے اس کے باب میں استفسار ضروری ہے۔"[1]

یہ دہلی ریزیڈنسی میں مقدمۂ پنشن کی پیشی اور اس ضمن میں ضروری کارروائی کے ابتدائی مراحل ہیں، غالب کلکتہ میں فروکش ہیں اور مقدمے کی داد فریاد کا مسئلہ دہلی سے وابستہ ہو گیا ہے اتنی دور بیٹھ کر وہ اپنے وکیل اور اپنے کسی مخلص دوست سے ہی مدد لے سکتے ہیں، رائے چھجمل ان کے ایسے ہی مخلص دوستوں میں ہیں جن سے وہ مشورے، مدد اور تعاون کے طلب گار ہیں۔ اسی وجہ سے رائے صاحب کی جانب سے اگر انھیں ذرا بھی کم توجہی یا تغافل برتنے کا گمان گذرتا ہے تو اس کا شکوہ ان کے لبوں پر آجاتا ہے:۔

"آپ جب ابتدار کار ہی میں خط کے جواب میں یہ طرز تغافل روا رکھتے ہیں تو بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے، یا پھر آپ ہی فرمائیں —— دوستی و مہربانی کی تمام توقعات دل سے محو کر کے جو کام در پیش ہیں، ان کے واسطے کوئی دوسرا شخص تلاش کیا جائے اور اِن امور کی کار برآری کو اس کے سپرد کیا جائے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ بے خودی چھوڑ یے اور بے کسوں کی دلجوئی کیجیے۔"[2]

غالب ایک رِند مَشرب، آزاد خیال اور بہ ظاہر بے فکر آدمی ہیں، وہ زندگی کی مکروہات سے دور رہنا چاہتے ہیں، ادبی موضوعات پر فکر فرمائی کے لیے وقت نکالتے رہتے ہیں۔ آئمہ آل اطہار کے لیے جو قصائد انھوں نے لکھے ہیں،

---

[1] اوراق معانی: ص ۶۹۔

[2] اوراق معانی: ص ۶۸۔

ان کے مطالعہ اور مشاہدہ سے بھی قیامِ کلکتہ کے دوران ان کے ذہنی کوائف کی سیر ممکن ہے۔ ان کے اس دور کی نفسیات کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے ان میں سے بعض قصائد میں جگہ جگہ ناسا عدتِ زمانہ کی شکایت اور حالات کی ناسازگاریوں کا شکوہ کیا ہے۔ اور قیامِ کلکتہ کے تاثرات اور غیر اطمینان بخش صورت حال پر روشنی ڈالی ہے اسی زمانے کے ایک خط میں ان کی زبان قلم پر یہ فقرے بھی آتے ہیں:۔

"دانشوروں کا کام تو آبادیوں سے دور دامنِ کوہ میں خلوت نشینی اختیار کرنا اور رشش جہت۔ سے اہلِ دنیا پر اپنے دروازے بند کرنا ہے، جسم کو ریاضت سے گھٹانا اور جان کو عقل و دانائی سے فروغ بخشنا ہے۔ جو شخص صاحبِ عقل و حکمت ہو، اس کا کام تو یہ ہونا چاہیئے کہ وہ بے برگ و نوا ہوتے ہوئے بھی گوناگوں حسرتوں کے شکنجے سے باہر آکر شادمانی و سرخوشی کی راہ پر گامزن ہو جائے، ایسا کوئی شخص وہی ہو سکتا ہے کہ فطرتاً آزادہ رو ہو۔"[1]

بہر نوع جب دہلی میں وکیل مقرر ہو گیا اور اس طرف سے انھیں ایک گونہ اطمینان ہوا۔ تو انھوں نے مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کو لکھا:۔

"میں نے اپنے وطن کے احباب میں سے ایک دوست کے پاس خط بھیجا اور ان سے اعانت چاہی۔ انھوں نے بے کس نوازی کی اور وہ خود کارفرما بن گئے۔ میری طرف سے وکیل مقرر کیا اور مجھے لکھا، میں نے وکالت نامہ لکھ کر وکیل کے نام بھیج دیا ہے اور اس سلسلے کے جو کاغذ بھیجنے تھے ان کو اس وکالت نامے کا حصہ بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ اپنے ان دوست کے نام ایک خط بھی اس میں ملفوف کر کے دہلی روانہ کر دیا ہے۔ یہ دوست مجھ پر مجھ سے بھی زیادہ مہربان

---

[1] وراقِ معانی، ص ۷۰۔

ہیں اور میرے کام کو اپنے کام سے بڑھ کر سمجھتے ہیں"۔[1]

اسی زمانے میں ایک خط انھوں نے منشی التفات حسین کو بھی لکھا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ دہلی ریزیڈینسی کے ساتھ اپنے تعلّق کو غالب کے لیے سعی و سفارش کی وجہ قرار دیں جس سے اُن کی مُشکلات کے حل کی کوئی صورت نکلے۔ اس میں میرامام علی کا ذکر بھی آیا ہے۔ جو اس سے پیشتر بھی غالب کے مکتوبات میں آچکا ہے:۔

"میرامام علی جو اس ملفوف کے ساتھ خدمتِ والا میں پہنچ رہے ہیں' اس بات پر مامُور کیے گئے ہیں کہ اگر منشی صاحب ارشاد فرمائیں تو حاکمِ شہر کے نام ارسال کیے گئے عرض نامہ کو وہ ملازمانِ والا کے سپرد کر دیں اور اگر یہ طریقہ کچہری کے دستور کے مطابق نہ ہو تو میرامام علی سے کہہ دیا جائے کہ وہ کل دوپہر کے وقت "دار الانشا" میں پہنچ کر جمع دار کے وسیلے سے یہ عریضہ حاکمِ مذکور تک پہنچا دیں۔[2]

اور اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا:۔

"میری نجات کی کوئی صُورت خدّامِ عالی کی چارہ سازی و غمخواری پر موقوف ہے"۔[3]

دہلی میں غالب کے اپنے ہم نواؤں اور ہمدرد دوستوں کا کچھ وقت ہی کے لیے سہی اُن کے اپنے نقطۂ نظر سے فقدان تھا اور نواب شمس الدین احمد خاں رئیس فیروز پور جھرکہ و لوہارو خود بھی صاحب حیثیت شخص تھے اور انگریز حکّام سے بھی ان کے تعلقات ایک وقت میں بہت شگفتہ اور ہموار تھے۔

---

[1] اوراق معانی: ص ۷۳۔

[2] اوراق معانی: ص ۹۱۔

[3] " " " ص ۹۱۔

اس زمانے میں ان کے متعدد خطوط سے اس صورت حال پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک خط میں وہ اپنے "ہجومِ افکار" کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں کہ ریزیڈنسی اور اس کی کار پردازی کی حالت پوری طرح سے سامنے آجاتی ہے۔

"نواب گورنر جنرل بہادر اور اعیان کونسل کے رایاتِ عالیات کا عزم سفرِ ہندوستان، "سروسامان" کے قحط کے باعث ضمیمۂ تدبیر کا پیرامونِ خاطر سے گذرنا۔ اور طمع خام کا دل میں آنا۔ متواتر عرض داشتوں میں اپنے حال و خیال کو پیش کرنے کی سعی و کاوش، کسی شعاعِ امید کے چمک اٹھنے کی تمنا، کہ مجھے صورت حالات کا علم ہو سکے۔ ـــــ" [1]

دہلی سے آنے والے مکتوب یا اطلاع نامہ کا انتظار اپنی پُر افشانیوں اور پریشانیوں کے ساتھ ان کے کئی خطوں میں سامنے آتا ہے، اس سلسلہ کی کچھ تفصیلات یا جزئیات کو ان سطور میں دیکھا جا سکتا ہے۔

"آج کہ پنج شنبہ کا دن ہے اور رمضان المبارک کی تیرہ تاریخ ابھی ابھی میرے وطن کے پا "شکستگان" کی طرف سے خط آیا ہے۔ . . .

. . . جس سے اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ اس دادگاہ میں میرے مقدمہ کے کاغذات پیش ہو گئے اور وہاں کی عدالت کے صدر نشین نے اپنے افسروں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ وہ ان کاغذاتِ مقدمہ سے متعلق ضروری کارروائی کریں۔

مجھے امید ہے کہ جلد ہی میرے وکیل یا مردمانِ کچہری میں سے کسی کی طرف سے مجھے ضروری اطلاع نامہ مل جائے گا اور آئینہ کی طرح سراپائے مُدّعا نظر کے سامنے آجائے گا۔"

ریزیڈینٹ دہلی اپنا بہت سا وقت سیر و شکار میں صرف کرتے ہیں۔ غالبؔ ان کے اس رویّہ کی طرف سے بھی پریشان خاطری کا شکار ہیں

---

[1] تفتس نیم رخ : ۱۲۱۔

"اب انہیں یہ اطلاع بھی دی گئی کہ ریذیڈنٹ صاحب بہادر دہلی، دوم شعبان کو شہر میں واپس آچکے ہیں اور پنجم ماہ مذکور کو ان کی عرضداشت ریذیڈنٹ کی بارگاہ میں پہنچ گئی۔"[1]

اسی خط میں وہ مولوی محمد علی سے یہ خواہش کرتے ہیں کہ وہ از راہ کرم منشی محمد حسن کو خط لکھیں کہ وہ صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔ کہ ان کا اپنا وکیل بہت سُست قلم واقع ہوا ہے۔

غرض کہ یہ حالت مُنتظِرہ ختم ہوئی۔ مولوی محمد علی خاں کے نام اپنے ایک خط میں وہ اس اطلاع کے آنے پر اظہار اطمینان کرتے ہیں۔ جس کا وہ اپنے وکیل کی طرف سے انتظار کر رہے تھے۔

"بتاریخ ۲۸، ماہ شوال روز یک شنبہ میرے وکیل کا مکتوب دہلی پہنچا اس میں صاحب ریذیڈنٹ کا نوازش نامہ بھی ہم نورد ہے۔ جو سرکاری مُہر سے مزین ہے اور مجھ احقر کے نام ملفوف بھی۔ اس میں ہزار گونہ تمنائیں، لفظ و معانی کے سلسلوں کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی ہیں . . . . اس عبارت کو اس جا ہو بہو نقل کرتا ہوں۔"

خاں صاحب مہربان سلامت بعد شوق ملاقات واضح ہو کہ آپ کا مہربانی نامہ جو خصوصی مطالبات کے سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے' دوسرے کاغذات کے ساتھ پنڈت ہیرالال کے ذریعہ موصول ہوا، اور اس کے مندرجات سے آگاہی نصیب ہوئی۔ میرے مہربان۔

اس مقدمہ کے باب میں رپورٹ اہالیان کونسل کے حضور میں بھیج دی گئی' جب وہاں موصول ہو جائے گی تو اس کے جواب سے متعلق جناب والا کو مطلع کر دیا جائے گا۔ ۱۷ اپریل ۱۸۲۸ء۔

---

[1] نقش نیم رُخ: ۱۲۳۔

اس سرکاری خط کے وصول ہونے پر مرزا اس افسر بالا یا حاکم اعلیٰ سے ملنے گئے جن سے وہ صحیح فیصلہ دہی، حقیقت رسی اور حق شناسی کی اُمید رکھتے تھے۔

مولوی محمد علی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"دلِ پُرآرزو کے ساتھ دفتر خانہ پہنچا اہلِ دربار کی مجلس برخاست ہونے کے بعد چونکہ خداوندِ بارگاہ اپنے نشیمن خاص کی طرف چلے گئے تو میں نے باریابی کی اجازت چاہی اور حاضر خدمت ہوا۔

ریزیڈنٹ بہادر کا خط ان کی بارگاہ میں پیش کیا اس کو دیکھا اور اس سے پیشتر کہ میں کچھ پوچھوں، فرمایا کہ ہاں کول برک صاحب نے تمہارے مقدمے کے بارے میں صدر دفتر کو اطلاع بھیجی تھی، یہاں سے اُس کا جواب باصواب دے دیا گیا۔

انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ریزیڈینٹ صاحب تمہاری طرف نظرِ عنایت رکھتے ہیں اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ وہ جلد ہی تمہارے دعووں کے بارہ میں تفتیش و تحقیق عمل میں لاکر صدر میں رپورٹ بھیجیں، بات اس پر ختم ہوگئی۔"[1]

اس زمانۂ زندگی میں قیامِ کلکتہ کے دوران غالبؔ کا زیادہ وقت اپنے اِس مقدمہ کے خیالات یا سوالات میں گذرتا تھا یا پھر مکتوب نگاری کے مشغلہ میں جس کے لیے انھوں نے لکھا ہے۔

"کل کہ سہ شنبہ کا دن اور ماہِ شوال کی ۳۰ تاریخ تھی صبح سے دوپہر تک میں نے اپنے وکیل کے خط کا جواب لکھا۔ اپنے وطن میں رہنے والے عزیزوں کو یادنامے تحریر کیے نامۂ حاکم کے جواب میں اپنی عرض داشت مرتب کی اور بعض پُرسان حال کو خطوط لکھتا رہا اسی کے ساتھ صاحب ریزیڈینٹ کے میر منشی کو ادائے شکر کے طور پر نگارش نامہ سپرد قلم کیا اور آخر کو یہ سب بہ سبیل ڈاک روانہ کر دیا۔"[2]

---

[1] [2] نقش نیم رُخ : ۱۲۰۔

کافی دنوں تک پریشانی خاطر اور اندیشہ ہائے دور و دراز میں گھرے رہنے کے بعد غالب کو کچھ صرف زر اور کچھ سعی و سفارش کے وسیلہ سے حاکم دہلی کی رپورٹ اور جو اس پر بطور ضمیمہ مندرج تھا اس کی نقلیں مل گئیں۔ انہیں اپنی عرض داشت کے ساتھ ہم نورد کرکے برائے ملاحظہ غالب نے مولوی محمد علی خاں کی نظر گاہ میں باندا روانہ کر دیا ___ اسی کے ساتھ اکبر آباد سے آنے والی جو ہنڈی انھیں ملی اس کا مولوی صاحب کے نام اپنے خط میں بطور خاص ذکر کیا۔

"ہفتہ عشرہ کے اندر کی بات ہے کہ اکبرآبادی ہنڈی پہنچی۔ جب میں نے اس کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ چار سو ستّر اور پانچ پچھتر روپے کی ہے۔ اس کی رقومات کو میں نے وصول کر لیا اور اس سے متعلق جواب اکبر آباد ارسال کر دیا۔" [1]

اب مرزا کو اپنے ماہانہ مصارف کے بارہ میں ایک گونہ اطمینان ہوا تو انھوں نے اسی خط میں مولوی صاحب سے یہ خواہش بھی کی کہ اب قرض کی مزید رقم کے سلسلے میں رئیس باندا نواب ذوالفقارالدولہ کو زحمت نہ دی جائے، جس کے لیے وہ اس سے پہلے کافی پریشان تھے۔

"ہنوز ملازمانِ والا کی طرف سے جو عطا فرمایا گیا ہے، اس کا بھی کچھ حصہ باقی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرے معاملہ میں ارکانِ کاؤنسل کی روانگی سے پیشتر کوئی کارروائی عمل میں آجائے گی۔ خداوند نعمت میری طرف سے خاطرِ عاطر کو قرینِ جمعیت رکھیں اب وہ اضطراری حالت نہیں کہ میں خواہ مخواہ تقاضہ سنج ہوں یا نواب کے سامنے اپنی اس ضرورت کے باعث دریوزہ گری کی خاطر ہاتھ پھیلاؤں۔" [2]

اسی زمانے سے تعلق رکھنے والی ایک اور ہنڈوی کے آنے کا ذکر ہے جسے غالب نے "شاہ جوگ" کا نام دیا ہے لکھتے ہیں۔

---

[1] [2] نقشِ نیم رُخ : ۱۰۸ ، ۱۰۷۔

"دو قطعۂ زرِ ہنڈوی "شاہ جوگ" کی تفتیش کے بعد موصول و ہمدست ہوئے۔ میں نے ان کو مخدومی مولوی ولایت حسن خاں کے سپرد کر دیا . . . . چالیس روز کی وجہ متی مجرا لیے جانے کے بعد دو سو روپے اپنے قبضہ اور تصرّف میں لایا۔"

اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کلکتہ کے زمانۂ قیام میں مرزا غالب کو اپنے خرچ اخراجات کے سلسلہ میں کس صورت حال سے واسطہ رہا۔ انھوں نے جس اُمید پر یہ سفر دور و دراز اختیار کیا تھا، وہ پوری نہ ہوئی ابتداءً جو صورت رہی' مسائل و معاملات کو انھوں نے جس روشنی میں لیا اور حکام بالا کے وقتی رویّہ نے انھیں خوش فہمی میں مبتلا کر دیا' بالآخر وہ بھی اپنی سیمیا کی سی نمود کے بعد غائب ہو گئی۔ مقدمہ کی کارروائی دہلی ریزیڈینسی کو لوٹا دی گئی۔

دہلی میں مُقدمہ کی پیشی کے بعد وہ یہ توقع کرتے ..... رہے کہ گورنر جنرل کے قلم اور حکم سے وہ اپنے حق میں کوئی فیصلہ کرالیں گے مگر ایسا بھی نہ ہو سکا۔

مولوی محمد علی کی طرف سے ان کے طلب نامہ کے جواب میں جو رقم اس جزو زمان میں بھیجی گئی اور مولوی ولایت حسن کی معرفت انہیں جو رقم ملی اس کا تذکرہ بھی ان کے ایک مکتوب میں اس طرح آیا ہے' اپنے مقدمہ اور اس کی پیش رفت، یا گورنر جنرل کی داد گاہ سے اس کے فیصلہ کی کوشش و خواہش میں اُن کا ذہن اس زمانے میں برابر الجھا رہا۔

"کچھ باتیں دل پر برابر اپنا پرتو ڈالتی رہتی ہیں ۔۔ فصل برشگال میں جبکہ بنگال کی ندیاں چڑھاؤ پر ہوتی ہیں گورنر جنرل بہادر تمام افراد کونسل اور عملہ کے جملہ اشخاص کے ساتھ ہندوستان (دہلی) کی طرف رُخ کریں گے اور تین سال تک میرٹھ، کہ جوار دہلی میں ایک شہر ہے، گورنر کی فرودگاہ اور ملک کا دوسرا دار السلطنت بنا رہے گا۔"

"اس مرکزی عملہ کے جلو میں' وہ لوگ بھی جو اپنے مقدمات اور داد خواہی

کے سلسلہ میں یہاں مقیم ہیں، اس قافلہ کے ہم قدم ہو کر سفر کرنے پر مجبور ہوں گے مجھ میں نہ تو قیام کی سکت ہے، نہ سفر کی ہمت، سفر کے ساتھ زادِ سفر بھی تو چاہیے وہ کہاں سے آئے۔"

"کاش مقدمہ میں کامیابی کی کوئی صورت سامنے آتی کہ میں بامیدِ واپسی، سرکار سے قرض لے لیتا یا پھر حضرت قبلہ گاہی، اجارہ داری کے باب میں پیچ و تاب میں مبتلا نہ ہوتے تو میرے کام میں روشنی اور رونق آجاتی اور اس سے متعلق میری فکرمندیوں کے لیے کوئی گنجایش نہ رہتی۔ اب نہ یہ ہے نہ وہ، میرے دل کے خون ہونے میری آنکھوں کے لہو رونے اور میرے دامن و آستین کو ترک کرنے کے سوا اور کیا باقی رہا۔"

کاش نواب ذوالفقار الدولہ کو یہ توفیق ہوتی کہ مجھے اپنے "امین کدہ" سے ایک ہزار روپیہ اور دلوا دیتے۔ میرے دل میں یہ بات آرہی ہے کہ میں نواب والا جناب کی خدمت میں، حضور والا کی معرفت ایک درخواست روانہ کروں، اور اس میں اس تمام صورت حال کو پیش کروں۔"[1]

مرزا غالب کے لیے پریشانی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس "قیامت" کی آمد میں ابھی چار ماہ باقی تھے اور ماہِ رمضان سر پر آگیا تھا۔۔۔ چار ماہ کے خرچ اخراجات کا مسئلہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا نظر آتا تھا اور ہم دست وسایل جواب دے رہے تھے۔

"اگر لارڈ صاحب سے ماہ شعبان میں ملاقات نہ ہوتی تو رمضان کا مہینہ خوشی خوشی گذر جاتا۔ لیکن رمضان میں کام آنے والا یہ روپیہ صاحب سکتر بہادر اور نواب گورنر جنرل کے دفتر کے عملہ اور کار پردازوں کے انعام و اکرام میں ختم ہو گیا۔"

غالب کے اپنے الفاظ میں۔ "ہر چند میں نے کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی سے کام نہ لیا لیکن سرمایہ کی قلّت کی وجہ سے یہ تمام "ہنرمندیاں" بھی بیکار گئیں۔

[1] نقشِ نیم رخ: ۱۲۸۔

"قبلہ وکعبہ کے خدّام کی احسان فرمائیوں کے ذکرِ خیر نے میرے دل وجان پر مہربانیوں کی بارش کی . . . . میں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے باعث مجھے نئی آبرو ملی اور شوکتِ تازہ میسّر آئی۔ حق یہ ہے کہ اس دشت نوردی میں جو میری آوارہ خرامیوں کا حصہ ہے اگر میں آپ تک نہ پہنچتا تو میری خستگی اور دل شکستگی کو مرہم و مومیائی کیسے نصیب ہوتی۔"

یہ اشارہ مولوی کرم علی سے متعلق ہونا چاہیے، جن کی کرم فرمائیوں کا تذکرہ اسی خط میں بایں الفاظ غالب کی زبان پر آیا ہے۔

"اگر میں انصاف کے سررشتے کو اپنے ہاتھ سے نہ دوں تو مولوی کرم علی کی شکر گذاری اور احسان شناسی کے عہدہ سے میں کیسے باہر آسکتا ہوں انھوں نے اس آستانے کی خاک تک میری رہنمائی کی۔ اور آپ کے درِ دولت تک رسائی میں میرے خضرِ راہ بن گئے۔"[1]

غالب کے اس دورِ زندگی میں اگر نواب صاحب اُن پر مہربان نہ ہوتے جن سے مرزا کا تعارف مولوی محمد علی ہی نے کرایا تھا اور خود مولوی محمد علی خاں کی موقع بہ موقع دستگیری وسرپرستی انہیں نصیب نہ ہوتی تو اس سفر کے دوران ان کی دشواریاں ناقابل برداشت ہوجاتیں۔

وہ کلکتہ کے حالات اور بالخصوص مقدمہ کے معاملات کے بارہ میں برابر مولوی صاحب کو لکھتے رہتے تھے۔ اس سے ایک گونہ تسکین اور طمانیتِ خاطر کا احساس ہوتا تھا۔

اگر مولوی صاحب کی یاد فرمائی اور نامۂ عنایت کے ورود میں تاخیر ہوجاتی تو مرزا پریشان ہوجاتے اور ان کی طبیعت کی بے اطمینانی بڑھ جاتی (ایک خط میں لکھتے ہیں۔)

---

[1] نقش نیم رُخ: ۱۱۷۔

"قبلہ گاہ اور ہم بےکسوں کے جائے پناہ۔
حضرت والا دو مہینے اور اس پر دو دن اور بیت گئے کہ والانامے کے سواد سے چشم منتظر نے نور نہیں پایا۔ شاید کوئی خط نظر کیمیا اثر سے نہیں گذرا۔ کاش میں اس کا گمان اُن مخدوم کے طرز تغافل پر رکھ سکتا تو طرح طرح کے اوہام کی یورش اور وسوسوں کی یلغار سے طبیعت تسکین پاتی" (خط بنام مولوی محمد علی خاں)
نواب صاحب سے تو ان کی عقیدت وارادت کا رشتہ کچھ اور بھی زیادہ دل کی گہرائیوں میں اُترتا ہوا نظر آتا ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ان سوانح و وقایع کا تذکرہ جو عنصر سخن کی سیرابی و شادابی میں کام آسکتا ہے، وہ میرے محسن حقیقی و کعبۂ تحقیقی نواب سید علی اکبر خاں مدظلہٗ العالی کے اخلاق عالیہ اور اوصاف حمیدہ کا ذکر جمیل ہے۔"

"قسم بہ خدا و سوگند بہ ایزد دانا جس نے عقل کو پیدا کیا اور علم کو برگزیدگی بخشی کہ اس گراں مایگی و بلند نگاہی کے ساتھ میں نے کلکتہ میں دوسرا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ جب میں اس ستودہ صفات کی خوبیوں کے بارہ میں سوچتا ہوں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ یہ گوہر گرامی آخر کس سمندر کی تہہ سے نکلا ہے اور یہ برگزیدہ اعمال انسان کس دودمان عالی سے تعلق رکھتا ہے۔"

وہ جس شفقت و مرحمت سے پیش آتے ہیں، میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں ان کی تحسین کر سکوں، جب ہُگلی سے کلکتے رونق افروز ہوتے ہیں تو ایسا نہیں ہوتا کہ میرے غربت کدہ کو وہ اپنی ذاتِ عالی صفات کے پرتو سے نہ نوازتے ہوں اور مجھے سرفرازی نہ بخشتے ہوں۔"

آگے چل کر لکھا ہے" اب ان کی چھوٹی دختر کی شادی ہے مجھے فرمایا کہ ہماری دعوت پر جب تم کلکتہ آؤ گے تو ہمارے ساتھ دو مہینے ٹھیرو گے۔ میں اپنے طلب نامہ کا منتظر ہوں۔ گمان غالب ہے کہ ابھی تاریخ مقرر نہیں ہوئی

ورنہ رقعہ آچکتا۔"

غالب کے کسی خط سے اس شادی میں شرکت کا حال تو نہیں معلوم ہوتا ہاں
ایک سے زیادہ خطوں میں نواب صاحب کی اس شادی کی مصروفیات اور پھر آرام
فرمائی کا ذکر آیا ایک مکتوب میں یہ بھی ہے کہ وہ ہگلی بندر گئے اور وہاں پانچ رات
اور پانچ دن ان کا قیام رہا۔

نواب صاحب آم کی فصل میں انہیں آموں کا تحفہ بھیجتے تھے یہ تحفہ ہُگلی سے
کلکتہ پہنچتا تھا۔ کلکتہ سے دہلی نہیں۔

پنج آہنگ میں شامل اس خط میں جو نواب علی اکبر طبا طبائی کو لکھا گیا ہے اس دل خواہ
تحفے کے پہنچنے پر اپنی خوشی کا اس دلچسپ انداز میں اظہار کیا ہے۔ "قبلہ خدا پرستاں۔
۔۔۔ بس یہ سمجھیے کہ یہ نیاز نامہ سلام روستائی اور حرف غرض کا نیم دائرہ کاسہ
گدائی ہے۔ میں ایک گونہ بندہ شکم ہوں اور قدرے ناتواں اپنے دستر خوان کی
آرایش بھی چاہتا ہوں اور اپنی روح کی آسایش بھی، اور خردمند جانتے ہیں کہ یہ
دونوں خوبیاں آم میں موجود ہیں۔ اور اہل کلکتہ کو معلوم ہے کہ ہگلی بندر آم کی قلمرو
ہے آم سے ہگلی کو وہی نسبت ہے۔ جو پھول کو چمن سے ایثار کو ذات والا سے ہے
اور سپاس گذاری کو اس نیاز مند سے۔[1]

کلکتہ کی زندگی کے صبح شام اور اس دور زماں میں غالب کی پریشانی مقدمے کے
اندیشے خرچ اخراجات کا مسئلہ ادبی معارضے اس روداد کا حصہ ہیں۔ واپسی
میں ان کے سفر کا وارده ایک تیزی سے گزرتی ہوئی پرچھائیں سے مشابہ ہے۔

ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بت خانہ ہم

کلکتہ کے زمانہ کے اہم واقعات میں حامیان قتیل سے غالب کی ادبی معرکہ آرائی
بھی ہے بخوف طوالت جو یہاں پیش نہیں کی جا سکی۔

---

[1] اوراق معانی : ۸۵۔

اس سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غالب پردیس میں رہتے ہوئے [بالخصوص سرمایہ کی قلت کے باعث] نفسیاتی طور پر کس صورت حال سے دو چار تھے انہیں حالات میں انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پاس موجود گھوڑا فروخت کر دیں اور اسی کے ساتھ ایک دو ملازم بھی الگ کر دیے جائیں کہ اخراجات میں کچھ کفایت (یا کمی) ہو۔

"جب تک میں سفر اور اقامت کے مابین کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا اس وقت تک سواری کے گھوڑے کو اپنے سے جدا نہیں کیا تھا۔ جب یہ دیکھا کہ مجھے ایک خاصی لمبی مدت تک کلکتہ میں رہ کر خاک ریزی کرنا ہے، اس کے واسطے روپیہ بھی چاہیے اور فرصت کے لمحات بھی، جس میں جانور (اسپ رہوار) کی خدمت کی جا سکے۔ تو میں نے اپنے گھوڑے کو فروخت کر دیا۔"

اس کی قیمت فروخت کے طور پر مجھے ایک سو پچاس روپے ملے۔ سائیس کو بھی میں نے رخصت کیا۔ خدمت گار کو بھی جواب دے دیا تین نوکر اور ایک کہار اب بھی میرے ساتھ ہیں۔ اور آدھا آدمی تو میں بھی ہوں۔" سواری کا گھوڑا بیچنے کے بعد پچاس روپے صرف ہو گئے تھے اور سو روپے باقی تھے کہ جناب والا کا کرم نامہ ملا اور میرے دل کو فکر و تردد کی گرد سے پاک کیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ جاڑا اوپر سے آ رہا ہے گرم کپڑے اور ایک کمبل تو چاہیے جناب والا کی بر وقت دستگیری نے اس تردد سے مجھے نجات دی"۔ [لہ]

-- اس خط میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ نواب علی اکبر خاں طباطبائی اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی کی مصروفیات سے فراغت کے بعد اب بندر ہگلی میں آرام فرما رہے ہیں۔ انھوں نے گورنر جنرل کی طرف سے منعقدہ دربار میں شرکت نہیں فرمائی غالب نے لکھا ہے

لہ۔ نقش نیم رخ : ۱۳۰۔

کرسی کے برابر میں اُن کی کرسی خالی رہی۔

اس دربار میں غالب بھی شریک ہوتے جس کا تذکرہ ان کے ایک سے زیادہ خطوط میں آیا ہے۔ نواب صاحب کی دختر نیک اختر کی رسم کتخدائی میں وہ شرکت نہیں کر سکے مگر اس کے بعد وہ ہُگلی گئے اور پانچ دن اور پانچ راتیں انھوں نے وہاں گذاریں۔

نواب صاحب کا کریمانہ اخلاق اور مُربیانہ اخلاص شہر کلکتہ کے زمانۂ قیام اور گوناگوں پریشانیوں کے ایام میں ان کے لیے بہت بڑا ذہنی سہارا بنا رہا اور اس کا ذکرِ خیر غالب کی زبان قلم پر آتا رہا۔ خاص طور پر جب ان سے ملاقات یا پرسشِ حالات کا موقع ہاتھ آیا۔ منشی عاشق علی خاں کے فرستادہ مکتوب کے ضمن میں زیبِ نگارش بننے والے ان دل آویز کلمات کو دیکھیے۔

> "اسے کھولنے کے بعد اس کے عنوان تک رسائی ہوئی تو اس تحریر کے پردے سے ایک روشنی سی چمک اٹھی۔ معلوم ہوا وہ میرے خداوند کا مکتوب گرامی تھا۔"

اس ضمن میں، آگے چل کر جو اندازِ نگارش وطرزِ گذارش اختیار کیا ہے وہ گویا گل افشانی گفتار کی روشِ پر ہے۔

> "مختصر یہ کہ خط اس ننگ آفرینش کے نام تحریر کیا گیا ہے کہ کوئی وقت مقرر کرو اور مجھے اس سے آگاہ کرو۔ کہ میں تمھیں وہ سرفرازی بخشوں کہ تمہاری سربلندی حد سے گذر جائے اور اپنے ورود کی روشنی سے تمہارے ظلمت کدے کو روشن کردوں۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے اس کا جواب دیا اور دوسرے دن قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا۔" [1]

کلکتہ کے زمانۂ قیام میں مولوی کرم علی منشی عاشق علی اور بعض انگریز افسران سے غالب کے تعلقات بہت شگفتہ اور پسندیدہ روش کے ساتھ رہے، مگر نواب صاحب کو لکھے اپنے خط میں افضل بیگ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

---

[1] اوراق معانی: ۶۳

افضل بیگ " بطور وقع دخلِ مُقدّر " مجھ سے بہ خفیہ عداوت رکھتا ہے اور مجھے اثنا عشری فرقے کے لوگوں میں تصوّف والحاد اور زندقہ وکفر سے متہم کرتا ہے اور اہل تسنن میں فرقۂ امامیہ کی بد عقیدگیوں اور رافضیت سے نسبت دیتا ہے . .

کیا بتلاؤں کہ فریزر صاحب سے ملاقات کے بعد مولوی عبدالکریم نے میرے بارے میں کیا کیا لطائف پیش کیے[1] . . . . . . "

غالب کو اپنے اِسم و عَلَم کی شناخت کے مسئلہ میں اُلجھاوے کے باعث جو دشواریاں ابتدائے کار میں پیش آئیں اور جن سے متعلق سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے ان پر نامہ ہائے فارسی غالب میں شامل ایک ضمیمہ سے بھی روشنی پڑتی ہے۔

ضمیمۂ عرضداشت

غالب کو حالات کی بعض پیچیدگیوں کے پیش نظر اس ضمن میں ایک عرض داشت مرتب کرنا پڑی۔ تا کہ اصل صورت حال حُکّام بالا کی نظر میں واضح ہو جائے۔

شہر کلکتہ اس بندۂ گنہ گار غالب خاکسار کے کوکبِ ادبار کی فرودگاہ بنا تو ایک ستم پیشہ و بد طینت شخص پہلے سے یہاں آچکا تھا اور اصحاب دربار سے رابطۂ آشنائی رکھتا تھا۔ ——————

اس نے میرے خلاف غلط گوئی و شہرت دہی کا عجیب ہنگامہ برپا کیا اور کہا دہلی سے آنے والے اس تازہ وارد شخص نے اپنا نام بھی بدل دیا اور اپنا تخلّص بھی تبدیل کر دیا۔ ——————

اراکین بارگاہ کو اس کمترین کا نام اس دفتر کدہ کے خداوند ـ گورنر جنرل کے رُو برو پیش کرنے میں تامّل ہوا۔

ناچارہ میں نے اپنا دیوان ریختہ۔ جس کی ترتیب پر سات برس سے زیادہ

---

[1] نقش نیم رُخ : ۸۷

مُدّت گذر چکی تھی اور اس روسیاہ کی مہروں میں ایک مُہر کہ اسد اللہ خاں عُرف مرزا نوشہ جس کا نقشِ نگیں تھا[1] (اس سے اسم و رسم کا حال معلوم ہو جاتا ہے) مع ہذا سنہ ۱۲۳۱ھ اس پر کندہ تھا اور وہ مُہران اوراق سفینہ کے آخر میں ثبت تھی . . . . دفتر کدۂ سرکار کے افسرِ اعلےٰ کے پاس بھیجدی۔"

غالب نے اس ضمن میں اپنے سوزِ سینہ کا اظہار حکام بالا کے نام اس عریضہ میں بھی کیا ہے۔

. . . . ہر چند وہ گفتگو کہ اس ہیچ مداں کے بارہ میں سامنے آئی اب میں کیا کہوں . . . کہ میری کم وقعتی و رسوائی کا سبب ہے اور کہنے والے کی کم عقلی کے واسطے موجب سفاہت۔

سبحان اللہ کہ میں دو صد فرسنگ سے تلوار کی دھار پر سینہ کے بل چلتا ہوا شرکا کے ظلم سے فریاد کناں اس داد گاہ میں آیا ہوں یہاں سے ملامت کے سنگ ریزے اپنے دامن میں بھر کر واپس جاؤں اور میرے بعد اس شہر کے رہنے والوں کی زبانِ طعنہ دراز ہو کر اس بڑے شہر میں ایک ایسا مجہول الاحوال شخص آیا تھا جس کے اسم و رسم کے بارہ میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

جو غلط دعوے کیے گئے ہیں اُن کے باب میں میرا نام کہ مُہر میں کندہ ہے ایک ایسا ثبوت ہے جو لبوں پر مہر سکوت لگا دینے کے لیے کافی ہے سچ یہ ہے کہ اس ہیچ مداں کا نام اسد اللہ بیگ خاں ہے اس کا عرف مرزا نوشہ اور تخلص غالب . . . اسد کو بھی گاہے گاہے حسب ضرورت استعمال کرتا ہے۔

اس عرض داشت کی واگذاری کے بعد اُمیّد کہ تبدیلیٔ اسم و عَلَم کا داغ میرے دامنِ زندگی سے دھو دیا جائے گا۔"

---

[1] نقش نیم رُخ : ۱۴۵۔

غرض کہ قیام کلکتہ کے ابتدائی دور میں مرزا افضل بیگ کی طرف سے بعض پریشان کُن باتیں کی گئیں یہ کہا گیا کہ یہ شخص جو خود کو نصر اللہ بیگ خاں کا خویش ظاہر کرتا ہے۔ یہ تو وہ شخص ہے ہی نہیں جس کے نام سے قانونی کارروائی کی غرض سے کلکتہ میں وارد ہوا۔ کبھی اپنا نام کچھ ظاہر کرتا ہے اور کبھی کچھ۔ اس کے مذہب وملّت کی بھی کچھ خبر نہیں وہ سنیوں میں سُنّی بن جاتا ہے اور شیعی طبقہ میں خود کو اثنا عشری ظاہر کرتا ہے۔

اس کا ذکر انگریزی حکام تک جان بوجھ کر پہنچایا گیا اور غالب کو کسی نہ کسی طرح اپنی مُہر اور اپنی مرقومہ بیاض قلمی (دیوان) دکھا کر اس کا ثبوت دینا پڑا کہ وہی دراصل مرزا اسد اللہ بیگ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں ہیں۔

ایک بار وہ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کے مرحوم بھائی قاضی سراج الدین کے دولت کدے پر بھی گئے جس کا مختصر سا ذکر ان کے ایک خط میں اس طرح آیا ہے۔

"عنایت نامہ نے اپنے ورود سے سرفرازی بخشی، ارشاد والا کے بموجب حضرت قاضی القضاۃ کے مزار فائز الانوار پر حاضر ہوا۔" [1]

اسی اثناء میں جبکہ ان کا ذہن بعض دوسرے افکار و خیالات سے بھی اُلجھا ہوا ہے وہ اپنی ذہنی رسائیوں اور مقصدِ فکر و نظر کی نارسائیوں کے بارہ میں بھی سوچتے رہتے ہیں ــــ لکھنؤ میں جو قصیدہ انھوں نے ترتیب دیا یا تخلیق کیا تھا وہ تیر وہاں نشانے پر نہ بیٹھا اور ان ذہنی کاوشوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو وہ اپنے اس وقت کے حالات اور خیالات کے مطابق یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اس

---

[1] نقشِ نیم رُخ: ۸۸۔

شعری تخلیق کو وہ نواب ہمایوں جاہ رئیس مرشد آباد کی نظرگاہ والا میں کیوں نہ پیش کریں، ممکن ہے وقت کے دستور اور درباری معاشرے کے آئین کے مطابق وہاں اس کی قدر فرمائی ہوسکے۔ اور وہ صلہ وستایش سے نوازے جائیں۔
مولوی محمد علی خاں کو اپنے اس عندیہ سے آگاہ کرتے ہوتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ قصیدہ میں نے اودھ کے دستور اعظم کے لیے لکھا تھا اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ میرے خاندان اور اس کے وقار کے تئیں "داغ بدنامی" سے کم نہیں اور لطف یہ کہ سو دوسو شعروں کو ـــــ خاطر سے محو بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ نواب مرشد آباد بھی سید زادہ ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ اس قصیدے کو اس نئے ممدوح کی نذر کروں۔
اگرچہ میں ہنوز اس کی خدمت میں نہیں پہنچا لیکن نواب ہمایوں جاہ کا مدح نگار ہونا میرے لیے کوئی ناخوش گوار بات بھی نہیں۔ غرض کہ جب تک قصیدے کے لیے ممدوح کے نام کی وضاحت نہ ہو اسے کسی کو نہ دکھلائیں اور خوردوں کے عیب کو بڑوں کی طرح چھپائیں۔" [1]

یہ بات صرف اسی قصیدے اور غالب جیسے کسی قصیدہ نگار تک محدود نہیں بیشتر قصیدہ نگار اپنی فنکارانہ مہارت اور شعرگوئی کی صلاحیت کے سہارے قصیدے تالیف کرتے تھے اس میں نئی شعری صداقتیں اور فکری سچائیاں ہوتی تھیں ان میں مضامین حال وخیال کو تخیل وتمثیل کے پرکشش پیرایے میں پیش کیا جاتا تھا۔

مگر وہ بیشتر کوئی جذباتی صداقت نہ ہوتی تھی اس میں ممدوح کا نام بدلا جاسکتا تھا۔ غالب نے جو کچھ مولوی محمد علی خاں سے کہا یا ان کو لکھا ہے وہ اس حقیقت کو اپنی طرف سے بے نقاب کرنے کی سعی ہے۔

---

[1] اوراقِ معانی : ۱۴۰

کلکتے کے قیام کے دوران بلکہ نسبتاً اس کے ابتدائی دور میں غالب کی عام مصروفیات کیا رہیں، اس کی ایک جھلک مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کو لکھے جانے والے اس خط میں مل جاتی ہے۔ یہ وہ موقعہ ہے جب کہ وہ قاضی القضاۃ مولوی سراج الدین مرحوم کی بیوہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

"میں نے مزار پرانوار پر حاضری دی اور تھوڑی دیر اپنے عہد ماضی کو یاد کر کے روتا رہا۔ ... بعد ازاں اپنے عریضہ کو حرم سرا میں پہنچایا۔ مولوی غلام علی نام ایک شخص باہر آئے اور فقیر کو اپنے ساتھ حرم سرا میں لے گئے۔ جنابہ بیگم صاحبہ خود پردہ کے پیچھے تشریف فرما ہوئیں اور بغیر کسی واسطے کے انھوں نے سلسلہ سخن شروع کیا۔ جناب والا کا حال دریافت فرمایا اور کچھ باتیں اس فقیر کے سفر آوارگی اختیار کرنے کے باب میں معلوم کیں اور فرمایا کہ میرے خواہر زادے مولوی ولایت حسن خاں موجود نہیں، جب وہ آ جائیں گے، تمہارے پاس ضرور پہنچیں گے اور اس عمارت کدہ میں تمہارے فروکش ہونے کے لیے جگہ کا انتخاب کریں گے۔"

شملہ بازار شہر اور حکام انگریزی کی جائے قیام اور بارگاہ سے دور جگہ ہے اس کے بعد اس فقیر کو جنابہ مخدومہ (بیگم صاحبہ) کی خدمت میں حاضری کا اتفاق نہیں ہوا۔ میر ولایت حسن خاں اب تک اپنے دورے سے واپس نہیں لوٹے۔ ایک شخص نے بات چیت کے دوران یہ بتلایا کہ میر صاحب مذکور آج کلکتہ پہنچ رہے ہیں اور آج ماہ شوال کی ۳ر تاریخ اور ہفتہ کا درمیانی دن یعنی سہ شنبہ ہے۔

فقیر نے نقل کاغذات کے بہم پہنچانے میں خصوصیت کے ساتھ دفتر سرکار کے شواہد پر صبر کر لیا اور قرار پکڑا۔ ہر آئینہ صورت یہ ہے کہ میں نے ایک عرضداشت جو میرے بیس سالہ ماجرے پر مشتمل ہے اور میرے فریاد نامہ کی توضیحات کا حاصل ہے نیز مقدمہ کی جو کارروائی عمل میں آئی ہے اس کا خلاصہ رقم کر کے کل کہ ماہِ موجود کی تیرہ تاریخ تھی پیش کر دی دوشنبہ کا دن روزِ دربار بھی ہے۔ جب کہ تمام سفیر و وکلاء اور اہلِ دربار حاضر ہوتے ہیں۔

وہ سب حسبِ قاعدہ آداب وکورنش بجالاتے ہیں ـــــــ ان میں ایک افسر سرکار کی طرف سے پیشوائی کرنے والے بلکہ خود اس دربار کا دروازہ ہیں یہ سب کے سب ان کی خدمت میں پہنچتے ہیں فریزر صاحب کا عہدہ یہ ہے کہ وہ فریاد کرنے والوں اور فریاد کو پہنچنے والوں کے مابین واسطہ بنتے ہیں اور صاحبانِ کونسل کی طرف سے وہ سب کی پذیرائی کرتے ہیں جس طرح کی عرضیاں بھی پہنچتی ہیں پہلے اُن کے پاس پہنچتی ہیں وہ زبان انگریزی میں اُن کا ترجمہ کرتے ہیں اور صاحبانِ کونسل تک پہنچاتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ یہ فقیر بھی کاغذِ عرضداشت کے ساتھ جو نواب گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کیے جانے کے لیے تھی اپنی آمد کی اطلاع اور باریابی کی اجازت کے بعد فریزر صاحب کی خدمت میں پہنچا۔

فریزر صاحب اُٹھے گلے ملے میں نے مختصراً اپنا ماجرا پیش کیا جب میں نے نصراللہ بیگ خاں کا نام لیا تو فرمانے لگے کہ بیشک ہم اُسے جانتے ہیں۔ تم نصراللہ بیگ خاں کے کیا ہو! میں نے کہا میں ان کا حقیقی بھتیجا ہوں۔

غرض کہ جو وقت کا تقاضہ تھا اُس کے مطابق میں نے اپنا حال آں موصوف کو بتلا دیا۔ فرمایا کہ تم نواب گورنر جنرل کے لیے عرض داشت لے کر آئے ہو میں نے وہ کاغذ جو میں لکھوا کر لے گیا تھا اپنی قبا کے گریبان سے نکالا اور ان کو پیش کر دیا۔

یا رب میرا عذر مسموع ہوا میں یہ عرضی ریزیڈینٹ دہلی کو پیش نہیں کر سکا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ عرضی قبول نہ کی جاتی۔

فریزر صاحب کی یہ حیثیت ہے کہ وہ اُس دادگاہ کے صاحبِ اختیار افسر ہیں کہ جس مقدمہ کو وہ صاحبانِ کونسل کی خدمت میں پیش کرنے کے لائق تصور نہ فرمائیں اس کے لیے مُدعیِ مقدمہ کو خود جواب دیدیں۔

اس سے کلکتہ کے صدر دفتروں میں درخواست گزاری اور اس کی پذیرائی کے طریق کار کا بھی
علم ہوتا ہے۔ غالب کلکتہ کے دوران قیام مولوی محمد علی خاں کے مکتوب گرامی کا انتظار کرتے نظر
آتے ہیں۔ ایک بار وہ خط لکھ رہے تھے کہ ڈاک آئی اور یہ توقع ہوئی کہ
آنے والی ڈاک میں وہ خط بھی ہوگا اب انھیں جس کا انتظار رہے ۔ یعنی یہ کہ
ان کا مقدمہ اب گورنر جنرل کی بارگاہِ والا میں برائے سماعت
پہنچ ہی گیا۔

مگر ایسا نہیں ہوا اس کے جواب میں یہ اطلاع دی گئی کہ عدالت عالیہ میں
مقدمہ پیش نہیں ہوا۔ اس نے میرے دل کو بے پناہ شورش کدہ بنا دیا۔ اب میں
دوسری کسی فکرِ فضول سے دامن کشی کرکے اور سست جہد سے اپنی توجہ کو ہٹا کر نفس
مقدمہ کے سلسلہ میں بات کرتا ہوں۔

جس وقت کہ کاؤنسل کے اراکینِ اربعہ کی پیش گاہ سے دارالخلافہ کی طرف
روانگی کے لیے مامور کیا گیا' میں اس کی فریاد منیم کے پاس لے کر گیا اور میں نے
اپنی ناتوانی اور بے سروسامانی کا ان سے قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔

مخفی نہ رہے کہ یہاں ایک امیر ہے۔ بہت ہوش مند اور ذی وقار

مسٹر اندرو اسٹرلنگ اس کا نام ہے کہ وہ اس کاؤنسل کے خاص ممبروں
میں سے ہے۔۔ یہاں کے افسران بالا میں ایک بڑا حاکم ہے گورنر جنرل کی کاؤنسل سے قریبی رشتہ ہے
داد خواہوں کے فریاد ناموں کو وہ اراکین کاؤنسل تک اور حاکمانِ کشور کے فرمانوں
کو فریاد کرنے والوں تک پہنچاتا ہے۔ یہ انگریز افسر میرا ہمدرد ہے اور میرے حالِ زار
پر نظر رکھتا ہے۔

جب اس نے میری فریاد کو سنا' تو میرے اوپر رحم کھایا اور کہا اگر تم نہیں
جا سکتے نہ جاؤ صرف مقدمہ کے کاغذات دلی بھیج دو۔ میں یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا
کہ اب کیا ہو اور کیسے ہو۔ اگر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو۔

لہ اوراقِ معانی: ۹۰، ۱۲۵

میرا بہ تامل میری مجبوریوں کے باعث تھا، اس حاکم نے یہ سمجھا کہ میں حاکم دہلی کی بے توجہی کے خیال سے سوچ میں پڑ گیا ہوں"

میرے قریب آ کر اس نے کہا، کیا سوچ رہے ہو اور کس پریشانی میں ڈوبے ہوئے ہو۔ تمہارا مقدمہ قابل سماعت ہے صاحب ریزیڈینٹ بہادر دہلی سنیں گے اور ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔ یہ سنکر میرے دلِ شوریدہ کو ایک گونہ آسودگی میسّر آئی اور وحشت کم ہوئی۔

میں قیام گاہ پر واپس آیا۔ دہلی کے دوستوں کے معاملہ کی تصویر میرے پیش نظر تھی کہ اس وقت، مجھ سے ہمدردی کا سلوک کون کرے گا اور میں اس مُقدمہ کے سلسلہ میں اپنا وکیل کسے بنا سکتا ہوں چونکہ مُدّعی دوسری باتوں سے قطع نظر امارت و اقتدار میں صاحب امتیاز ہے اور اس کا شمار دہلی کے رؤسا میں ہوتا ہے کیا کچھ ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جو میرے دشمن کے رعب و دبدبہ کا خیال نہ کریں میرے مراتب ہم وطنی پر نظر بیگانہ داری اور میری دشمنوں کی بے پردہ حمایت اس پر مستزاد کہ میں ایک بدنصیب آدمی ہوں اور مجھے خدشہ اس امر کا ہے کہ یہ لوگ مجھے چھوڑ کر میرے دشمن کے ساتھ ہو جائیں گے اور میری تباہی و بربادی میں اس کے ساتھ شریک ہوں گے اس پر مستزاد کہ یہ اس عالم کون و فساد میں اکثر ہوتا رہتا ہے۔

رفتہ رفتہ دل مولوی فضل حق خیر آبادی کی ذات گرامی کی طرف مائل ہوا۔ مولوی فضل حق ابن مولانا فضل امام خیر آبادی منشی برکت علی خاں مرحوم کے اخلاف میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود عدالت فوجداری و دیوانی کے سررشتہ دار بھی ہیں اللہ پاک ان کو زندہ و پائندہ رکھے اور مراتب بلند تک پہنچائے [1]

میں نے ان کو اپنا مخاطب صحیح قرار دیا ہے اور انہیں اس کے لیے قبول کر لیا ہے

---

[1] اردوئے معانی: ۱۳۲۔

اس ستودہ صفات شخص کی بات ہی کچھ اور تھی۔ دوسری بڑی شخصیت مولوی محمد علی خاں صدر امین باندا کی شخصیت تھی جن کا شمار، بالخصوص اس جزو زماں میں غالب کے بڑے محسنین میں ہونا چاہیے۔ انھوں نے چھ ماہ ان کو اپنا مہمان رکھا اور رئیس باندا سے انھیں متعارف کرایا۔ ان کا دل آویز بیاں اسی مکتوب کے ایک دوسرے حصہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

غالب اس زمانے میں فلسفۂ وحدت الوجود کا مطالعہ کر رہے ہیں

"جناب ممدوح نے وحدت الوجود کو ماننے والوں کے مذاق کے مطابق شمع وچراغ انجمن مولوی ولایت حسن کے شیوۂ اخلاق کا ذکر کیا۔ اسی کے ساتھ سپہر آشنائی کے سورج نواب علی اکبر خاں طباطبائی کی طبع معنی شناس کا تذکرہ آیا۔"

کلکتہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو غالب نے بطور خاص اہم خیال کیا اور ان کے تذکرے کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ اس میں گورنر جنرل کے دربار کے ذکر کو بھی شامل کیا جانا چاہیے ــــ یہ دربار دسمبر ۱۸۲۷ء کو منعقد کیا گیا تھا۔

مرزا غالب کو بھی اس میں شرکت کا اعزاز بخشا گیا۔ ان کی کرسی کا نمبر دس تھا اور اس کے برابر میں جو کرسی تھی وہ نواب علی اکبر خاں طباطبائی کے لیے مختص تھی۔ نواب صاحب ناسازی طبیعت یا کسی دوسری وجہ سے دربار میں رونق افروز نہیں ہوئے۔ اس کا غالب کو افسوس رہا۔

غالب نے اس دربار میں جو اُمراء کلکتہ مرشد آباد، نیپال، لکھنؤ، دہلی اور جے پور سے آئے تھے ان کی تفصیل اپنے اس مکتوب میں پیش کی ہے۔

راجہ بھوپ سنگھ عظیم آباد۔ ستیک سنگھ بدر۔ راجہ بھوپ سنگھ مرزا افضل بیگ وکیل بادشاہ دہلی۔ منشی عاشق علی خاں بہادر وکیل بادشاہ اودھ۔ رائے گردھاری لال وکیل نواب ہمایوں جاہ رئیس مرشد آباد۔ رائے چیتن رائے وکیل راجہ جودھپور رائے رتن سنگھ وکیل راجہ جیسور۔ اُوماکانت اُپادھیائے وکیل مہاراجہ نیپال۔ نواب علی اکبر خاں۔ مرزا اسد اللہ خاں، عزیز نصر اللہ بیگ خاں۔

اس موقع پر غالب نے دو اشرفیاں نذر گذرانیں اسی کے ساتھ جو اس دربار کے کارگذار انگریز افسران تھے ان میں سے اپنے ایک ہمدرد انگریز افسر سے یہ خواہش بھی کی کہ ان کے لئے خلعت کی سفارش کی جائے جس کا جواب بہت خلوص خاطر اور شائستگی و تمیز کے ساتھ یہ دیا گیا کہ فی الوقت یہ ممکن نہیں۔

نواب نصراللہ بیگ خاں (عم غالب) انگریزی کمپنی بہادر کی ملازمت میں صرف دس ماہ رہے ان کے لئے بھی کبھی خلعت تجویز نہ ہوا۔ آیندہ کسی موقع پر اگر ممکن ہو سکا تو اس کے لیے سفارش کی جائے گی اس سے اُس وقت نصراللہ بیگ خاں کے ایک وارث کی حیثیت سے مرزا کی انگریز کمپنی بہادر کی نظر میں درجہ کا تعین سامنے آتا ہے۔

کافی زمانہ بعد کے اُردو خطوط میں ضرور ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو انگریز سرکار کے دربار میں خلعت ہفت پارچہ مالائے مروارید، اور جیغہ ملتا تھا۔ جو ایک بڑا اعزاز تھا۔

کلکتہ کے زمانۂ زندگی میں غالب نے اپنی اس وقت کی روداد حیات کو جگہ جگہ پیش کیا ہے یہ خطوط اگر دیکھا جائے تو صرف خط نہیں ہیں بلکہ غالب کا ایک سفرنامہ اور روداد حیات کا حصہ بھی ہیں اس پر افسوس ہوتا ہے کہ ان سے غالب کی سوانح حیات کے ایک نہایت اہم حصہ کی ترتیب میں کوئی خاص مدد نہیں لی گئی۔

کلکتہ کے دوران قیام میں غالب نے وہاں کی ایک ادبی انجمن میں شرکت کی' مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا یہ انجمن اُسی زمانہ میں قائم بھی ہوئی تھی۔ مختلف اہل سخن اور ارباب شعر جلسہ میں رونق افروز ہونے اور اردو نیز فارسی کے طرحی مصرعوں پر غزلیں کہنے کی فرمائش کی گئی۔ غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں غزلیں لکھیں۔

"نقش آزاد" سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بہت سے تازہ وارد ایرانی بغرض تجارت کلکتہ میں جمع ہو گئے تھے اور اس طرح کی ادبی محفلوں اور شعری مجلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ ان میں شاہ ہرات کے سفیر بھی تھے جنھوں نے غالب کے فارسی اشعار کی تعریف کی تھی یہ طرحی مشاعرے معرکہ آرائیوں کا سبب بن گئے۔

اس سلسلے میں آگے چل کر غالبؔ نے کچھ دوسری باتوں کا بھی ذکر کیا اور کہا ہے:

"یہ کہ سننے میں آرہا ہے کہ ماہِ اگست میں موکب گورنری آں سوے ہندوستان (دہلی) نہضت فرما ہوگا اور اسی کے ساتھ دفتر خانے اور عملے کے بہت سے آدمی بھی ادھر کا رُخ کریں گے اور وکلا سفیر اہل داد غرض کہ سب فریاد گزار اور ان سے متعلق افراد ان کے پیچھے رہ سپار ہوں گے۔ جس کی طرف اس سے پیشتر بھی اشارہ کیا جاچکا ہے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت داد خواں اور اپنے اپنے حق میں انصاف چاہنے والے انگریز حکام کے ساتھ کس طرح حالت سفر میں رہتے تھے کہ اگر کہیں موقع مل جائے تو وہ اپنا معروضہ گورنر جنرل یا اس کے سکتر کو پیش کر سکیں۔ چنانچہ غالبؔ نے اس ضمن میں مزید لکھا ہے:

"یہ ان داد خواہوں کے لیے بطور خاص ایک گونہ خوش خبری ہے کہ دہلی ریزیڈینسی اور ایجنٹی کی لکد کوب سے اب ان کو نجات مل جائے گی، خاص طور سے ان لوگوں کو جو تلوار کی دھار پر سینہ کے بل سفر کرتے اور دشت و دیار سے گزرتے ہوئے رواں دواں ان کے جلو میں چل رہے ہوں گے۔"

اس زمانے میں غالبؔ کی اپنی مُشکلات بھی یہی تھیں کہ ان کا مُقدمہ ریزیڈنسی میں گیا ہوا تھا اور ریزیڈینٹ سیر و سفر میں تھے، اب مقدمے کی مسل یا فائل پر غور کون کرے؟ اسی کے لیے غالب کی زبانِ قلم پر یہ فقرات آئے:۔

"ایک خبر یہ بھی ہے اور سننے میں آرہا ہے کہ ریزیڈینٹ دہلی ماہ جنوری کے اواخر تک اس شہر کی طرف واپس آجائیں گے، توقع کی جاتی ہے کہ جنوری کے اخیر میں نہیں تو فروری کے ابتدائی ایام میں ان کی واپسی ہو جائیگی اب کہ وہ دن بھی گذر گئے اور یہ دن بھی لامحالہ یہ انگریز حاکم دہلی پہنچ چکا ہوگا میرا مُقدمہ بھی اس اثنار میں پیش ہو جانا چاہیئے، اب مجھے

دیکھنا ہے کہ چار پانچ مہینے میں کیا پیش آتا ہے۔"

غالبؔ عجیب کشمکش میں تھے کہ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا؛ اسی کے لیے انھوں نے اس خط میں یہ بھی لکھا ہے:۔

"مجھے ایسا نظر آرہا ہے کہ بہ تقاضائے "قضیۂ زمین بر زمین" اس نوع کے مقدمات میں حکمِ آخر انھیں مقامات میں صادر ہوگا جن سے وہ مُقدمات متعلق ہیں اور ہر بقعۂ زمین کے حکام کی غلط نمائی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ مجھے صاحب سکتر بہادر نے بہ سبیل تفاول بتلایا تھا کہ اب تم لوگ ریزیڈینٹ دہلی کی کم فہمیوں پر افسوس کرنے سے بچ جاؤ گے۔

گورنر جنرل بہادر خود ہر مقدمہ کی صحیح صورت حال پر غور فرمائیں گے اور معاملہ کی تہہ تک پہنچیں گے۔ ستم رانیوں کا خاتمہ ہوگا اور بیداد کے سلسلے ٹوٹ جائیں گے اور ناانصافیوں کے حلقے بکھر جائیں گے۔"[1]

مگر غالب کے لیے ایسا نہیں ہوا اگرچہ وہ اس اُمید موہوم میں ایک زمانہ تک اپنا وقت گذارتے رہے۔

دہلی میں رہتے ہوتے بھی انھوں نے اپنے مختلف مکتوبات میں اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ گورنر جنرل بہادر کلکتہ سے دہلی آئیں گے تو ہم ایسے داد خواہوں کو انصاف ملے گا اور یہ حالت منتظرہ ختم ہوگی اس موقع پر غالب کا ایک شعر یاد آتا ہے جو اسی مفہوم کا ترجمان ہے۔

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
ابتلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہوجائیگا

عام طور پر ہم غالبؔ کی شاعری کو ان کے "خیال" کا عکس سمجھتے ہیں اُن کے حال کا نہیں۔

[1] اوراقِ معانی: ۱۴۳

کلکتہ سے واپسی کے بعد

(مقدمہ پنشن کے مسائل و مراحل)

کلکتہ سے واپسی کے بعد غالب نے دہلی میں. جو وقت گذارا وہ اس ذہنی کشمکش کے مابین گذارا کہ "کیا ہو' اور کیسے ہو" (اگر نہ ہو تو کہاں جائیں' ہو تو کیوں کر ہو) انھوں نے یکشنبہ کے دن جمادی الثانی کی دوسری تاریخ کو یہ خط لکھا ہے اور اس میں اپنے لمحاتِ گذراں کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"کچھ وقت کے لیے میں نے سعی آوارگی کو چھوڑا اور دہلی کے ایک گوشے میں پاؤں دامن میں سمیٹ کر بیٹھ گیا' میں ان نیک لوگوں کی طرف سے اپنے ساتھ بہتر سلوک اور آئین غمخواری کی پیروی پر کس قدر مسرت محسوس کرتا ہوں کہ اس سفر میں میری آنکھیں اُن کی خاکِ پا سے رُوشناس ہوئیں۔ اور اسی نے وطن میں قیام کو مجھ آشفتہ سر اور آوارگی مشرب کے لیے غربت سے زیادہ تلخ بنا دیا۔"

اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک طویل سفر سے غالب کا نامراد اور رُبے نیلِ مرام واپس آنا ان کے لیے کس حد تک دلی کوفت اور ذہنی آزار کا باعث تھا۔ ہم انھیں یہ کہتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ وطن میں جو شخص مجھے دیکھتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ مسافرِ راہ منزل تک پہنچ گیا اور اب وطن کی فضا میں سانس لے رہا ہے اور راحت محسوس کرتا ہے بلکہ ہر شخص کچھ اس طرح نظر ڈالتا ہے جیسے وہ کوئی اجنبی شخص ہیں اپنے وطن سے دور نکل آتے ہیں اور تازہ تازہ کسی نئی غربت کا داغ کھائے ہوتے ہیں۔

مولوی فضل حق خیر آبادی کو غالب بے حد عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور جب مولانائے موصوف نے دہلی کو خیر باد کہا اور نواب جھجر کی دعوت پر وہ دہلی سے باہر چلے گئے۔ تو غالب کو بے حد افسوس ہوا انھوں نے اس واقعہ کو اپنے ایک خط میں اس طرح قلمبند کیا اور ....

اس کا بطور خاص ذکر کیا کہ جب مولانا رخصتی ملاقات کے لیے شہزادہ ابو ظفر کے پاس گئے تو شہزادہ نے مولانا کو اپنا دوشالہ پیش کیا اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ مولانا رخصت کا لفظ جرِ ثقیل کی مدد سے بھی میرے لبوں پر نہیں آسکتا آپ نے طے کر لیا ہے کہ آپ دہلی چھوڑ دیں گے تو میرے تئیں سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ اور کیا رہ گیا ہے۔"

مولانا کے گھر میں آگ لگنے کی خبر احباب سے سنی تو مرزا بے تاب ہو گئے اور لکھا۔

"جب آگ لگی، دھویں کے بادل اُٹھے اور لپٹیں بلند ہوئیں تو اس وقت جناب والا کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔
نیز یہ کہ یہ قیامت برپا ہوئی ہم سایے میں غل مچا اور انجمن میں سراسیمگی پھیلی تو اہل خانہ، باہر کے اہل محلہ اور ہوا خواہوں کی شور فریاد نے کیا حشر بپا کیا یہ فتنہ وآشوب کس وقت تک دلوں اور دماغوں پر مسلّط رہا۔
نوکر پیشہ لوگوں کے مکانوں کی چھتوں اور چھپروں پر کیا گذری کارخانہ و بنگاہ کا کیا ہوا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مولانا دہلی سے باہر ہیں اور غالب ان کے یہاں آگ لگنے کی خبر سنتے ہیں تو بے طرح پریشان ہو جاتے ہیں اور دریافت خیر و عافیت کے لیے خط تحریر کرتے ہیں۔

انھوں نے افضل بیگ کو ان کے قاضی القضاۃ بنائے جانے پر مبارکباد کا خط لکھا تو انشاء پردازانہ انداز اختیار کرتے ہوئے یہ تحریر کیا۔

ہنوز خواہش و محبت کے مابین آویزش کا یہ ہنگامہ بے طرح برپا تھا اور عشق و عقل کی ستیزہ کاری شورش قیامت کا سا انداز رکھتی تھی کہ آسمان کو میری سرگشتگی پر رحم آگیا اور کارسازی کے لیے میری خوابیدہ قسمت نے غفلت کے تکیہ سے سر اٹھایا۔ الٰہ آباد میں گورنر جنرل کے موکب فرخندہ نشان کے ورود مسعود کی مسرت آگیں خبر میرے گوش سماعت تک پہنچی اور فرحت و فیروزی کے اس نشاط انگیز اور خوش آیند نغمہ کو مخدوم کی قاضی القضاتی کی نوائے مبارک باد نے نئی مرغولہ ریزیوں ،شادمانیوں سے بھر دیا۔ جس سے اس کی دلکشا صدا کچھ اور بلند ہوگئی۔

اس نغمۂ نشاط نے مجھ پر اثر کیا اور میں کہ اپنے دل و دماغ سے الجھ رہا تھا۔ اس حلقۂ تسخیر سے باہر آیا۔ شوق بہانہ طلب نے رسومات حجاب کو دور کیا اور مجھے مراسم تہنیت کی بجاآوری پر آمادہ۔

میرا دل کہ احساس ندامت سے زار و نزار ہو رہا تھا اور خود کو افسردہ و پژمردہ بنائے ہوئے تھا خوشی سے جھوم اٹھا اور والہانہ رقص کرنے لگا۔

"اور شاہد ارادت نے اپنے حسین رُخ کے نقاب کو کرنوں کی طرح تار تار دیکھ کر انداز سادہ روئی کے ساتھ پابوسی کا ارادہ کیا اور چشم روشن کی اداسنجیوں نے رنگ ترنم اختیار کر لیا۔"

گورنر کے دربار سے جو دراصل فرمار وائے مملکت اور شہریار سلطنت ہے، عہدۂ قاضی القضاتی کی عطا فرمائی بلند اقبالی و خوش نصیبی کا نشان ہے۔

منصب والا کی یہ ترقی طلب داروں کے لیے معراج کمال کی غایت ہے خدا اُسے میرے مخدوم کے خدام والا مقام کے لیے وجہ تحسین و بلند پایگی بنائے۔

غالب کے طرزِ ادا میں بھی ایک ندرت ہے اور طرزِ فکر میں بھی ایک طرفہ کاری موجود ہے۔ حسنِ عمل میں حسنِ خیال کی پرچھائیاں جھلکتی ہیں۔ حالی نے ایک موقعہ پر کہا ہے "خیال بغیر مادّے کے پیدا نہیں ہوتا"۔

یہاں مادّہ سے تجسس اور تجربہ مراد ہے اور تجربہ کی منزل پر پہنچ کر ہی ایک حسّی تجربہ تخلیقی تجربے کی شکل اختیار اور معنی سے معنویت کی طرف ذہن کو مائل کرتا ہے۔ غالب کے یہاں دیکھنے محسوس کرنے اور پیش کرنے کے عمل میں بیشتر مواقع پر ایک عجیب و غریب ہم آہنگی ہوتی ہے جو ان کی تخلیقی حسیّت اور شعور و آگہی کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ ایک خط میں یہ اشارہ کرتے ہوئے کہ وہ کس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں سوچتے ہیں اور کیوں سوچتے ہیں (لکھتے ہیں)

خط ختم ہو گیا اور پراگندہ گوئی و دراز نفسی کی شرم مجھ پر غالب آ گئی دیدہ ور جانتے ہیں کہ میرے پاس سخن ہائے گفتنی بہت ہیں لیکن اس "افسانۂ پریشان" کو کہاں تک طول دیا جائے میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں مختصر کہوں اور سلسلہ گفتگو دراز نہ ہونے دوں اس پر نگاہ رکھوں۔

ایک خط میں اپنے سنین عمر کو چوالیسویں سال سے وابستہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انھیں "اپنی خاندانی پنشن کی الجھنوں سے نجات مل گئی ہے۔"

جس کے یہ معنی ہیں کہ غالب نے یہ خط ۱۸۴۱ء میں سپردِ قلم کیا ہے انکا سالِ پیدائش ۱۷۹۷ء ہے تو چوالیس برس کی عمر ۱۸۴۱ء میں ہوئی۔

غالب کے مکتوبات کسی نہ کسی زاویے سے ان کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس طرح سے ان کا قلم اپنا سوانح نامہ لکھ جاتا ہے اب یہ الگ بات ہے کہ اس کی کوئی مربوط شکل نہ ہو پھر بھی ان کے اپنے جو حالات اور خیالات ہیں اس معاشرے اور اس معاشرت کا جو خبر نامہ ہے اس کا ایک جیتا جاگتا عکس ان کے مکتوبات کے صفحات اور سطور میں موقع بموقع دیکھا جا سکتا ہے۔

مرزا غالب کی روداد حیات کا جو حصہ ان کی تحریروں میں محفوظ ہے اس کی سیر دیدو وادیدان کے ذہنی سفر کی بازدید و بازیافت میں معاون ہوتی ہے، جہاں ہم ایک حساس انسان کو کچھ کہتے کچھ سنتے اور کچھ لکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

اسی زمانے میں مرزا احمد بیگ کا بھی انتقال ہو گیا، مرزا احمد بیگ سے غالب کے گہرے تعلقات تھے۔ "مآثر غالب" کے نام سے قاضی عبدالودود نے جن نگارشات کو مرتب کیا ہے ان میں بہت سے خطوط مرزا احمد بیگ کے نام ہیں جن کا تخلص "تپاں" تھا۔ ایک بار جب انھیں دردِ پہلو سے نجات ملی تھی، تو غالب نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"تحریر سے معلوم ہوا کہ قبلۂ جان و دل مرزا احمد بیگ خاں نے دردِ پہلو سے بہت تکلیف اٹھائی۔ حکیم سید احمد علی خاں کے حسنِ تدبیر سے افاقے کی صورت پیدا ہوئی۔ خدا کا ہزار ہزار شکر اور ہزار در ہزار حمد و ثنا۔" [2]

لیکن جلد ہی وہ اس جہانِ فانی سے گذر گئے اور مولوی سراج الدین احمد کو مرزا نے عذر خواہی اور ماتم پرسی کے طور پر جو خط لکھا وہ — جذباتی لمحوں کی نقش گری کے اعتبار سے ان کی بہترین نگارشات کے زمرہ میں آتا ہے۔

"قبلہ و کعبہ والا نامہ پہنچا اور مرزا احمد بیگ کے فراقِ دائمی کی خبر ملی، میں بھی کس قدر سنگ دل و سخت جان ہوں کہ ایک دوست کی وفات پر ماتم پرسی کے لیے خط لکھ رہا ہوں اور میرا وجود اپنے اجزائے حواس کے ساتھ ذرّہ ذرّہ ہو کر بکھر نہیں جاتا۔" [3]

---

[1] اوراق معانی: ص ۱۰۴۔

[2] اوراق معانی: ص ۱۱۶۔

[3] اوراق معانی: ص ۱۱۸۔

انھوں نے مولوی سراج الدین کے نام اپنے زیرِ نظر خط میں لکھا ہے۔

"عجیب تر بات یہ ہے کہ ان تین برسوں کے دوران جو وطن سے دوری اور صحرا نوردی میں گذر گئے دہلی کے بڑے لوگوں کی رسم و راہ بدل گئی۔ احباب کی طبیعت میں مہر و وفا باقی نہ رہی، دوستانِ دلی میں سے ایسے بھی کچھ ہیں جو اپنی آغاز جا کی طرف واپس لوٹ گئے اب اس دُنیا میں نہیں ہیں اور بزمِ اُنس کے بہت سے جُرعہ نوشوں نے جام فنا پی لیا۔ صاحبِ دل اور گراں مایہ شخصیتیں گوشۂ گُمنامی میں پہنچ گئیں اور کمینوں کے لیے دورِ عُروج آگیا۔"[1]

وہ ایک ایک آدمی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو خود کلامی کے طور پر یہ کہتے نظر آتے ہیں۔

"جب سے یہاں آیا ہوں ہر طرف دیکھ رہا ہوں اور کسی بھی دل میں مجھے محبت کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ عدالتوں کا حال، داد خواہوں سے زیادہ بدتر ہے۔" اس مالوسی کی ایک بڑی وجہ عدالتوں کی طرف سے اندیشہ ناکی بھی ہے جو ان کے ذہن کو گھیرے ہوئے ہیں۔

غالب نے انگریزوں کی دستور سازی اور آئین حکومت کی بہت تعریف کی ہے لیکن ان کا عملی تجربہ اس معاملے میں اُن کے اُس دور کے خیالات کا ساتھ نہیں دے سکا۔ حاکمِ دہلی سے انھیں سخت شکایتیں ہیں وہ اسے بخود مشغول کہتے ہیں، دہلی کا ریزیڈنٹ، جس کو بنایا گیا ہے اس نے اہل شہر کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے، اب انھیں کوئی اُمید نہیں اس لیے کہ جب تک دیو وں ایسی طبیعت اور طینت رکھنے والے حاکم کا زوال نہ ہو جائے اس کا کوئی امکان ہی نہیں کہ حالات رو براہ ہو سکیں۔

وہ گورنر جنرل کے منتظر ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس مقدمہ کو وہ اپنی صوابدید کے مطابق طے کریں گے تو میرے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔

مولوی سراج الدین ہی کے نام ایک دوسرے خط میں انھوں نے اپنے کلکتہ کے قیام اور وہاں کے شب و روز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی افسردہ خاطری

---

[1] ازراقم معانی

ناآسودگی اور محرومی کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے۔

"کہ نامہ نگار کے سر میں ایک زمانے سے یہ سودا سمایا ہے کہ آمیزشوں کے اس بھنور سے میں اپنے رختِ آرزو کو کنارے لگاؤں اور آزادانہ رہ گذارِ حیات میں سفر کروں۔"

"میں سوچتا رہا ہوں کہ جاڑے کے شروع میں افسردگی کا یہ دور ختم ہو جائے گا اور درماندگی سے نجات کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ خواہی نخواہی میں اس دام گاہ سے رہائی حاصل کر کے صحرا کی طرف نکل جاؤں گا لیکن اِس عُقدۂ کار کی کشایش کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

شعر — نومیدیٔ ما گردشِ ایام ندارد
روزیکہ سیہ شد سحر و شام ندارد

ہماری ناامیدی گردشِ ایام سے ماورا ہے جو دن سیہ ہو گیا اب اس کے سحر و شام کہاں؟

اس زمانے میں غالب کی افسردگی اور پژمُردہ دلی کا اندازہ مولوی صاحب کے نام ان کے ایک اور خط سے بھی ہوتا ہے۔

آپ نے میرے خط ارسال نہ کرنے کو میری افسردگیٔ شوق پر محمول کیا میری موت کا گمان آپ کو کیوں نہ گذرا کہ میں آپ کی اس اداشناسی پر خُوش ہوتا۔

. . . خدارا خط کی تحریر میں تاخیر کو سرتاسر میری خاموشی پر محمول نہ فرمائیں کیا بتاؤں دل میں دردِ نگاہ میں سراسیمگیٔ طبیعت میں تفرقہ اور سر میں گوں ناگوں قیامتیں ہیں کہ ہر وقت برپا رہتی ہیں میرے شب و روز کس طرح بسر ہوتے ہیں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

مزید ایک خط میں غالب کی زبان سے ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ دہلی کے صاحب ریذیڈنٹ نے مرزبان میوات کے وکیل کو بلایا اور ان کے پیش کردہ کاغذات اسے دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ سب صحیح ہے ان کاغذات کے دستخط اور مہریں مستند ہیں اور سرجان مالکم نے اپنی دیدہ وری کے ساتھ اُسے مان لیا ہے۔

کلکتہ میں اپنے قیام کے دوران غالب اگر دہلی کے معاملات سے متعلق پریشان ہوتے تھے تو اب دہلی میں رہتے ہوئے انھیں کلکتے کی فکر دامن گیر رہتی تھی اور وہ برابر وہاں کے دوستوں سے حالات پوچھتے رہتے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ جس میں بطور خاص ان کے خلوص خاطر کو بھی دخل تھا اُس دور کے خاص دوستوں میں جن سے کلکتہ کے دوران قیام محبانہ و مخلصانہ تعلقات قایم ہوگئے تھے مولوی سراج الدین احمد کا نام لیا جاسکتا ہے۔ کلکتہ کے ذہنی حوالے کے ساتھ زیادہ خطوط انھیں کو لکھے گئے ہیں۔

کلکتہ میں وبا پھیلنے کا حال جب غالبؔ کو معلوم ہوا تو بے چین ہو گئے اور انہیں مولوی سراج الدین کو خط لکھا اور دریافت حالات کے سلسلہ میں اپنے دل کی گرانی اور پریشانی کو ظاہر کیا۔ انھیں کے نام ایک خط میں کرنل ہنیری املاک کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے غالبؔ نے لکھا۔

"انہیں دنوں میں ایک بڑے انگریز افسر نے مجھے بتلایا کہ کرنل ہینزی املاک نے بھی اس جہانِ گذراں کو خیر باد کہا۔ واے برحالِ من کہ میں اس دیار میں جو بے فرمان ہے پتھر سے سر ٹکرا رہا ہوں۔ اور ناکامی کے صدمے سے جاں بلب ہوں۔"

مرزا احمد بیگ بھی غالبؔ کے مکتوب الیہ رہے ہے۔ کافی دنوں تک ان کا نیز ایک اور دوست کا کوئی خط نہیں آیا تو اس کی شکایت بھی مولوی سراج الدین احمد سے کی۔

"کیا عرض کروں کہ میں اپنے بخت بد سے کس قدر گلہ مند ہوں اور خود کو کتنا لاچار محسوس کرتا ہوں تین ماہ ہوگئے کہ مخدومی مرزا احمد بیگ اور ابوالقاسم خاں نے رسم و راہِ محبت کو ترک کر رکھا ہے . . ."

مولوی سراج الدین احمد کے نام اپنے ایک اور خط میں اظہار تعزیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میں وہ ہوں جب تمہارا خط پہنچتا۔ اُچھل پڑتا تھا مستانہ وار رقص کرنے لگتا تھا۔ اور اب یہ حال ہے کہ نظر جیسے ہی آپ کے صحیفہ والا سے دوچار ہوئی دنیا میری نظر میں تیرہ و تار ہو گئی۔ سب سے پہلے جو کچھ سامنے آیا وہ ایک آشوب انگیز خبر تھی جس سے دل سے لے کر جگر تک خون ہو گیا۔ یعنی آپ کی خواہر عزیز کی خبر اندوہ اثر۔ یہ وہی مخدومہ مرحومہ ہیں کہ جب کلکتہ میں آپ نے اُن کی بیماری کی خبر سُنی تھی تو آپ بے قرار ہو گئے تھے۔ اور آپ کی خاطر عاطر پر سراسیمگی چھا گئی تھی۔'

تحریر کے لفظ لفظ سے خلوص خاطر اور دلی تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسروں کے غم میں شریک ہونا اپنی جگہ اس کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دینا ایک دوسری صورت ہے' غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ ان کا دل دوسرے دلوں کے ساتھ دھڑکتا ہے — مرزا احمد بیگ تپاں کے لیے جو کچھ ان کی زبان قلم پر آیا وہ ایک اُفقی نہیں آفاقی سچائی ہے۔

" ہر چند موت پر رویا نہیں جا سکتا۔ اور ہستی کے تار و پود بکھر جانے پر کوئی چارہ سازی ممکن نہیں۔"

" مگر یہ مرزا احمد بیگ کے مرنے کا وقت نہیں تھا۔ اتنا بھی صبر نہ ہوا کہ میں کلکتہ پہنچ جاتا۔ اتنا بھی توقف نہ کیا کہ حامد علی جوان ہو جاتا۔ میں بچوں کے درد کو سمجھتا ہوں کہ میرے باپ کا سایہ بچپن میں میرے سر سے اُٹھ گیا تھا۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے احباب کے غم میں شریک ہوتے تھے۔ غالب افسردہ طبع اور آزردہ مزاج شخص نہیں تھے پھر بھی موقع بموقع ہم ان کی زبان قلم پر اس نوع کے فقرے آتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

یہ بھی اطلاع ملی کہ مولوی سراج الدین نے کلکتہ چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے وہ بار بار یہ سوچتے اور کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ میرا اب کلکتہ میں پوچھنے والا کوئی نہ رہا۔

انگریزوں کی طرف سے وہ بالکل مایوس ہیں اور ہم ان کی زبان قلم پر یہ الفاظ آتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

"میرا ماجرا یہ ہے کہ اس خلاف آباد کی عدالت سے اپنے آپ کو یکسو کر کے میں اپنے غم کدے میں "نقش بہ دیوار" بنا بیٹھا ہوں۔ بزم خیال میں اُمید موہوم کا چراغ جلائے ہوئے ہوں، حاکمانِ صدر کی داد گری کی طرف سے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اب میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اطراف کے حکّام کیا روش اختیار کرتے ہیں اور کون باتیں اُن کے پیشِ نہادِ خاطر رہتی ہیں۔" لہ

اصل میں غالب کو زیادہ مایوسی اس لیے بھی ہے کہ دہلی میں ان کے لیے جو ماحول ہے وہ ناسازگار ہے۔ جدھر دیکھو "غبار فتنہ" بلند ہے اور "آتشِ ظلم بھڑک رہی ہے" (ان کے اپنے الفاظ میں)

"اگر کچھ دن اور حالات اسی نہج پر چلتے ہیں تو خاندان کے خاندان سیلابِ فنا میں غرق ہو جائیں گے۔

خاص کر اس دیار میں جہاں خواص نے بھی اِفترا پردازی کا شیوہ اختیار کر رکھا ہے حکّام ان لوگوں کی گفتگو پر کان دھرتے ہیں نہ جانے کتنے بندگان خدا ہیں کہ اپنے اموال و املاک کے معاملے میں خوف زدہ ہیں۔" لہ

غالباً یہی وہ ماحول تھا جس کی وجہ سے ایک اور خط کے آخیر میں غالب نے یہ لکھا تھا۔

"میرا جو خط بھی آپ کو ملے اسے پڑھنے کے بعد چاک کر دیجیے آگ میں ڈال دیجیے یا پانی میں پھینک دیجیے۔"

لہ اوراقِ معانی : ص ۱۰۵۔

مرزا نے اپنے ایک خط میں اس پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ مسٹر اسٹرلنگ جو کلکتے کے مرکزی دفتر میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے دنیا سے اُٹھ گئے اس کے لیے انھوں نے جس درد خیز اور الم انگیز اسلوب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اُسے اِن الفاظ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

"حیران ہوں کہ مسٹر اسٹرلنگ جیسے فرّخ فال اور بلند اقبال امیر کے دنیا سے اس طرح اچانک اُٹھ جانے کے معنیٰ آخر کیا ہیں اور کارکنان قضا و قدر نے اس جواں مرگ کی موت کو کس نتیجہ اور مصلحت کے طور پر منظور کر لیا اب سمجھ میں آرہا ہے کہ غالبِ برگشتہ قسمت کی تمام آرزوں پر پانی پھیر دینا مقصود تھا اور یہ صورت ممکن نہ تھی"۔

اس ہنگامہ ہوش رُبا کے ساتھ اسٹرلنگ کی موت کا ان کو غیر معمولی افسوس اس لیے بھی ہوا کہ ان کے مقدمے کے سلسلے میں جو کارروائی ہوئی وہ ان کے عندیے کے خلاف تھی اور انھیں یہ خیال تھا کہ ریزیڈینٹ دہلی جیسی چاہیں رپورٹ بھیجیں مسٹر اسٹرلنگ اسے سنبھال لیں گے اور ان کے خلاف مرکز میں کوئی فیصلہ نہ ہوگا۔

انھوں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ خراب آبادِ دہلی کے حاکم نے جسے فرانسس ہاکنس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مُرزبان فیروز پور کے ساتھ پیمانِ یک دلی باندھ رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رپورٹ اس کی مرضی کے عین مطابق صدر میں بھیجی گئی ہے۔

کچہری ریذیڈنسی میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو غالب کے طرفدار تھے انھوں نے یہ راز غالب پر منکشف کر دیا اور انھیں اندرون پردہ بار پانے کا موقع دے دیا اور وہ ایک حد تک اس راز سے آگاہ ہوگئے انھوں نے اسی زیرِ نظر مکتوب میں آگے چل کر یہ لکھا ہے کہ صاحب سکرتر بہادر نے انھیں یاد فرمایا اور کہا کہ ریزیڈینٹ نے تمھارے وظیفے کے بارے میں جو تجاویز مرکز کو بھیجی تھیں وہ منظور کر لی گئیں۔

"پوچھا کہ صاحب ریذیڈینٹ نے کیا تجاویز ارسال فرمائی تھیں جواب ملا کہ قاعدہ سابقہ کو مستقل صورت دے دی جائے" غالب نے لکھا ہے کہ مجھ پر جنون کی سی ایک کیفیت، یہ کلمات سن کر طاری ہوگئی اُن کے دل کا پیچ و تاب بڑھا کہ یہ سب کیا ہوا کیوں ہوا اُن کا مقدمہ اس سے بہتر نظر داری اور حسنِ سلوک کا مستحق تھا وہ زیرِ نظر مکتوب میں یہ کہتے نظر آتے ہیں۔

"سوگند بخدا اے اسٹرلنگ کے نہ ہونے کے باعث میرے معاملے نے یہ شکل اختیار کی"۔

ایسے کسی حکم کے صادر ہونے کی انھیں ہرگز توقع نہ تھی اس صورت حال پر ان کے دلی تاثرات کو ہم اس اقتباس میں دیکھ سکتے ہیں۔

"اب کہ میں چارہ سازی کے دروازوں کو شش جہت سے اپنے اوپر بند پاتا ہوں اور تمام ستارے گویا میرے حق میں طالعِ ناساز بن گئے ہیں ۔ اس کے سوا رہ کیا گیا ہے کہ میں انگریزی میں درخواست لکھوا کر بذریعہ ڈاک نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں روانہ کروں اور اس میں اپنا تمام احوال لکھ بھیجوں"۔

"آپ سے عرض ہے کہ میری فریاد کے مبادی کو صاحب سکتر کے گوش سماعت تک پہنچا دیں کہ وہ اس نامراد کی داد کو پہنچیں اور اس خستہ حال کے ساتھ انصاف کریں"۔

اسی رپورٹ سے متعلق تاثرات کو غالب نے ایک اور خط میں بھی دہرایا ہے اور اپنی اندوہ ناکیوں اور محرومیوں کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ "ماہ مئی کی چار اور ماہ ذی الحجہ کی گیارہ تاریخ تھی ۱۸۳۰ / ۱۲۴۵ کہ میرے مقدمے کی رپورٹ اس دادگاہ سے صدر روانہ ہوئی ہائے ہائے کیا رپورٹ اور کیا مقدمہ۔

"ایک جہانِ آرزو کے واسطے فتوائے خوں ریزی کہ اسے ریزشِ آبرو کا فرمان کہنا چاہیے"۔

مقدمے سے متعلق غالب کا یہ خیال تھا کہ جب حقیقت حال سامنے آئے گی تو ان کی فریاد سنی جائے گی اور اس کی داد اس شکل میں دی جائے گی کہ جو غلط ہو چکا ہے اس کو صحیح کیا جائے، مگر اس مقدمے نے مذکورہ رپورٹ کے بعد جس موڑ پر اُن کو پہنچا دیا وہاں کوئی اُمید باقی نہ رہی۔

اسی اثنا میں انھیں میک ناٹن صاحب کا خط ملا اور اس میں مزید اس مضمون کی وضاحت ہوئی کہ علاقے کے کاغذات کی پوری مسل نواب مُعلےٰ القاب کی نظر سے مکرّر گذری اور فرمان صادر ہوا کہ حاکم سابق کی تجویز کو منظور کیا جاتا ہے۔

(مرزبان میوات) رئیس فیروز پور جھرکہ کی پیش کردہ مُہر اور دستخط صحیح ہیں۔ اور سرکار میں داخل دعوے غیر واضح اور نامکمل۔ غالب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے اور انگریزی انصاف اور عمل داری پر گہرا طنز کیا ہے اللہ اللہ اب کوئی کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

خاندان کسرا میں بھی یہ دادگستری اور انصاف پروری کہاں ہوگی۔ غالب اس فیصلے کے بعد اتنا انس سے ناراض نظر نہیں آتے جتنا انھیں گورنر جنرل سے شکایت ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے جنم جنم کی بدقسمتی تھی جس نے اس گورنر جنرل کی شکل اختیار کی یہ ان کے لیے ایک سزا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ غالب انگریزوں کے مدّاح تھے انگریز افسروں کے لیے قصیدے لکھتے تھے لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا جو سامنے نہیں آتا — وہ اس تلخ تجربے سے متعلق ہے جو پنشن کے سلسلے میں ان کا مقسوم بنا۔

اپنے ایک مکتوب میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے متعلق انھوں نے لکھا ہے۔

"اسی طرح ہمارے دور میں حاکم حقیقی اور داورِ تحقیقی نے اپنے خاص فرمان کے ذریعے میری خام طبعی، بد خصلتی اور تباہ کارانہ ہوس

پیشگی کو ایک قالب میں یکجا کر دیا ہے اور بعد ازاں اُسے آتشِ غضب میں پگھلا کر ایک ایسے انسان کی شکل دے دی ہے جو میانہ قد اور بزرگ شکم ہے۔ اس آدم صورت دیو زاد نے مجھ پر سنگِ بلا کی بارش شروع کر دی اور نتیجہ یہ کہ میرے وجودِ موہوم سے فنا کا دھواں اُٹھنے لگا۔

لارڈ مذکور نے تیسری مرتبہ دہلی میں اجلاس کیا اور اس کی خوش خبری لوگوں کے گوشِ سماعت تک پہنچائی گئی۔ شہر کے بڑے لوگ وظیفہ خوار و پنشن دار اور انگریز حکومت سے مشاہرہ پانے والے نوابانِ ریاست باریاب ہوئے عطر و پان سے ان کی تواضع ہوئی۔ غالبؔ اس دربار میں حاضر نہ ہوئے، اور ان کے احساس محرومی نے انھیں اس "ہنگامہ زار" میں شرکت سے باز رکھا۔

مولوی سراج الدین احمد کے نام غالب نے جو خطوط لکھے ہیں ان میں ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کرنل ہنیری املاک کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہ شخص بھی غالبؔ کے ہمدردوں میں سے تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے غالبؔ نے لکھا ہے۔

"انھیں دنوں میں ایک بڑے انگریز افسر نے مجھے بتلایا کہ کرنل ہنیری املاک نے بھی اس جہان گزراں کو خیر باد کہا۔ وائے برحالِ من کہ میں اس دیار میں، جو بے فرماں روا ہے پتھر سے سر ٹکرا رہا ہوں اور ناکامی کے صدمے سے جاں بلب ہوں۔ میرا دشمن صاحب جاہ و ثروت ہے اور میں تہی دست و ناتواں۔ خلقت مجھے ستانے کے درپے ہے اور ہر ایک گروہ میرے خون کا پیاسا۔" [2]

اس لئے اُس زمانہ زندگی میں غالبؔ کے ذہنی کوائف، قلبی واردات اور نفسیاتی گرہوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ —

---

[1] اوراق معانی : ص ۱۰۳ ۔ [2] اوراق معنی :

غالب اپنے اس مقدمہ سے متعلق برابر یہ سوچتے رہے کہ وہ حق پر ہیں اور ان کا یہ حق حقیقی اور تحقیقی ہے، اسی لیے وہ ادھر سے یا اُدھر سے یہ کوشش کرتے رہے کہ ان کی خاندانی پنشن سے متعلق دستاویزات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ سامنے آئیں اور ان کا حق اُنہیں ملے۔

دہلی ریزیڈینسی میں جب سرجان مالکم کی تصدیق مان لی گئی کہ مرزبان میوات کی طرف سے پیش کردہ دستاویزات صحیح ہیں اور مہریں درست ہیں تو اس پر انھوں نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

" اس سے میرے رشتہ خیال میں چند گرہیں پڑگئی ہیں جس میں سے ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ سخت اور مضبوط ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ سرجان مالکم نے اس بے نشان کے نامۂ فارسی کو باور نہیں کیا اور رپورٹ انگریزی کو زادۂ دفتر سرکاری ہے، غلط ٹھیرایا ہے۔ دوسرے یہ کہ فارسی تحریر انگریزی رپورٹ کی تنسیخ نہیں کرتی۔ تو پھر اتنی جلدی واپس کیسے لے لی گئی "

ان دونوں تحریروں کا موازنہ اور مقابلہ کیا جانا ضروری تھا کہ اس کے بعد معاملہ یک سو ہو جاتا تیسرے یہ کہ جب تحریرِ فارسی مُدّعا علیہ کو واپس کی گئی یہ نقشِ تازہ اُسی کے ذریعے روبکار بھی آیا تھا تو اس سے یہ بات کیوں نہیں کی گئی کہ اس میں مندرجہ رقم وہ وصول کرلے اور آئندہ شور مچانا بند کر دے۔

غالب نے اپنے مقدمہ کے حالات اور واقعات کے جزرومد سے گذرتی ہوئی صورت واقعہ کو مختلف وقتوں میں اس اعتبار سے ـــ قلم بند اور اس سے متعلق تأثر نامہ اپنی زبانِ قلم سے رقم کیا ہے کہ وہ ریزیڈینٹ دہلی کے رویہ سے مطمئن نہ تھے، انھوں نے اس امر کی بھی کوشش کی کہ وہ صاحب ریزیڈینٹ بہادر سے سفارش کے لیے ہنیری املاک سے خط لکھوائیں ـــ منشی النفات حسین سے بھی رجوع کیا جو ریزیڈینسی میں میر منشی تھے۔ اس سے ان کی اس ذاتی کوشش اور خواہش پر روشنی پڑتی ہے۔

اب میں رشتہ فکر کی گرہ کھولتا ہوں۔ فرماں روائے شہر سے مجھے ایک کام آپڑا ہے۔
. . . یہ لاپروا انسان ہے جس کے بارہ میں یہ فرمان ہے اس سے ہرگز اُسے کوئی مس نہیں ہوتا اور یہ سوال کرنے والے کے درد دل تک نہیں پہنچتا . . .

ذرا اس اندوہ نامہ بے اثر کے ورق پر جو اس داور دادرس کے نام بھیجا گیا ہے ایک نظر ڈالیں . . . . بارے اس التماس کا شرف قبول پانا اور میری نجات کی کوئی صورت خدام عالی کی چارہ سازی و غم خواری پر موقوف ہے . . . .

میری داد خواہی کا معاملہ ہنوز اس مرحلہ میں ہے کہ لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ نے میرے مقدمہ کے کاغذات دفتر دہلی سے طلب کیے اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے تاکہ وہ مطالعہ کے بعد کوئی آخری فیصلہ دے سکیں۔

اس کے باوجود — میرا دل کہ آئینہ دار راز ہے وہ گواہی دے رہا ہے کہ اس تفرقے کو نظر میں رکھتے ہوئے جو حکومت کے قوانین پر گہرے طور پر اثر انداز ہوا ہے نیز اس کشاکش کے باعث جو میرے سر رشتہ کار میں لگی ہوئی ہے اگر فی المثل میرے متعلق یہ حکم صادر ہو کہ مجھے قتل کر دیا جائے تو میرے لیے یہ بھی غیر متوقع نہ ہوگا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب مرکزی حکومت کی طرف سے فیصلہ آنے سے پہلے بھی مطمئن نہ تھے۔ یہ شعر گویا اسی صورت حال کی ترجمانی کرتا ہے

پہلے ڈالے ہے سر رشتۂ اُمید میں گانٹھ
پیچھے ٹھوکے ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

غالب جیسے حساس ذہن رکھنے والے انسان کے لیے یہ بڑی مایوس کن اور فکر انگیز صورت حال تھی مگر وقت کا دھارا اسی طرح اور اُسی سمت بہہ رہا تھا۔

"بزم خیال میں امیدِ موہوم کا چراغ جلائے ہوتے ہوں حاکمانِ وقت کی دادگری کی طرف سے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اب میں کیا کر سکتا ہوں "

(اوراق معانی : د ۱۰۵)

حکام کی روش کیا رہتی ہے۔ اور کون باتیں ان کے پیش نہادِ خاطر رہتی ہیں۔ خستہ خاطروں کی جاں نوازی کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے زخم دل کے مرہم کا حصول مرکز کے دارالشفاہی میں ممکن ہے بارگاہ نامرادی و پائیگاہ افسوس کا سکہ کہیں نہیں چلتا۔"

اس زمانہ میں غالب کے خیالات اور ان کے تاثرات کا عکس اُس کے اپنے جزرومد کے ساتھ ان افکار ناموں میں دیکھ سکتے ہیں جو ایک سے زیادہ خطوط میں موجود ہیں "آج کہ ماہ رجب کی ۲۱ اور جنوری کی ۱۲ تاریخ ہے ۱۸۳۰ء / ۱۲۴۶ھ جام جہاں نما میں یہ خبر چھپی کہ کلکتہ میں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ میں دوستوں کے بارہ میں متفکر ہوں کہ اب کیا کہوں کہ اضطراب کے باعث میرے دل کا کیا حال ہے۔

مقدمے میں جو واژگوں تبدیلی ہوئی، غالب نے اسے مایوس کن تصور کیا، مگر پُر امید ضرور رہے

یہ سب سن کر بھی میں مضطرب نہ ہوا۔ اور دل میں کہا کہ یہاں یہ سب ہونے دو۔ اصل زمامِ کار مردِ فرزانہ مسٹر اسٹرلنگ کے ہاتھ میں ہے جو حق پرست و حق شناس انسان ہے، وہ چارہ گری کی کوئی صورت ضرور پیدا کرے گا۔"

افادات سے بھرے مضامین میرے خاطرنشان ہو گئے ہیں اپنے بارے میں میرا گمان یہ ہے کہ میں ناکام نہ ہوں گا۔ ہاں مجھے حاکم اعلےٰ تک پہنچنا چاہیے۔ اس لیے کہ میں اپنے حقیقی اور تحقیقی حق کو جانتا ہوں۔"

"میں حاکمِ شہر کو شروع شروع میں اپنے حال پر مہربان تصور کرتا تھا اب مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس بات کو بڑھاؤں اور شکوہ سنجی کی راہ اختیار کر دوں۔"

"لطف کی بات یہ ہے کہ جتنا اس باب میں میرے لب حرف گفتگو سے آشنا ہوتے ہیں اور میں ہنگامۂ عذر و معذرت برپا کرتا ہوں میرا نفس بادیہ پیمائی میں درنگ نہیں رکھتا... جس کے بارہ میں یہ سوچا جاتا ہے کہ اس نے بہت خون جگر کھایا ہے اور زخم دل کے ٹکڑوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے اگر میں یہ چاہوں کہ اس داستان کو ورق ورق لکھ دوں تو میرا خط اتنا لمبا ہو جائے گا کہ اس کا ایک سرا کلکتہ سے جا ملے گا۔

کلکتہ تک سفر کا مرحلہ اور واپسی کی منزل اس سے بہت پہلے طے ہو چکی ہے لیکن غالب کو یہ اس طرح یاد آتی ہے جیسے کل کی بات ہو اور ان کی زندگی میں یہ لمحے اب بھی گزر رہے ہوں۔ چنانچہ اس تذکرے کے ساتھ انھوں نے ان دنوں کو بھی یاد کیا جو کلکتے میں گذارے اور وہاں کے انگریز حکّام کا وہ رویّہ بھی ان کی آنکھوں میں پھرنے لگا جس نے ان کو یہ توقع دلائی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے اور ان کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے، اس کی تلافی ہو سکے گی یہ تاثرات آج بھی ان کے ذہن کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں اور وہ ان سے باہر نہیں آسکے۔ زیرِ حوالہ خط میں آگے چل کر لکھا ہے:۔

"وہاں کے حاکموں نے بزرگی و کوچک دلی کا مظاہرہ کر کے میرے دل کو تقویت بخشی۔ انھوں نے میرے حال پر جو مہربانیاں کیں ان سے کار برآری کی اُمید پیدا ہوئی اور آوارگی کی خواہش اور بیاباں مرگی کی آرزو دل سے نکل گئی" [1]

اب یہ ظاہر ہے کہ ابتدائے کار میں بعض انگریز افسروں کے رویّہ کے باعث جو خوش آئند توقعات پیدا ہوئیں تھیں وہ رفتہ رفتہ محرومیوں کے اندھیروں میں بدل گئیں اور آخر گورنر جنرل کا فیصلہ ان کی توقعات کے خلاف ہوا۔ گذشتہ واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"میں دو سال تک اس شہر میں فروکش رہا جب گورنر جنرل نے ہندوستان کا رُخ کیا تو میں ان کے پیشا پیش دوڑ بھاگ کرتا ہوا دلی پہنچا۔ لیکن زمانہ بدل گیا حالات نے دوسرا رُخ اختیار کر لیا۔ اور تمنّاؤں کا شیرازہ بکھر گیا اب چھٹا سال ہونے کو ہے میں خانماں برباد مرگ ناگہانی کی توقع لیے ایک کونے میں بیٹھا ہوں یگانوں بیگانوں پر ملاقات کا

---

[1] اوراق معانی : ص ۱۸۶۔

دروازہ بند کر دیا۔" ¹

یہ حالات ہیں جن میں وہ اپنا وقت گزار رہے ہیں محرومیوں کے سایوں میں گھرے ہوئے ہیں لیکن آدمی کسی وقت بھی امید کا رشتہ توڑنا نہیں چاہتا۔ انھیں یہ اطلاع ملی ہے کہ عدالتِ دیوانی کی ایک شاخ آگرے میں قائم ہو گئی اور میر اعظم علی نے اپنے خط میں یہ لکھا ہے کہ غالبؔ اگر اپنا مقدمہ وہاں پیش کریں --- تو بگڑا کام بن جائے گا۔

غالبؔ اب ایسی توقعات سے دست کش ہو چکے ہیں اور اس نظامِ عدل وداد سے مزید کوئی توقع نہیں رکھتے۔ جو ایک شہر سے دوسرے شہر تک اور ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ تک ایک ہی انداز سے پھیلا ہوا ہے۔ --- انھوں نے لکھا ہے۔

"حاشا ثمّ حاشا یہ جمعیت میری پریشانیوں کو بڑھائے گی۔ مجھے اس ہنگامے سے اب کوئی علاقہ نہیں۔ اس لیے کہ عدالتِ دیوانی میرے نزدیک اس فریاد کی شنوائی کے لیے ہے ہی نہیں سربراہِ محاکمہ (گورنمنٹ) کیا وہی خود رائے اور دردمند کُش نہیں ہے میں جس کے خنجر ادا کا زخمی ہوں۔" ²

غالبؔ اس وقت صورت حال سے اتنے پریشان ہیں، اپنے بیگانوں اور زمانہ کی روش سے اتنا دل برداشتہ ہیں کہ ان کی زبان قلم --- اور زبانِ دل سے برابر انگریز گورنر جنرل کے لیے جس نے اُن کے خلاف فیصلہ دیا ہے کلماتِ بد نکلتے ہیں۔ اور وہ جب اس شخص کو یاد کرتے ہیں، بد دعاؤں سے یاد کرتے ہیں۔

زیرِ نظر خط کا خاتمہ ان سطور پر ہوتا ہے۔

"خدا اسے وہیں بٹھائے جہاں میں بدنصیب بیٹھا ہوں اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہی زمانے کے ہاتھوں وہ بھی دیکھے۔"

---

¹ اوراق معانی: ص ۱۸۶۔

² غالب کے فارسی خطوط کا اردو ترجمہ۔ ص ۱۸۷۔

غالبؔ اب بھی سوچتے تھے کہ اسٹرلنگ کی عدم موجودگی میں وہ جارج سوئنٹن بہادرؔ کا دامن پکڑیں گے۔ اب یہ وقت اور قسمت کی کتنی بڑی ستم ظریفی تھی کہ انھوں نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ مرزا نے لکھا ہے

"...... اللہ اللہ معزول نہ ہوں مگر" کول بروک" مرگ ناگہاں کا شکار نہ ہوں مگر اسٹرلنگ بہادر اور سفرِ ولایت درپیش نہ ہو مگر" جارج سوئنٹن" بہادر ان صدمات کو برداشت کرنے کے لایق نہ ہو مگر اسد اللہ داد خواہ نہ ہو۔ اب میں اسی میں مصلحت دیکھتا ہوں کہ آپ اس داوری اور داد گستری سے قطع نظر فرمائیں اور میرا وکالت نامہ . . . . واپس لے لیں۔ اور اُسے پارہ پارہ کر دیں اور ان سب سے گذر جائیں اللہ بس ماسوا ہوس۔

مقدمہ اُس کی رپورٹ اور اس سے متعلق گورنر جنرل کا فیصلہ غالبؔ کے لیے بہت ہی تکلیف دہ حقیقت تھا اور برابر اُن کا ذہن اسی زنجیر کے حلقوں میں قید رہا۔ وہ یہ توقع کرتے رہے تھے کہ گورنر جنرل جب دہلی آئیں گے تو وہ ان کے سامنے اپنا مُرافعہ پیش کریں گے۔ اور وہ کوئی ایسا فیصلہ دیں گے۔ جو زندگی بھر کے لیے اُن کے ساتھ ہونیوالی حق تلفیوں کی تلافی کر دے گا۔ مگر صورتِ حال بالکل اس کے برعکس رہی اور گورنر جنرل نے کلکتہ میں رہتے ہوئے ان کے خلاف فیصلہ دے دیا۔

غالبؔ جن توقعات کے ساتھ اس مقدمہ کی کارروائی کو آگے بڑھا رہے تھے اس میں اپنی خاندانی وجاہت اور اپنے دور کے ایک ممتاز شخص کی وراثت کا تصوّر بھی اُن کے ذہن کو ریشم کے تاروں میں الجھائے رکھتا تھا۔ اس سے آگے اور الگ وہ اپنی آمدنی میں اس کے وسیلہ سے اضافہ چاہتے تھے اور بقایا رقم تو بہت بڑی رقم تھی جس سے ان کے بڑے مسائل حل ہو سکتے تھے مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ انھیں صحیح طور پر اس کا اندازہ نہ تھا کہ حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں

لہ اوراق معانی :

اپنے مقدمہ میں غالب کو جو شکست ہوئی، سچ یہ ہے وہ ان کی زندگی کی بہت بڑی شکست تھی۔ جس کا تذکرہ بار بار اُن کی زبانِ قلم پر آتا ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں (جو اکتوبر کی گیارہ اور جمادی الاول کی چار تاریخ کو لکھا گیا ہے۔)

"میرے مقصد کے حصول کی بظاہر کوئی شکل نہیں، دہلی کی عدالت میں میرا کام بگڑ چکا ہے۔"

اب انہیں یہ خیال بھی نہیں ہے کہ اگر موت امان دے تو وہ دوبارہ کلکتہ پہنچیں اور اپنے دردِ دل کی حکایت اس جاں گداز نغمہ کی صورت میں پیش کریں کہ مُرغانِ ہوا" اور "ماہیانِ دریا" ان کے حال پر فریاد و فغاں کرنے لگیں۔ اب تو وہ برابر یہ سوچ رہے ہیں اور اس پر افسوس کر رہے ہیں کہ اگر ان کی "مددِ معاش" یہی پانچ ہزار روپے ہیں اور اسی تغیّر و تفریق کے ساتھ ثابت ہیں، جیسا کہ دفتر دارانِ سرکار کی طرف سے ثابت کیا جا رہا ہے تو پھر "صاحبان صدر" کو پہلے ہی مجھے اپنے دربار سے نکال دینا چاہیئے تھا۔ اور یہ کہنا چاہیئے تھا کہ جاؤ یا واگوئی اختیار نہ کرو، جتنا کچھ تم کو مل رہا ہے تم اس سے زیادہ کے مستحق نہیں ہو۔

میں دیوانہ تو تھا نہیں کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اِس "کشور" کی طرف واپس آتا اور اپنے قرابت داروں کے ساتھ جھگڑا کرنے کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ لیکن میں کیا کروں ساری بساط ہی اُلٹ گئی"۔

انہیں اِس بات کا بھی غم ہے کہ دہلی کے سابق ریذیڈینٹ مسٹر کول برک بہادر معزول ہو گئے۔ اور مسٹر ہاکنس ان کی جگہ آ گئے اور جو تحریر ایک سلطنت کے ہنگامہ کی برہم زنی کے لیے کافی تھی، وہ ان کے معاملہ میں بطورِ رپورٹ صدر میں روانہ کی گئی۔ وہ یہ امید کرتے رہے تھے کہ وہاں مسٹر اسٹرلنگ موجود ہیں۔ وہ میرا ضرور ساتھ دینگے مگر ابھی یہ رپورٹ راہ میں تھی کہ مسٹر اسٹرلنگ کا انتقال ہو گیا۔ اس کا ذکر انھوں نے ایک سے زیادہ موقعوں پر کیا ہے۔

غالب اپنی خاندانی پنشن کے مقدمہ میں شکست سے بہت شکستہ خاطر ہیں پھر بھی ان کے فکر و خیال کے سلسلے برابر لہروں کی طرح آگے بڑھ رہے ہیں اخبار بینی اور اور خبر نگاری سے بھی انھیں دلچسپی ہے۔ مولوی سراج الدین کے نام اپنے ایک خط میں جام جہاں نما کی روش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اس دیار کے رہنے والے جام جہاں نما کی نارسائیوں سے" بد دل ہیں۔ یوں بھی یہ لوگ اخبار بینی کا صحیح ذوق نہیں رکھتے انصاف بالائے طاعت الیسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ "جام جہاں نما" اس ہفتہ میں کوئی خبر شائع کرے اور دوسرے ہفتہ میں خود ہی اس کی تردید نہ کر دے۔ ایک ہفتے میں سرکار انگریزی کی والی لاہور سے جنگ کی بات کرتا ہے کہ موسم زمستاں کی آمد سے پہلے یہ جنگ چھڑ جائے گی اور دو ہفتے کے بعد خود ہی یہ اطلاع دیتا ہے کہ وہ خبر غلط تھی۔۔۔ اس ہفتے میں یہ خبر چھپتی ہے کہ اکبر آباد کی جامع مسجد اور روضہ تاج گنج کو اس قیمت پر فروخت کیا جا رہا ہے۔ اور دو ہفتے گزرنے پر خود ہی اعلان کرتا ہے کہ ارکان کونسل اس بیع و شرع کو جائز نہیں رکھتے۔

مولوی فضل حق خیر آبادی کی دہلی سے رخصت پر اشاعت کی غرض سے ایک خبر نامہ بھیجتے ہیں تو اس میں بہت ہی متاثر کن انداز اختیار کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ کہ جب شہزادہ ابو ظفر سے جھجھر روانہ ہونے سے پہلے آخری ملاقات کی غرض سے دربار ولی عہدی میں آئے تو شہزادے نے ان کا بڑی آداب شناسی کے ساتھ استقبال کیا اپنا دوشالہ مولانا کو اڑھایا اور آبدیدہ ہو کر کہا کہ جر ثقیل کی مدد سے بھی آپ کے لیے رخصتی الفاظ مری زبان و لب تک نہیں آسکتے۔"

غالب اپنی نگارشات نظم و نثر کو جمع کرنا چاہتے ہیں اور اس میں ان دوستوں کی مدد کے طلب گار ہیں جن کے نام انھوں نے خط لکھے ہیں۔

شیخ امیر اللہ سرور تخلص کو جو خط انھوں نے لکھا ہے اس میں اس خواہش اور اس سعی و کاوش کی طرف کچھ اشارے ملتے ہیں۔

خوشی کا موقع ہو یا غم کا، شکوے کا موقع ہو یا شکریے کا غالب کی زبان اور زبانِ قلم اس کی تصویر کشی بہترین الفاظ میں کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اس موقع پر غالبؔ نے مرزا احمد علی کا ایک فقرہ یاد کرکے اس کا کتنا گہرا تاثر لیا اور بات کا رُخ کتنے موثر انداز سے موڑ دیا۔

(اسی امیر اللہ سرور کے نام ایک خط مقدمہ پنشن سے متعلق اپنی پریشان خاطری کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے۔)

"چار سال گذرے کہ میرا مقدمہ اجلاس کونسل میں پیش ہے اور میرا دل تفرقۂ امید و بیم سے بے طرح مجروح کوئی ایسا حکم صادر نہیں ہوا جس سے یہ جھگڑا طے اور یہ قضیہ یک سو ہو گویا اندھیری رات کے ختم ہونے کا وقت ہنوز نہیں آیا۔"

ان حالات میں غالب یہ سمجھ رہے تھے کہ گورنر جنرل بہادر اپنے اختیارات خصوصی اور اپنی "حسن تمیزی" سے کام لے کر اس مقدمہ کا کوئی منصفانہ فیصلہ صادر فرما دیں گے اسی لیے وہ دہلی میں گورنر جنرل کی آمد کے منتظر تھے۔

"یہ سوچ رہا ہوں کہ جب کونسل کے رکنِ اعظم اسرف الامراء لارڈ ولیم کونڈس بنٹنگ بہادر اس دیار میں آئیں تو میں ان کا دامن پکڑوں اور ان سے انصاف کا طلب گار ہوں اور حکم آخر صادر کیے جانے کی درخواست کروں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گورنر جنرل دہلی نہیں آئیں گے۔ اور ادھر سے اُدھر اجمیر چلے جائیں گے اگر یہی ہے تو مجھ پر اور میرے حال پر ہزار افسوس ہے۔"

اس وقت غالب بہت مصروف نظر آتے ہیں وہ کسی اور طرف توجہ فرما نہیں ہوسکتے۔ نواب گورنر جنرل کی آمد آمد (ادھر اُدھر سے خبروں) کی دریوزہ گری اور فردہائے مقدمہ کی ترتیب اسی کے ساتھ اندیشہ ہائے گوناگوں ہی ان کے دماغ کو گھیرے رہتے ہیں۔

بعض حالات کی سنگینی کے باعث وہ بہت پریشان

خاطر رہتے تھے۔ غالب کے حالات کبھی تسلی بخش نہ تھے نہ اس زمانہ میں اور نہ اس کے بعد۔
چونکہ طبیعت میں صاف گوئی تھی اس کی وجہ سے ان حالات اور خیالات کو بھی
انھوں نے اپنے خلوص خاطر کے باعث اپنے بعض مکتوبات میں لکھ دیا اور ان پر
کوئی پردہ نہیں ڈالا۔ اور بے تکلّف اس سچائی کا اظہار کر دیا۔
"میرے قرض خواہوں میں سے دو آدمیوں نے میرے خلاف عدالت سے ڈگری
لے لی اب یا تو ڈگری میں مندرج رقم حسب قاعدہ ادا کی جائے یا پھر
قرضدار قید و بند کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے اس باب میں شاہ و گدا
برابر ہیں۔ سربرآوردہ لوگوں کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ کچہری کا سپاہی
گھر پر جا کر انہیں گرفتار نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ کہیں راہ میں نہ ملیں۔"

فریزر کا قتل اور نواب شمس الدین احمد خاں

اسی خط میں ولیم فریزر کے گولی مار کر ہلاک کر دینے کا ذکر بھی ہے اور اسی کے ساتھ
غالب کے قلم سے اس کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ اس زاویہ نشینی کے زمانہ میں کہ میری
پرواز بوم کی طرح صرف رات کے وقت میں ممکن تھی، میں گاہ گاہ اس سے ملنے جاتا
تھا صاحب مجسٹریٹ مجھ سے واقف تھا۔
(جس کے یہ معنی ہیں کہ غالب ایک اور تازہ آفت کا شکار ہو گئے۔)
غالبؔ ان مسائل اور معاملات میں اُلجھے ہوئے تھے اور یہ سوچ رہے تھے
کہ کیا کیا جائے اور کیسے کیا جائے کہ ایک دوسری اُلجھن سامنے آگئی۔ جس کا کوئی
سان گمان بھی ان کو نہیں گزر سکتا تھا کہ رئیس فیروز پور جھرکہ و لوہارو نوّاب
شمس الدین احمد خاں (جو نواب احمد بخش خاں کے بعد ریاست کے والی بنائے
گئے تھے) ان کا ولیم فریزر سے کہ اس وقت ریذیڈینٹ دہلی تھے کسی ذاتی معاملہ
میں سخت اختلاف ہوا۔ اور انھوں نے فریزر کو قتل کروا دیا۔
یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا کہ ریذیڈینٹ دہلی قتل کرا دیا جائے اور کسی

ریاست کا اور انگریزوں کا بنایا ہوا اور منظور کیا گیا رئیس اس سازش میں شریک ہو۔

مالک رام صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس کی تفصیلات پیش کی ہیں اور ذکرِ غالب کے ایک نئے ایڈیشن میں بھی اس سے متعلق بعض اُمور کو نقل کیا ہے۔

غالبؔ نے اپنے ایک خط میں جو شیخ امام بخش ناسخؔ کے نام ہے۔ اِس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"کسی ظالم خدا نا ترس نے کہ ہمیشہ کے لئے عذابِ ابدی میں گرفتار رہے۔ ولیم فریزر صاحب بہادر ریذیڈینٹ دہلی کو جو غالبؔ مغلوب کے مربیوں میں سے تھے شبِ تاریک میں بندوق کی گولیوں سے ہلاک کر دیا۔"

اِس ضمن میں اپنے نام سے غالبؔ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس واقعے سے گہرے طور پر متاثر ہوئے، ان کے اپنے الفاظ میں "دل بے قابو ہوگیا۔ اور میرے حال وخیال پر غم و اندوہ کے بادل چھاگئے۔ آرام وراحت کا خرمن بے طرح جل گیا اور وقت نے صفحۂ دل سے نقشِ اُمید کھُرچ کر پھینک دیا۔

" قضارا جو نشان بتائے گئے اور اس بنیاد پر، جو غلط نہیں تھی ایک سوار کو جو والئ فیروز پور کے ملازموں میں سے ہے اس ستودہ صفات شخص کے قتل کے جُرم میں پکڑا گیا ہے۔"

آگے چل کر غالب نے پھر یہ لکھا ہے کہ "شہر کے صاحب مجسٹریٹ بہادر نے کہ پہلے سے مجھ سے واقف تھا . . . . جب یہ واقعہ پیش آیا تو حقیقتِ حال تک پہنچے اور اس پر پڑے ہوئے بہت سے اسرار کی پردہ کشائی کی غرض سے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔"

غالبؔ سے نواب شمس الدین کے اختلاف ولیم فریزر اور صاحب مجسٹریٹ بہادر سے دوستی کے باعث لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مُخبری غالب نے کی ہے۔ انھوں نے اپنے زیرِ نظر خط میں اِس سے متعلق بعض تفصیلات کو پیش کیا ہے۔

" والیٔ فیروز پور مجرم قرار دیا گیا اور سرکار کے حکم سے اس کے چند ساتھیوں کے ساتھ اُس کی گرفتاری عمل میں آئی اور سرکاری پولیس اس کی جاگیر پر جا کر بیٹھ گئی۔[1]

" چونکہ میرے اور اس کے درمیان نا اتفاقی چل رہی تھی اور شہر کے لوگ اس سے واقف تھے سب کے سب میرے مخالف ہو گئے اور اس کافر نعمت کی گرفتاری کو جس نے اپنے محسن کو مار ڈالا تھا میری طرف سے مخبری کا نتیجہ قرار دیا ——— غالبؔ نے مزید لکھا ہے مردمانِ شہر خاص و عام یہ واہمہ رکھتے ہیں کہ نواب شمس الدین احمد خاں بے گناہ تھے فتح اللہ بیگ خاں اور اسد اللہ خاں نے انگریزوں کو اس کے خلاف بھڑکایا اور اس کے حق میں چند جھوٹی سچی باتیں لگا کر اس بچارے کو عذاب میں مبتلا کر دیا۔"

" مختصر یہ کہ قصہ وہاں تک پہنچ گیا کہ مجھ پر لعنت و ملامت دلّی کے یا وہ گویوں کا وظیفۂ لب بن گیا۔ آغاز میں تو ولیم فریزر بہادر کے قتل ہی کا افسوس تھا آخر کار قاتل متشخص ہو گیا تو بدگمانانِ شہر نے مجھے عاجز کر دیا۔"

اس سے اُس ذہنی ماحول کا پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ دہلی میں اس وقت کس طرح کی افواہیں گشت کر رہی تھیں اور غالبؔ کو لوگ کس نظر سے دیکھ رہے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ کو ولیم فریزر سے ہمدردی تھی۔ وہ اسے اپنا محسن اور مربّی تصور کرتے تھے اور نواب شمس الدین احمد خاں کے بارے میں یہ دعا کرتے تھے کہ خدا اس فتنہ جو اور بے آزرم کو جلد سے جلد اس کے کیفر کردار تک پہنچائے اور اِس سربلندی کے طالب کو فرازِ دار نصیب ہو۔

غالبؔ نے اسی خط میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ماہ صفر کی ۱۷ تاریخ کو دوشنبہ کے دن الہ آباد کے حکامِ شہر میں سے ایک حاکم اِس دیار تک پہنچا اور گورنر جنرل

[1] اوراق معانی : ۱۴۷ ———

بہادر کی طرف سے اس اَمر پر مامور کیا گیا کہ وہ حُکّام دہلی کی تحقیقات کے خلاصہ کو مزید گہری نظر سے دیکھے اور ثبوت جُرم کے بعد سزا دہی کی قرار داد کو مرحلہ بہ مرحلہ بروئے کار لائے اس ہنگامہ کا یکسو ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ یہ ایک ماہ سے زیادہ طول کھینچے۔"

(نواب شمس الدین کو پھانسی دیدی گئی۔

اپنے ایک اور خط میں جو ناسخ ہی کے نام ہے، غالب نے یہ اطلاع فراہم کی ہے۔

"اس دیار کا ماجرا یہ ہے کہ جاگیر دار فیروز پور کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور اس کی جاگیر اور متعلقاتِ جاگیر بہ حق سرکار ضبط ہوئے لیکن ہنوز ایسا کوئی حکم صادر نہ ہوا کہ تمام مراتب اور سارے قوانین کا جامع ہو۔ اس کے بعد یہ ماجرا صدر گاہِ کلکتہ پہنچے گا۔ اس باب میں تب احکامات صادر ہوں گے۔" [1]

غالب کو پریشانی یہ تھی کہ وہ بھی اس جاگیر میں انگریز سرکار کے حکم کے مطابق وثیقہ دار تھے۔ اور اب ان کے لیے یہ پریشانی تھی کہ دیکھئے انگریز حُکّام اُن کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے ہیں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جاگیر دار فیروز پور کی طرف سے جو وظیفہ انہیں ملتا تھا وہ اس سے بہت کم تھا، جو ملنا چاہیئے تھا۔

اب صورت حال کی تبدیلی کے بعد بھی انہیں اتنا ہی ملے تو وہ اس پر ہرگز قانع نہ ہوں گے۔ مختصر یہ کہ پیچ در پیچ اور "گرہ در گرہ" بات تھی اِس میں اُن کے ذہن کا اُلجھنا اس وقت ایک فطری امر تھا۔ وہ توقع تو یہی رکھتے تھے کہ اب انہیں کچھ زیادہ ملے گا مگر ایسا ہوا نہیں۔

نواب شمس الدین احمد خاں کے پھانسی پانے اور ریاست و متعلقات ریاست کی بحق سرکار ضبطی۔ ایک اہم واقعہ تھا مگر یہ غالب کے لیے کوئی شادمانی کا موقع بھی نہ تھا۔

جس زمانہ زندگی میں نواب شمس الدین احمد کا واقعہ پیش آیا اور اس عہد کی تاریخ کی ایک روداد بن گیا۔ جو ان کی اپنی زندگی اور ذہن سے بھی ایک نفسیاتی رشتہ رکھتا تھا۔

[1] اوراقِ معانی :

غالب کے لیے یہ ذہنی پریشانیوں کا دور ہے اور خاص طور پر مقدمے میں اپنے حریف سے ہار جانے کا انھیں بے حد ملال ہے، وہ اس کا ذکر خود اپنے سے کتنی بار کرتے ہوں گے یہ تو ہم نہیں جانتے، لیکن اپنے دوستوں سے تو وہ بار بار اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ ایک داستان ان کے لیے ہزار کہانیوں میں بدل گئی ہے
میر اعظم علی مدرس مدرسۂ اکبر آباد کو انھوں نے ایک عرصے کے بعد جو نگارش نامہ تحریر کیا ہے، اس میں اپنی زندگی کے مختلف مرحلوں کو یاد کیا ہے اور میر اعظم علی کی یاد آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"میں اپنے مخدوم کی جنبشِ خامہ پر ناز کرتا ہوں جس نے نفسِ عیسوی کی طرح میری آرزوؤں کو زندہ کر کے میرے سوادِ خاطر کو عرصۂ محشر میں بدل دیا . . . دیرینہ عنایت کے کانٹے دلِ پُر آرزو سے نکل گئے اور یاد آیا کہ کبھی اس دنیا میں اب سے پیشتر میرا بھی کوئی وطن تھا اور میرے مہربانوں کی بھی ایک انجمن تھی۔ کیونکہ آپ نے پرسشِ احوال کا نشتر رگِ جاں میں پیوست کر دیا اب آپ کو معلوم ہوگا کہ میری خوں نابہ فشانیاں بھی دیدنی ہیں۔" [1]

اس آغاز سے پتہ چلتا ہے کہ میر اعظم علی کا خط دیکھ کر غالب کو آگرے کی فضا اور وہاں گزاری ہوئی زندگی کے شب و روز یاد آگئے آگرہ میں ان کے بہت اچھے دوست بھی تھے جن کے مجمعے کو وہ اپنے مہربانوں کی انجمن سے تعبیر کرتے ہیں۔
میر صاحب سے اپنی جدائی کو وہ ۲۰ سال کا عرصہ قرار دیتے ہیں جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ گذشتہ بیس سال سے شہر دہلی میں رہ رہے ہیں۔ مرزا کی شادی ۱۳ برس کی عمر یعنی ۱۸۱۰ء عیسوی میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے دہلی آنا جانا شروع کر دیا ہوگا۔ لیکن مستقل سکونت کا مرحلہ کچھ بعد کی بات ہونی چاہیے۔

[1] اوراق معانی: ۱۸۵

"سوائے آرزوئے مرگ کے اور کسی بات سے دل آسودہ نہیں ہوتا اور اہل دنیا سے اب میں کسی حُسنِ سلوک کی توقع نہیں رکھتا غالب مغلوب کے دل مجروح کے ہزار ٹکڑے ہو چکے ہیں، ان میں سے ایک یہ ٹکڑا ابھی ہے۔"

یہ صورت بظاہر غالب کو ہمہ وقت افسردہ خاطر و شوریدہ بنائے رکھتی ہے وہ کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ شعر و شاعری کی طرف بھی بظاہر نہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خط ہو یا دوسرے خطوط، ان کا انداز اور اسلوب نگارش جگہ جگہ ان کے حُسنِ گفتار اور لطف اظہار کے نمونے پیش کرتا ہے موقع بہ موقع شعر و سخن کی باتیں بھی ان کے زبان قلم پر آتی ہیں، دوسروں کی دل دہی اور پاس داری کا بھی انھیں خیال رہتا ہے ـــــ

نواب شمس الدین احمد خاں کے پھانسی چڑھ جانے کے واقعہ کے بعد جب ریاست لوہارو کی بحالی اور واگذاری کے لیے نواب امین الدین احمد خاں نے کلکتے کا سفر کیا تو انھوں نے اپنے دلی دوست مولوی سراج الدین احمد کو اس سلسلے میں ایک سے زیادہ خطوں میں یاد دہانی کرائی کہ وہ ہر طرح ان کی خاطر داری کریں اور ان کا خیال رکھیں۔ یہ فکر و خیال کا اُتار چڑھاؤ ہے جو ان کی زبانِ نطق پر آتا رہتا ہے۔

انھوں نے اس ضمن میں جو الفاظ سپرد قلم کیے ان کے لفظ لفظ سے اس خلوص خاطر کا اظہار ہو رہا ہے۔

"فی الجملہ اس نامہ نگاری سے مدّعائے ضروری اظہار صرف اتنا ہے کہ برادرم نواب امین الدین احمد خاں بہادر ابن نواب فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ کو اس موجِ بلا کے تھپیڑوں نے دل شکستہ بنا دیا۔ اور ان کے خانۂ جاں کو سیلابِ فنا کے سپرد کر دیا ہے خونِ وفا میری گردن پر ہے کہ میں ان کی ہمراہی سے باز ہوں۔"

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے میری درماندگی اور بے چارگی کو اس سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ میں خونِ جگر کھاتا رہوں اور امین الدین

احمد خاں بہادر کو تنہا سفر کے لئے چھوڑ دوں، جتنا اس باب میں میرے لب حرفِ گفتگو سے آشنا ہوتے ہیں اور میں ہنگامہ عذر و معذرت برپا کرتا ہوں اتنا ہی میری شرمساری بڑھتی ہے اور میرا احساس ندامت سر جھکائے رکھتا ہے۔"

اس سلسلے میں انھوں نے کئی مرتبہ توجہ دلائی ہے ایک اور موقعہ پر لکھا ہے۔
"میری درماندگی کا تو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں ان کا ہمسفر بھی نہیں ہوں۔
امین الدین احمد خاں کی تعریف بھی اسی خط میں آئی ہے۔ اور لکھا ہے "میں ان کے چہرۂ روشن میں اپنی دنیائے آرزو کا عکس دیکھتا ہوں اور ان سے ملاقات کو اپنی زندگی خیال کرتا ہوں، اب میں ان کی عدم موجودگی میں۔ اپنی زندگی سے کاہے کو پیار کروں اور اپنے دل کو کس کے دیدار سے شادمانی بخشوں"
خوشگواری اور رویے کی یہ شگفتگی اس اعتبار سے اور بھی اہم ہے کہ غالب کے تعلقات نواب احمد بخش خاں سے آخری وقت میں کافی کشیدہ ہو گئے تھے۔ نواب امین الدین آخر اُن ہی کے بیٹے تھے۔

اس سے بہر حال رشتے داری ۔ اور قرابت داریوں کے مراسم و معاملات کی نزاکتوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور غالب نے بھی انھیں اور رشتے دارانہ روابط کی پاس داریوں کو سمجھنے اور آپسی تعلقات کو نباہنے کی سعی کی۔

خود نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں سے غالب نے مخلصانہ اور ہمدردانہ روابط رکھے ضیاء الدین احمد خاں تو غالب کو اپنا استاد اور ادبی رہنما خیال کرتے تھے۔ اور یہ دونوں بھائی بہر حال نواب احمد بخش کے بیٹے تھے۔
موخر الذکر کو غالب کے کلام کی جمع آوری اور ترتیب سے خاص دلچسپی تھی، ان دونوں بھائیوں سے زیادہ یہ نفسیاتی پیچیدگی داغ کے اور ان کے باہمی تعلقات میں تھی، وہ نواب شمس الدین احمد خاں کو اپنا دشمن قرار دیتے تھے اور داغ ان کے بیٹے تھے۔

گورنر جنرل کی آمد اور دہلی میں اُن کے ورود سے متعلق تذکرہ ایک سے زیادہ خطوط میں آتا ہے یہ ۱۸۴۰ سے کافی پہلے کی بات بھی ہوسکتی ہے اور اس کے بعد کی بات بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب کلاں بہادر ریزیڈینٹ دہلی کا دفتران کی اور ان جیسے دوسرے داد خواہوں کی راہ میں دشواریوں کا سبب بنتا رہا ہے اسی لیے وہ نواب گورنر جنرل بہادر کی آمد کے منتظر رہتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار تمیزی سے کام لے کر اس مسئلے کو طے کر دینگے۔

" مخفی نہ رہے کہ لارڈ ولیم کو نڈس بٹنگ بہادر ماہ مارچ کی چھبیسویں[۲۶] تاریخ کو اس دیار میں پہنچے اور کوٹھی ریذیڈینسی میں فروکش ہوئے دو روز کے بعد لشکر و بازار لشکر کی جمعیت درھم برھم ہوگئی اور لوگوں کو رخصت ہو جانے کی اجازت دے دی گئی اور خیام خاصہ کی شملہ کی سمت روانگی عمل میں آئی۔"

" سکرتر صاحبان نے شہر میں طرح اقامت ڈالی اس سے موکب گورنری کی نقل و حرکت کے بارے میں ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں کیا ہوتا تھا اور کیسے ہوتا تھا اس میں ایک اہم اطلاع یہ بھی ہے کہ شاہ دہلی نے نواب عالی جناب سے ملاقات نہیں کی۔

صاحب سکرتر بہادر ریذیڈنٹ دہلی کی ہمراہی میں بارگاہ خسروی میں حاضر ہوئے اور مختارانِ شاہی نے گورنر کے حضور میں باریابی حاصل کی۔

اس وقت یہ دوری اور اس کا ذہنی پس منظر پوری طرح واضح نہیں ہوتا لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لارڈ ایلن برا، ۱۸۴۲ء میں دربار شاہی میں ملاقات کے لیے جانا چاہتے ہیں تو انگریز سرکار کی طرف سے یہ شرط رکھی جاتی ہے کہ مغل شہنشاہ گورنر جنرل کو اپنے برابر میں کرسی دیں۔ آخری مغل شہنشاہ اپنی تمام مجبوریوں کے باوصف اس سے انکار کر دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ لارڈ ایلن برا کمپنی کے ملازم ہیں اور کمپنی کو جو اختیارات حاصل ہیں وہ مغل شہنشاہ کے دیے ہوئے ہیں ایسی

صورت میں کمپنی کا کوئی ملازم چاہے وہ کتنا ہی صاحب اختیار و اقتدار ہو مغل شہنشاہ
کے برابر کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا۔ لارڈ ایلن برا نے اس کو اپنے حق میں ایک توہین آمیز
سلوک تصور کیا اور کمپنی کے ملازموں کی طرف سے شاہی خاندان اور اس کے ساتھ
روایتی برتاؤ کا سلسلہ اور زیادہ غیر روایتی ہو گیا۔

غالبؔ کے خط اور بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ مغل شہنشاہ اور گورنر
جنرل کے درمیان یہ دستوری نزاع کافی دن تک چلتا رہا۔ بہر حال اس موقعہ پر جیسا کہ
غالبؔ نے اپنے خط میں اطلاع دی ہے ماہ اپریل کی پانچ تاریخ کو اذنِ باریابی ملا۔
تو اہل شہر نے گروہ در گروہ اور پایہ بہ پایہ کورنش بجالانے کی سعادت پائی۔ چونکہ
سلیقۂ منع و دورباش باقی نہ رہا تھا اور قرار واقعی طور پر سرزنش بھی نہیں تھی۔ اس
لیے جس نے چاہا نذر گذرانی اور جس نے چاہا صرف آداب اور رسوم کورنش بجالایا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گورنر جنرل کی بارگاہ میں حاضری کے آداب بھی وہی
تھے جو یہاں کے بادشاہوں اور والیان ریاست کے درباروں کے تھے۔

اور اسی طرح دربار آراستہ بھی کیے جاتے تھے۔ حاضر ہونے والے ممتاز شہریوں اور جاگیرداروں
کا بھی غالبؔ نے تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے۔

"پہلی بار نواب فیض محمد خاں بہادر مرزبان جھجھر نے اپنے بھائی اور بیٹے کے ساتھ
سعادت باریابی حاصل کی ایک سو ایک اشرفیاں بطور نذر پیش کیں، قبول پیش کش کے بعد
خاتم الماس سے سرفراز کیے گئے بعد ازاں دوسرے جاگیرداروں کو رخصت باریابی عطا ہوئی۔
نواب امین الدین خاں، اکبر علی خاں اور دوندے خاں ان کے بعد امرائے شاہی زعمائے
شہر وکلائے اطراف اور کارگذاران دفتر سرکاری باریاب ہوئے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس ہنگامے
میں میر حامد علی خاں داماد میر فضل علی خاں بہادر نے سعادت ملازمت پائی۔ اور بیس
اشرفیاں بطور نذر گذرانیں اور عطائے انگشتری سے سرفراز کیے گئے"۔

غالبؔ شکستہ خاطر ہیں ان کو محرومی دربار کا افسوس ہے لیکن ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر جو نقش
ثبت کر رہا ہے وہ دہلی کی تہذیبی اداشناسی کی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

اور اس طرح اس ماحول کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے غالب جس میں سانس لے رہے تھے۔ ان کے ایک سے زیادہ خطوط جو اس دور میں لکھے گئے نواب گورنر جنرل کی آمد اور دہلی میں ان کے ورود کے انتظار کا ذکر ہے ایک خط میں اس دربار کا ذکر ہے جس میں غالب نے شرکت نہیں کی لیکن ان کا ذہن برابر اس جلسے میں شریک رہا اور ان کی آنکھیں اسے دیکھتی رہیں۔

" مخفی نہ رہتے کہ لارڈ ولیم کونڈس بیٹنگ بہادر ماہ مارچ کی چھبیسویں تاریخ کو اس دیار میں پہونچے اور کوٹھی ریزی ڈینسی میں فروکش ہوئے دو روز کے بعد لشکر و بازار لشکر کی جمعیت درہم برہم ہو گئی لوگوں کو رخصت ہو جانے کی اجازت دے دی گئی اور خیام خاصہ کی شملہ کی سمت روانگی عمل میں آئی۔ سکتر صاحبان نے شہر میں طرز اقامت ڈالی" اس سے موکب گورنری کی نقل و حرکت کے بارے میں ہم کچھ سوچ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں کیا ہوتا تھا اور کیسے ہوتا تھا اس میں ایک اہم اطلاع یہ بھی ہے کہ شاہِ دہلی نے نواب عالی جناب سے ملاقات نہیں کی۔ جیسا کہ اشارہ کیا گیا..........

...... اس کا اپنا ایک پس منظر ہے اور اس دور زندگی کی ادا فہمی اور مزاج دانی کے لیے ضروری ہے ۱۷۶۱ء بکسر کی لڑائی کے بعد انگریز کمپنی کے اختیار و اقتدار کا دائرہ کچھ اور وسیع ہو گیا تھا اس سے پیشتر پلاسی کے محاصرہ کے نتیجہ میں بنگال کی دیوانی کمپنی کے دائرۂ کار و اختیار میں آ گئی تھی۔ یہ ایک سطح پر مغل شہنشاہ کی تفویض کردہ تھی۔ بکسر کے بعد آنے والے چالیس پینتالیس سال لارڈ لیک کی کمان میں پیش قدمی کرتی ہوئی انگریزی افواج نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ دہلی کے ساتھ آگرہ بھی مرہٹوں سے چھین لیا کہ عملاً ان دونوں شاہی شہروں پر ان کا تسلط تھا۔ بادشاہ شاہ عالم ثانی کمپنی کی پناہ میں آ گئے اور وثیقہ دار ہو گئے مگر مغل شہنشاہ اب بھی دستوری طور پر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔

غالب نے قاضی محمد صادق خاں (اختر جوناگڈھی) کے لیے شامل تذکرہ کرنے کی غرض سے جو شعر منتخب کر کے بھیجے تھے ان کے ساتھ اپنے خاندان کا یہ تاریخ نامہ بھی لکھ کر روانہ کیا تھا۔

"میں اپنی اصل آفرینش میں اس گروہ کی نسل سے ہوں جس کی خوش بختی کا سورج عرصہ ہوا ڈھل چکا ہے اور اس طرح میں اس جماعت کے حلقہ میں شامل ہوں، قسمت نے جس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اس پر اب قرن بیت رہے ہیں۔"

میں ایک ستم زدہ شخص ہوں جس نے کبھی فرخی وفیروزی کا منہ نہیں دیکھا ارزش سخن میری پیشکش ہے میں ترک نژاد ہوں اور میرا نسب نامہ افراسیاب ادزادشم سے جا کر مل جاتا ہے۔

میرے اجداد اس وجہ سے کہ سلجوقیوں کے ساتھ رشتہ ہم گوہری رکھتے تھے ان کے دور میں انہوں نے سپہ گری وکشور کشائی کا پرچم بلند رکھا۔ جب اس گروہ کی جاہ مندی وخوش نصیبی کا دور دورہ ختم ہوا اور بے نوائی ونا پذیرائی کے زمانہ آگیا تو ان میں سے ایک جماعت رہزنی وقزاقی کی طرف مائل ہوگئی۔ اور ایک نے کشاورزی وزراعت پیشگی کو اپنا وسیلۂ معاش قرار دیا۔ میرے اجداد کی آرامش گاہ توران کا شہر سمرقند تھا۔ ان لوگوں میں سے میرا دادا اپنے باپ سے ناخوش ہوکر عازم ہندوستان ہوا اور لاہور میں نواب معین الملک عرف مرزا منو کی ہم ہی اختیار کی جب معین الملک کی بساط بھی وقت نے الٹ دی تو میرے جد بزرگوار نے دہلی کا رخ کیا اور ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں سے رسم وراہ پیدا کی اس کے بعد شاہجہاں آباد میں میرا باپ عبداللہ بیگ خاں عالم وجود میں آیا میری پیدائش اکبر آباد میں ہوئی۔۔ میری عمر پانچ سال کی ہوگی کہ شفیق باپ کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے چاہا کہ ناز ونعم کے ساتھ میری پرورش کرے تو اُسے اجل نے امان نہ دی۔۔

مجھے اس ویرانہ آباد میں تنہا چھوڑ دیا اور یہ حادثہ کہ میرے لیے جان گدازی کا نشان اور آسمان کے لیے دشمنی نکالنے کا وقت تھا ۱۸۰۶ء، ۱۲۲۱ھ میں پیش آیا ——

اور جنرل لارڈ لیک بہادر کی لشکر آرائی وکشور کشائی کے ہنگامے کے دوران ہوا۔"

غالب دعوا کرتے ہیں کہ اور نہ کسی کے احسان کا لبادہ ان کے دوش پر ہے۔"
جس کے یہ معنی ہیں کہ فنِ شعر میں انھیں کسی سے شرفِ تلمذ حاصل نہیں تھا۔
اگر غالب کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے اور اس سے انکار بھی پُر وثوق سطح پر آسان نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فنِ شعر اور حصول درسیات۔ یا علومِ متداولہ کے معاملہ میں بیشتر اپنی فطری صلاحیتوں ہی کے مرہونِ منّت رہے۔
ان کے خاندان میں کوئی علمی روایت بھی نہیں تھی وہ خود پیدائشی طور پر ادیب اور شاعر تھے۔

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

یہ بات بھی اپنی جگہ ایک معنی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک معنویت رکھتی ہے کہ ان کے اعزا و احباب میں، مفتی صدر الدین آزردہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں اور مولوی فضلِ حق خیرآبادی جیسے صاحبانِ فکر و فن موجود تھے، جن کے اثر و تاثر کو فی الجملہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

وہ اپنے دوستوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور مولانا فضل حق خیرآبادی تو اُن کے بہت ہی محترم دوستوں میں ہیں ان کو وہ علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت کے اعتبار سے اس طرح کے ادیبوں اور عالموں میں گنتے ہیں کہ بقول غالب وہ ان جیسے یک صد اور عرفی جیسے صد ہزار اصحابِ سخن کی پرورش کر سکتے ہیں۔ غالب نے عرفی کی زمینِ ادب آئین میں ایک معرکتہ الآرا قصیدہ حمد و ثنا میں کہا تھا۔

اے زدہم غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتۂ خود حرف و خود را در گماں انداختہ

اور اس کی داد مولانا فضلِ حق سے چاہی تھی۔[1]

---

[1] اوراقِ معانی: ص ۱۲۹۔

" سپہ سالار انگلشیہ نے آفتاب کے خوں بہا کے طور پر ہم فقیروں کے کلبہ افسران کے لیے چراغ اور ہم بے نواؤں کے تئیں جاگیر کے عوض مشاہرہ مقرر کیا اور فکرِ معاش و خار خارِ جستجو سے فراغ بخشا اب کہ زندگی کی نفس شماری کا نشان چالیس اور چار چوالیس پر پہنچ گیا ہے اس وظیفہ پر خوش ہوں اور اس آمدنی پر قناعت کیے ہوئے ہوں۔ (۱۸۴۱ء)"

" فنِ شعر میں مجھے مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے شرفِ تلمذ نہیں۔ میں سواد معنی کو اپنے گو ہر جاں کی روشنی سے فروغ بخشتا ہوں اور اس معاملے میں میری گردن کسی کے بارِ منت سے خم نہیں ہے اور نہ کسی کے احسان کا لبادہ میرے دوش پر ہے۔"

آخر میں لکھتے ہیں "خط ختم ہوگیا اور پراگندہ گوئی و دراز نفسی کی شرم مجھ پر غالب آگئی دیدہ ور جانتے ہیں کہ میرے پاس سخن ہائے گفتنی بہت ہیں لیکن اس افسانۂ پریشاں کو کہاں تک طول دیا جائے میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں مختصر کہوں اور سلسلۂ گفتگو دراز نہ ہو اس پر نگاہ رکھوں۔"

جس کے یہ معنی ہیں کہ غالبؔ نے یہ خط ۱۸۴۱ء میں سپردِ قلم کیا ہے ان کا سال پیدائش ۱۷۹۷ء ہے تو چوالیس برس کی عمر ۱۸۴۱ء میں ہوئی اس وقت تک انھیں اپنے خاندانی پنشن کے جھگڑوں سے اس معنی میں نجات مل گئی ہے کہ وہ ان کے تئیں وجہ پریشانی نہیں رہے، جو بھی صورت حال ہے انھوں نے اس پر صبر کر لیا ہے اور جو رقم ان کو مل رہی ہے وہ اس تحریر کی حد تک اس پر قناعت کیے ہوتے ہیں۔ اور مقدمہ و مرافعہ کی کشمکش سے انھیں نجات مل گئی ہے۔

غالبؔ کے مکتوبات کسی نہ کسی زاویے سے ان کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس طرح سے ان کا قلم اپنا سوانح نامہ لکھتا جاتا ہے اب یہ الگ بات ہے کہ اس کی کوئی مربوط شکل نہ ہو پھر بھی ان کے اپنے جو حالات اور خیالات ہیں اس معاشرے اور اس معاشرت کا جو منظر نامہ ہے اس کا ایک جیتا جاگتا عکس یہ بھی ہے۔

اسی زمانے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنا مشہور تذکرہ "گلشن بے خار" بھی لکھا تھا اور اس کے اَجزاء اشاعت سے پہلے غالب کے پاس "ملاحظۂ نظری" کے لیے بھیجے گئے تھے۔

غالب نے اس کے لیے حرف ستائش کے طور پر تقریظ بھی لکھی تھی' اس زمانے میں مرزا علی بخش بہادر رنجور تخلص جے پور سے آئے ہوئے تھے اور مرزا کے یہاں مقیم تھے۔ غالب نے دہلی ریزیڈنسی میں اپنے معاملے میں سلسلہ جنبانی کی طرح بھی ڈالی تھی کہ نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں شامل ان کی مددِ معاش سے متعلق ایک گونا الجھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی تذکرے کے اجزاء دیکھ کر انھوں نے واپس کیے تو اس میں شامل کرنے کی غرض سے ایک دوست کا ذکر کیا اور یہ کہا کہ ان کا ترجمہ تذکرے میں شامل ہونا چاہیے' یہ صاحب مرزا احمد بیگ تھے جن سے دوستی کا حقِ وفاداری غالب نبھانا چاہتے تھے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں تھے اور اُن کی روح بہشت میں آسودہ تھی۔

اس ضمن میں غالب نے جو لکھا ہے وہ مرزا احمد بیگ سے متعلق غالب کی ایک اہم تحریر کے درجہ میں آتا ہے۔

مرزا احمد بیگ خاں ابن باری بیگ خاں کو میں نے کلکتہ میں دیکھا تھا، ریختہ کہتا تھا اور تپاں تخلص کرتا تھا سخن سنجی کے آداب مرزا جان تپش سے سیکھے تھے یہ برگزیدہ شخص جن کی میں نے یہ تعریف کی ہے' میرے اَحباب اور مخلصین میں تھا۔

نواب احمد بخش خاں مرحوم کی زوجہ کا بھائی تھا سر بزم میرے ساتھ محبت پیشگی میں ہم دل و ہم زبان تھا اور اپنائیت کے آداب بجا لاتا تھا۔ ادب اور شعر سے دلچسپی رکھتا تھا — فن شاعری میں سادہ گو تھا کلکتے میں جاہ مندانہ زندگی گذارتا تھا۔ چار سال ہو گئے کہ وہ دنیا سے رخصت ہوا اور اپنے مرجعِ اصلی کی طرف لوٹ گیا۔"

غالب نے آگے چل کر مزید لکھا ہے۔

جب وہ کلکتے میں تھے اور مرزا احمد بیگ نے یہ سنا تھا کہ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور ریختہ گویوں کا تذکرہ لکھ رہے ہیں تو مرحوم نے اپنے نتائج طبع کا کچھ حصہ

ان کو دیا تھا تاکہ جب وہ دہلی جائیں تو ان اوراق کو ..... کے سپرد کر دیں، غالب نے دہلی پہنچ کر ایسا ہی کیا اور راعظم الدولہ ان سے ملاقات کو آئے تو وہ صفحات ان کے سپرد کر دیے گئے اور ان کا پیام بھی ان تک پہنچا دیا۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ بقول غالب سرور مرحوم نے ان کی بات کو بھلا دیا اور اپنے تذکرے میں اس آرزومند کے ذکر سے اُن کے لب خاموش رہے، افسوس یہ ہے کہ اس کے کلام سے بھی کوئی شعر اس وقت یاد نہیں۔" [1] ——— اس کے بعد غالب نے بات کا رُخ ——— اُن کے فراقِ دائمی کی طرف موڑ دیا۔ [خط بنام مولوی سراج الدین احمد]

"میرا یہ دوست کہتا تھا کہ میں دہلی آرہا ہوں، مگر اس وعدہ فراموش اور بے مروّت شخص نے اثنائے راہ میں اپنی منزل سفر کو بدل دیا اور سواری کے ناقہ کا رُخ راہ عدم کی طرف موڑ دیا۔

مانا کہ اُسے دوستوں کی خاطر داشت منظور نہ تھی اپنے خورد سال بچوں کا بھی خیال نہیں کیا اور ان کے سر سے اپنا سایہ سمیٹ لیا۔ کتنا افسوس ہوتا ہے ان دوستوں پر جو اپنے ایک مخلص دوست سے محروم ہو گئے اور کس قدر دل تڑپ اُٹھتا ہے ان یتیم بچوں پر جن کے سر سے (کم سنی میں) باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔" [2]

غالب نے بڑی تاکید کے ساتھ یہ بات لکھی کہ اس کا خیال رکھا جائے کہ عزیزوں کے ہاتھوں ان معصوم بچوں کی کوئی حق تلفی نہ ہو۔ اور کوئی ان کے باپ کے ترکہ میں خورد بُرد نہ کرے۔ جو عام طور پر ہوتا ہے۔ اور ہوتا رہا ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا اپنے دوستوں سے کس قدر خلوص رکھتے تھے، اور ان کے خاندان کو اپنے خاندان کی طرح سمجھتے تھے۔

---

[1] اوراقِ معانی: ص ۱۵۶۔

[2] اوراقِ معانی: ص ۱۱۸۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو غالب اپنے قریب ترین افراد میں خیال کرتے تھے۔ کبھی اس میں اگر شکر رنجی کا کوئی پہلو پیدا ہو جاتا تھا تو وہ نہ صرف اس کو محسوس کرتے تھے بلکہ اس کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔

غالب کا ایک منظوم خط جواں کی ایک لائق توجہ اور قابل تحسین ادبی کاوش ہے اُنھیں نفسیاتی پرچھائیوں کی عکاسی کرتا ہے جو اس وقت آیئنۂ خیال کی شفاف سطح پر بکھری ہوئی ہیں۔ ایک اور مکتوب اس فقرے سے شروع ہوتا ہے۔

" ~~ می رنجد از تحملِ ما بر جفائے خویش

ہاں شکوہ کہ خاطرِ دلدار نازک است

"جناب نواب صاحب آپنے رسم نامہ و پیام اٹھادی ... - یہ صورت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ اس سے متعلق دوبارہ گفتگو کی جائے ــ اگر بے پروائی ہے تو پھر یہ نہ ہونا چاہیے اگر شکیب آزمائی ہے تو اس کا یہ انداز' مناسب نہیں۔ معذرت خواہ کو معافی کا موقع نہ دینا آخر کس کا قصور ہے"۔[1]

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "عجیب تر بات یہ ہے کہ میں خود اپنی خواہش کے ساتھ شکر آب ہوں"۔ کچھ دوسرے خطوط سے بھی اس صورت حال کی موجودگی پر روشنی پڑتی ہے بعض علمی مسائل پر بھی وقتاً فوقتاً گفتگو آتی رہی "

اسی زمانے میں نواب صاحب نے سفر حج بھی اختیار کیا ایک سے زیادہ خطوط میں ان سے متعلق کچھ باتیں غالب نے زبان قلم سے کی ہیں' ایک نگارش نامہ آموں کی تعریف میں ہے جس کو ایک نثری قصیدہ کہنا چاہیئے۔ اس کے بعض اقتباسات پیش کر دیے جائیں تو یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ آم کے بارے میں غالب کس کس طرح سوچتے تھے اور انھیں تحسین و ستایش کے مضمون سے کتنی دلچسپی تھی۔

" یہ پاکیزہ اور شیریں آم اے سُبحان اللہ"۔ ـــــــ

---

[1] اوراق معانی : ۱۵۵

شکل دیکھو تو دودھ سے دُھلے ہوئے اور سیرت کا خیال کرو تو شہد میں گھلے ہوئے تازگی پر نظر کیجیے تو آبِ حیات کی لطافت کا گمان ہو اور یہ خیال گزرے کہ انھیں دمِ مسیح کے لطف تاثیر نے پرورش کیا ہے پس شیریں صفات میں وہ شکر سے بڑھ گئے اور انھوں نے خسرو پرویز کا دل جیت لیا۔ غرض کہ آم اپنی پاکیزہ گوہری کے باعث ابر و باد کے خانوادے کی آبرو ہے اور اپنے حسین پیکر کے اعتبار سے دودمانِ شاخ و شجر کا چشم و چراغ۔" [1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کا یہ پھل جس کی تعریف مہاکوی کالی داس کے یہاں بھی بہت آئی ہے، غالب کو کسی قدر عزیز اور ان کے طبیعت کے لیے کتنا لذیذ تھا

لال قلعے کے مشاعرے

انھوں نے دہلی میں ہونے والے مشاعروں اور خاص طور پر لال قلعہ کے بعض مشاعروں میں اپنی شرکت کا حال بھی نواب صاحب کو لکھ کر بھیجا ہے۔ اپنے ایک خط میں قلعہ کے مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جمعہ کا دن جب رات میں بدل گیا تو بزمِ سخن آراستہ کی گئی اس کے لیے میں نے غزل نہیں کہی تھی شرم کے باعث میں سر بہ گریبان تھا . . .
. . . نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو سلامت رکھے دو فرشتے میرے لیے مقرر کر دیے یعنی زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں محو، یہ دونوں گماشتے میرے خلوت کدۂ تنہائی میں نازل ہوئے اور ہاتھی لیکر آئے اور جیسا کہ شیر کو شکار کر کے ہاتھی کی پشت پر لاد کر لے جاتے ہیں، مجھے انجمن میں لے گئے میرے مخدوم مفتی صدر الدین خاں بہادر کی زیارت نے رنجِ راہ کی تلافی کر دی"۔ [2]

---

[1] اوراقِ معانی : ص ۱۶۵ - [2] ایضاً ،،

"سب سے پہلے سلطان الشعراء شیخ ابراہیم ذوق نے حضرت والا کی غزل اس خوش آوازی کے ساتھ پڑھی کہ زہرا جو مغنیۂ فلک ہے) آسمان سے نیچے اُتر آئی۔ بعد ازاں شہزادہ یوسف دیدار، ہمایوں آثار، مرزا خضر سلطان بہادر نے اس طرحِ تازہ میں اپنی غزل پیش کی گویا اپنے اشعار گوہر نثار کی صورت میں، بساط بزم پر ستاروں کی بارش کر دی، اس کے بعد مرزا حیدر شکوہ مرزا نورالدین اور مرزا عالی بخت نے کہ عالی تخلص کرتے ہیں۔ سازِ سخن چھیڑا اور نغماتِ شعر کو بلند آہنگ کیا۔"

غالب کو ریختہ گوئی سے کوئی خاص دل چسپی نہیں، پھر بھی وہ قلعے کے تعلق اور بادشاہ کی فرمائش سے اردو میں کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں اور مشاعروں میں سناتے بھی ہیں اسی خط میں غالب نے آگے چل کر اپنی غزل پڑھنے کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہ "صہبائی کے ایک شاگرد نے کم و بیش ۷ شعروں کی ایک غزل پیش کی اور اہل سخن کو اپنا یہ شاعرانہ تحفہ نذر گزرانا۔"

غالب نے لکھا ہے کہ میں آب گزاری کا بہانہ کر کے محفلِ سخن سے باہر آیا اور اپنے غم کدہ کی راہ لی . . . . "دکانوں کے در کھلے ہوئے تھے اور چراغ روشن تھے ابھی یہ کہیئے نصفِ شب کا وقت گزرا نہیں تھا۔ میں نے بوریائے بے ریا پر اپنی محفل سجائی دو چار جام پیئے اور بادۂ ناب کی جرعہ کشی کی۔

اگلے روز صبح کو جب غالب قلعہ میں گئے تو پھر غزلوں کا دور چلا اور بزم شبانہ کو تازہ کیا گیا۔ غالب نے غزل پڑھی بعض ہم دموں سے ان کو معلوم ہوا کہ تمام رات ہنگامۂ شعر و سخن گرم رہا صبح ہونے کے قریب محفل برخاست ہوئی سلطان الشعراء ذوق نے مشاعرے کے خاتمے پر مزید اپنی دو غزلیں پڑھیں یہ دونوں غزلیں طرح میں نہ تھیں۔

بقول غالب اکیس[۱] روز جشن نوروز میں باقی تھے

---

[۱] از اوراق معانی: ص ۲۲۳۔

"میرے ساتھ کے لوگوں کی یہ خواہش ہوئی کہ مولانا صہبائی نے چونکہ اس وقت تک قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا اس لیے مولانا صہبائی غزل پڑھیں جو طرحی زمین میں تھی اس میں دو تین شعر بہت دل نشین تھے۔ جب غزل خوانی ختم ہوگئی تو ایک نئی زمین!

"گریبانم نمی آید، بدامانم نمی آید"

بحرِ ہزج مثمن سالم میں طرح کی گئی میرے دوستوں میں سے زین العابدین خاں عارف اور جواہر سنگھ جوہر نے زمینِ طرح میں دو غزلیں پڑھیں اور دلوں پر اپنی نغز گوئی کا نقش بٹھا دیا۔ میں نے وہ غزل پڑھی جو اسی دن کہی تھی: لہ

صبح شد خیز کہ روداد اثر بنمایم
چہرۂ آغشتہ بہ خوں نابِ جگر بنمایم

صبح ہوگئی اے میرے محبوب اُٹھ جا تاکہ تو یہ دیکھ لے کہ میری تمام رات کی آہ وزاری کا اثر کیا ہوا اُٹھ اور میرے چہرے کی طرف نظر کر جو میرے خون جگر سے لالہ رنگ ہو رہا ہے۔ لہ

غالب نے اس خط کو ختم کیا ہے تو اس پر ماہِ مارچ کی ۲۳ تاریخ درج کی ہے اور لکھا ہے کہ نمازِ عصر کا وقت ہے بادلوں سے قطرہ افشانی ہو رہی ہے اور ہوا ژالہ باری کر رہی ہے۔

ایک اور محفل کا ذکر اسی زمانے میں غالب نے اپنی زبان قلم سے اس طرح کیا ہے بدھ کا دن تھا پہلے وہ مفتی صدر الدین آزردہ کی بزم میں باریاب ہوئے۔ ان کی طبیعت ناساز تھی نزلہ زکام کی شکایت تھی اور چہرے سے اس کا اظہار ہو رہا تھا وہ خود مشاعرے میں تشریف نہیں لے گئے لیکن مجھے جانے کی اجازت دی میں نے

لہ اوراق معانی: ص ۱۶۶۔

ریختہ گویوں کی اس انجمن میں بہت سے شاعروں کا مجمع دیکھا۔ لمبی لمبی غزلیں ان لوگوں نے پڑھیں یہاں تک کہ جب میں گھر واپس آیا تو آدھی رات گزر چکی تھی غزل خوانی کے سلسلے میں جب نوبت مجھ تک پہنچی تو میں نے "مُلکِ نخواست، فلک نخواست" زمین میں کہی ہوئی اپنی غزل سنائی اس کے بعد طرح پر انشا کی ہوئی غزل پڑھی۔

غزل
چہ عیش از وعدہ، چوں باورِ زعنوانم نمی آید
بنوعے گفت "می آیم" کہ می دانم نمی آید

(بھلا اُس وعدے پر میں کیا خوش ہو سکتا ہوں جس کے انداز وادا پر ہی مجھے یقین نہیں، اس نے کچھ اس طرح سے کہا کہ میں آرہا ہوں کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ہر گز نہیں آئے گا۔ [1]

غالب نے اس بزمِ مشاعرہ کو "ریختہ گویوں کی انجمن" کہا ہے اور بہ طور خاص اس کا ذکر کیا ہے کہ شعراء نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں اور جب وہ گھر واپس آئے تو آدھی رات ہو چکی تھی اس سے اس زمانے کی شعری محفلوں اور ان میں پیش کی جانے والی تخلیقات کے رنگ و آہنگ کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ کہ غالب کو ریختہ گوئی سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، وہ فارسی شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اور اسی زبان میں کہی ہوئی غزلیں پیش کرنے کو اپنے لیے وجہِ امتیاز قرار دیتے تھے۔

مشاعروں میں انھیں بلایا جاتا تھا اس سے ان کے مُخلصین کو خصوصی دلچسپی تھی کہ وہ ضرور آئیں، اسی لیے تو نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اس سے پہلے کے ایک مشاعرے میں ان کو بلانے کے لیے دو آدمی روانہ کیے تھے اور اسی کے ساتھ ہاتھی کی سواری بھی۔ اس زمانے میں دہلی کے محلّوں اور گلی کوچوں میں ہاتھی بے تکلف آتے جاتے ہوں گے۔ اب تو جیسے یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

ایک اور مشاعرے کا ذکر غالب کی زبانِ قلم پر اس طرح آیا ہے۔ اور اس میں کہا ہے کہ

---

[1] اوراقِ معانی: ص ۱۶۶۔

جمعہ کا دن تھا جب بزم سخن کی نوید، سامعہ نواز ہوئی، شام کے وقت وہی دو مبارک فرشتے دروازے سے آئے اور مجھے اپنے ساتھ اس انجمن میں لے گئے۔

میر نظام الدین ممنونؔ اور مولوی امام بخش صہبائی کی طبیعت ناساز تھی اس لیے وہ نہیں آسکے حضرت آزردہ کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا گیا۔ اگرچہ موصوف دیر سے آئے لیکن اُن کی آمد نے (بقول غالبؔ) دل کو صفا اور زبان کو نوا بخشی آگے چل کر غالبؔ نے اس امر کی بھی اطلاع دی ہے کہ مولانا صہبائی بن بلائے وہاں حاضر تھے اور اس زمین گیر زمین سخن میں انھوں نے ایک غزل لکھی تھی۔

جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے اس زمین میں قصیدہ لکھا ہے تو انھیں ایک گونہ ندامت ہوئی۔ اور اپنی کہی ہوئی غزل کے چند شعر سنا کر واپس لوٹ گئے۔ غالب کا یہ قصیدہ ان کے فارسی قصاید میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ائمہ آل اطہار کے لیے انھوں نے جو قصیدے لکھے ہیں ان میں گریستن کی مناسبت سے یہ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے۔ غالب کے اپنے الفاظ میں۔

"اس بندۂ عاجز کو "گریستن" والی زمین میں نگارش قصیدہ کا اتفاق ہوا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس ورق کو ناپسندیدہ متاع کی طرح واپس لے جاؤں اور ریختہ گویوں کو دردِ سر میں مبتلا نہ کروں۔ حضرت آزردہ کے آنے سے میرا دل بڑھ گیا اور میری زبان کو زمزمہ سنجی کی اجازت مل گئی۔"

اسی خط میں غالب نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

"آج میں اس خیال میں تھا کہ قصیدہ ایک ورق پر لکھ لوں اور آپ کے درِ دولت کے پرستاروں کی دید کے لیے روانہ کروں، دوپہر تک فرصت نگارش نہ ملی۔ نماز ظہر کا وقت تھا کہ شہابی اور فتاحی آگئے۔ اس کی آستین گویا آنسوؤں سے بھیگی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک خوش رنگ گلدستہ تھا یعنی آپ کا نامہ مبارک۔ فتاحی نے مجھے سپرد کیا وہ چلے گئے اور بارش برسنا شروع ہوئی۔ بادل قطرات آب برسا رہے تھے اور میں والا نامے

کے صحیفے سے موتی چن رہا تھا یہاں — تک کہ میرا گھر پانی سے اور میرا دامن آبدار موتیوں سے بھر گیا۔“ [1]

ہم ان بیانات کی روشنی میں غالب کی ادبی مصروفیتوں کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں اور اس کا بھی کہ اس زمانے کے ریختہ گو زیادہ تر فارسی شاعری کے مزاج داں اور مرزا غالبؔ کے قدر داں نہیں تھے اور مفتی صدرالدین آزردہ اور نواب شیفتہ کو وہ اپنے بڑے قدر دانوں میں شمار کرتے تھے۔

مفتی صدرالدین خاں آزردہؔ نے بھی اس زمین میں غزل لکھی تھی نواب صاحب نے جو غزل سپرد قلم فرمائی غالبؔ نے اسے بے حد پسند کیا اور یہ بات ان کی زبان قلم پر آئی۔

”قصیدہ بر زمین گریستن اس کے باوجود کہ میرے دل سے زبان تک پہنچ گیا اور میری زبان سے اس نے تراوش پائی اور خاطر نشان ہوا اس غزل کو دیکھ کر جو آج مجھ تک پہنچی ہے میں اسے بھول گیا سبحان اللہ کیا غزل ہے۔ اگر میں نارسا بیان اور کج مج زباں ہوں اس کے ہر شعر کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھوں تو یہ ہو سکتا ہے اور پھر اس کا یہ مقطع کیا کہنا ارے قیامت۔ اس مقطع کی ستائش کس زبان سے ہو۔ جا دداں رہیے“ [2]

یہ تحریر اور دست قلم سے الفاظ میں کھینچی ہوئی یہ متحرک تصویر بتلا رہی ہے کہ اپنی تمام پریشانیوں، نارسائیوں اور محرومیوں کے باوجود غالبؔ کا ادب و شعر اور اہل فکر و سخن سے کس طرح کا ذہنی واسطہ ہے۔ ایک اور خط میں انھوں نے یہ بھی اطلاع دی ہے۔

”کل صبح کے وقت نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ، رخشاں جنھیں میں اپنے لیے روح رواں خیال کرتا ہوں میرے پاس نظامی کا دیوان لے کر آئے اس کے

---

[1] اوراق معانی : ۱۶۹

[2]

منتظر تھے کہ ان کے عندلیب طبع کو حُسنِ نوا کے ساتھ آمادۂ زمزمہ سنجی کیا جائے گا۔
غالباً اسی زمانے میں ایک اور مشاعرہ بھی ہوا جس کا ذکر غالب نے منشی نبی بخش حقیر کے نام اپنے ایک خط میں کیا ہے۔

"کل تیموری شہزادوں میں سے ایک نے اپنے یہاں بزم سخن آراستہ کی اور اہل سخن کو دعوت غزل خوانی دی، مجھے ریختہ گوئی سے کوئی واسطہ نہیں رہا اس باب میں بہت تردّد تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں، معذرت کیوں کر کروں، جب اس بزم میں جا رہا تھا خاص طور پر اس وقت جب میں ہوادار میں سوار ہو کر راستہ طے کر رہا تھا چند شعر بے ارادہ اس غم زدہ اور خون شدہ دل سے ٹپک پڑے، تمھیں بھیج رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اس زمینِ سخن میں خود غزل کہہ کر مجھے بھیج دو۔"

آغا بزرگ شیرازی کے نام (جو وفا تخلص فرماتے تھے) اپنے ایک خط میں غالبؔ نے پانچ شعر لکھے ہیں۔

خلیجم ولے نور چشمِ محیطم　　غریبم ولے روشناس جہانم
بہ مضمار دعوئے خداوند رخشم　　در اقلیم معنی، جہاں پہلوانم
گرفتم کہ از تخم افراسیابم　　گرفتم کہ از نسل سلجوقیانم
دلِ دوستِ تیغ آزمائے ندارم　　رہ و رسمِ کشور کشائی ندانم
چہل سال توقیع معنی نبشتم　　سزد گر نویسند صاحب قرانم

[ترجمہ :] اگرچہ میں ایک خلیج ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ میں سمندر کا نورِ چشم ہوں میں اجنبی ہوں اس پر بھی روشناسِ عالم ہوں میں افراسیاب کی نسل سے ہوں اور سلجوقیوں کے ساتھ ہم گوہری کا رشتہ رکھتا ہوں۔ میں دعوت مقابلہ میں خداوند رخش یعنی رستم ہوں در اقلیم معنی میں بے مثال ہنرمند و فنکار ہوں۔ میں تیغ آزمائی کی تاب و تواں نہیں رکھتا کشور کشائی کی رسم و راہ سے اب میرا کوئی رشتہ باقی نہیں۔ چالیس برس تک میں نے نگارشِ معنی کی خدمت انجام دی ہے۔
مجھے صاحب قِراں لکھا جائے تو میں ہر طرح اس کے لائق ہوں۔

پردۂ گفتار میں اس طرح کے ذوق فزا شعری نغمے تھے کہ ان سے متاثر ہو کر میں نے یہ زمزمہ سر کیا اُس سے مراد غالب کا وہ مکتوب منظوم ہے جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے ایک اور خط میں

گمانِ زیست بود بر منت زبے دردی
بدستِ مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

کے مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی بیماری کا بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے۔ دوست کی خواہش کی تکمیل پر شاداں ہوں، میں نے تو ہم پرستی سے اپنی بیماری کو اوڑھ لیا ہے" اس زمانے کے مکتوب کی سیر سے ان اشعار کی نشاندہی ہوتی ہے جو غالب نے اس زمانے میں کہے۔

ان میں بعض غزلیں بھی ہیں مثلاً غزل

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

اس کا مقطع یہ ہے

غالب بہ طرحِ منقبتِ عاشقانۂ
رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم

یہ تیرہ شعر کی غزل ہے اور اس سے متعلق غالب کا اپنا بیان ہے "میں نے جو غزل ان دنوں تازگیٔ فکر اور روشِ نو کے ساتھ کہی ہے کوتاہ قلمی کی تقصیر پر ہزار ہزار عذر کے ساتھ زیر تحریر مکتوب کے حاشیے پر لکھتا ہوں اور یہ آرزو رکھتا ہوں کہ یہ تحریر نامنظور ہونے کے داغ سے محفوظ رہے گی اور آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جائے گی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اپنے اشعار کی پزیرائی سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔

اسی زمانے میں غالب نے بعض شعراء کے دواوین کے مطالعہ کرنے کا بھی تذکرہ کیا ہے اس تذکرہ سے اس حقیقت کی نشان دہی ہوتی ہے کہ وہ ادبی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

ادبی نقطۂ نظر سے یہ بات زیادہ اہم ہے کہ جس دور میں یہ خط لکھے جا رہے ہیں نواب صاحب سے غالب کے تعلقات بے حد شگفتہ ہیں۔

۱۷ شعروں کی یہ غزل ایک طرح سے قصیدے کی کمی پوری کر رہی ہے اس میں غالب نے اپنی مشکلات و مسائل رنج و غم اور آلام و مصائب کی طرف بھی چشم سخن سے اشارے کیے ہیں، مسٹر طامسن اکبر آباد کے گورنر ہو گئے ہیں، غالب نے اس کو اپنی "دعائے سحر گاہی" کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ آگرہ غالب کی جائے پیدائش تھی اور اس سر زمین میں کبھی ان کی جاگیر بھی تھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میں بندۂ خالص الاخلاص تھا اب رعیت خاص الخاص کے زمرے میں آگیا ہوں میں بندگی میں بہت "چست کمر" تھا اب رعیت گری میں رعایتِ خاص کا مستحق بن گیا ہوں۔ اس کے ساتھ بھی مبارکباد کا ایک قطعہ موجود ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ہو عبیر فشانست و ابرِ گوہر بار
جلوسِ گل بہ سریرِ چمن مبارکباد

آخر کا شعر ہے:

ہزار بار فزوں گفتم و کم است ہنوز
گورنری، بہ جس طامسن مبارکباد

قلعۂ مبارک میں مشاعرے ہوتے رہتے ہیں اور تیموری شہزادے بھی اپنا کلام ان محفلوں میں پیش کرتے ہیں۔ میر مہدی مجروح کے نام اپنے ایک فارسی خط میں غالب نے جمعہ کے دن ماہِ فروری کی پچیس تاریخ کو اس خجستہ نشیمن میں سخن سرائی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: "شہزادگانِ بابریہ کی ایک جماعت اور آزادگانِ شہر میں سے کچھ اشخاص جمع ہوئے۔ شائقین کا کچھ ایسا اژدہام ہوا کہ جگہ تنگ ہو گئی اور لوگ ٹھساٹھس بھر گئے۔

آگے چل کر اس مشاعرے کی مزید کچھ تفصیل بھی غالب نے پیش کی ہے۔

اب میں کیا کہوں کہ پیشتر میرے قلم کو وہ روشِ خرام میسّر تھی کہ اس کے طرزِ نگارش پر دوسروں سے پہلے، خود لکھنے والے کا دل مچل اُٹھتا تھا اور یہ اس وجہ سے تھا کہ سراپردۂ ناز کے مبارک فرشتے فرازِ گیتی سے نہاں خانۂ دل میں اُتر آتے تھے اور ان کے حسین وجمیل پرتوؤں سے وہ نقشہائے رنگ رنگ پیدا ہوتے تھے جو نشیمنِ خیال کے گرد قوسِ قزح جیسے خوش رنگ حلقے بنا دیتے تھے۔"

اس پس منظر میں اکبرآباد کی زندگی کے خوش گوار اثرات کو ان کے ذہن بہ تا دیر دیکھا جا سکتا ہے۔

میجر جان جاکوب: غالب سے ان کا ایک مخلصانہ تعلق اور ذہنی قربتوں کا رشتہ تھا۔

پنج آہنگ میں میجر کے نام غالب کے پانچ فارسی خط ملتے ہیں۔ ایک مکتوب میں اس موقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے گوالیار میں اپنے لیے ایک شاندار مکان تعمیر کرایا ہے اور غالب سے اس کی تاریخ کے لیے فرمایش کی ہے۔ اس کے جواب میں مرزا نے بہت ہی اپنائیت کے ساتھ یہ لکھا۔ "محبت جو میرا دین ہے" اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی مادۂ تاریخ کو اپنے دل میں جگہ نہ دی۔ اس پر بھی انھوں نے میجر کی مخلصانہ فرمایش کا خیال کرتے ہوئے سات شعروں پر مشتمل ایک قطعہ تاریخ ارسال کیا۔

"جان جاکوب آں امیر نامور" اس قطعہ کا مصرع اولےٰ ہے۔

اس مکان ذی شان میں ایک چاہ شیریں کی بھی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ میجر نے اپنی طرف سے اس کا "مادۂ تاریخ" خود ارسال کیا اور قطعہ کی فرمایش کی۔ غالب

لہ ادراق معانی: ص ۲۰۳ - ۲۰۲ -

نے اس کے جواب میں تحریر کیا۔ –

چاہ یعنی کنوئیں کے لیے" مادۂ تاریخ بھیجنا اور مجھ سے تاریخ کی فرمائش کرنا بھی عنایت فرمائی" کا ایک نیا انداز ہے . . . قطعہ آپ کی خدمت میں پہنچ رہا ہے

آں میجر فرزانہ کہ موسوم بجان است

ایک تیسرے خط میں بات کا رُخ بدل گیا اور مطبع سلطانی سے شایع ہوے والے غالبؔ کے دیوان ریختہ کا ذکر درمیان میں آگیا۔

مطبع سلطانی کا نقش میرے دوستانِ روحانی میں سے ایک دوست کی طبع عالی کا نمونہ ہے" نئے دستور کی نمایندگی کرنے والے اس مطبع کے بارہ میں ایک کارفرما کی یہ رائے ہے کہ اس میں نو بنو نقش صورت پزیر ہوتے ہیں اور یہی وہ " نو آئین کدہ" ہے جس نے غالب آشفتہ کے رشحات قلم کو زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے اس میں دیوان ریختہ بھی ہے کہ وہ ناتمامی کا نمونۂ تمام ہے۔ ممکن ہے اس ماہ میں اس کی طباعت کا کام بھی پورا ہوجائے اور پھر وہ نظر گاہ والا میں پیش ہو"

مطبع سلطانی نے غالب کا دیوانِ ریختہ بھی چھاپا، اور پنج آہنگ بھی۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ اشاعتیں بہت اہم سہی، مگر اغلاط سے خالی نہیں۔

میجر جان جاکوب نے دیوانِ حافظ کا ایک نسخہ ترتیب دیا تھا اور وہ غالب سے اس کا دیباچہ لکھوانا چاہتے تھے۔ غالب نے بھی اپنے خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے" دیوان حافظ کو جناب والا نے ایسی کوششِ بسیار اور سعیٔ خوش آثار کے وسیلے سے غلط نگاریوں سے پاک کیا ہے اور اس شاہد روحانی کے زلف و رخسار کو شانہ کاری و غازہ آرائی کرکے اعجاز نمائی کے لائق بنا دیا ہے تو اب خاطر عاطر میں یہ بات آئی ہے کہ غالبِ خستہ جگر، جو پتھر اور گوہر میں کوئی امتیاز نہیں کرتا وہ اس کی دیباچہ نگاری کرے۔"

اسی کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ جو کچھ اس باب میں جناب والا نے فرمایا ہے نیز جو نگارشات دوسروں کی تحریروں میں سامنے آتی ہیں ان کو بھی اس دیباچہ میں شامل کیا جائے۔

غالب نے اس موقعہ پر تقریظ کی ادبی تعریف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے۔
"لغات عرب میں تقریظ اس عبارت کو کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ کتاب کو اتمام تک پہنچایا جاتا ہے' چونکہ میں نے لکھ دیا ہے جو کچھ میں نے سپرد قلم کیا ہے وہ تقریظ ہے' دیباچہ نہیں" ہر آئینہ اس لائق ضرور ہے کہ اس قُدسی صحیفہ میں اسے جگہ دی جائے۔"

اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ "میجر صاحب خود ہی دیباچہ کیوں نہ لکھیں"۔

مسٹر طامسن:

غالب اپنے لیے جس طرح کی قدر افزائی اور احسان فرمائی کی توقع رکھتے تھے۔ وہ ان کے معاملے میں "باندازۂ بایست" نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے پنشن کے مقدمے کو ولایت بھیجا تاکہ کمپنی بہادر کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کو اس طرف متوجہ کیا جائے۔ مسٹر جیمس طامسن بہادر کو جو خط انھوں نے لکھا ہے' اس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی تحریر کیا ہے" اگرچہ میری خاک وجود کا ذرّہ ذرّہ ساقی کی تر دستی و سیر بخشی سے کام یاب ہے لیکن راہ اُمید کا جو صرو سموم کی آماج گاہ ہے ایک ایسا مسافر ہوں جو ناکامیوں کی کڑی دھوپ میں اپنی جگر تشنگی کے باوصف برابر جل رہا ہو۔ . . . ."

ایک دوسرے خط میں جو انھیں کے نام ہے' فارسی میں اپنی ایک غزل بھیجی ہے اور لکھا ہے" اگر بے نواؤں کی طرف سے ایک برگ سبز کو تازہ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی جگہ قبول کر لیں تو کیا تعجب کی بات ہے" اس غزل کا مطلع یہ ہے جس میں جیمس طامسن کا نام بہ طور قافیہ آیا ہے

سبزہ ام گلبن و خارم گل و خاکم چمن است   تا ببویم نظرِ لطفِ جیمس تامسن است

اوراق معانی : ۲۱۵۔

قطعہ در مدح مسٹر ٹامسن بہادر

(چند شعر)

رباب نغمہ نواز است و نے ترانہ فروش
فروش زمزمہ در انجمن مبارکباد

بزم نغمہ چنگ درباب ارزانی
بباغ جلوہ سرو و سمن مبارکباد

ز شمعہا کہ یکا شانہ کماں بوند
فروغ طالع ارباب فن مبارکباد

ز بادہ ہا کہ بہ مے خانۂ خیال کشتند
طلوع نشۂ اہل سخن مبارکباد

غالب اردو کے ادیبوں اور شاعروں میں اپنے زمانے تک شاید منفرد آدمی ہیں جنھیں مغربی قوموں کے افسران اور انگریزی حکام کی تعریف میں کچھ کہنے کا موقعہ ملا اس کی بڑی وجہ کلکتے میں ان کے مقدمے کی کارروائی اور اس سلسلے میں ان کا دیار مشرق کی طرف سفر ہے جس نے ان کو ایک نئے تمدن سے وابستگی رکھنے والے اشخاص سے کہیں قریب اور کہیں قریب تر کر دیا۔

یہ تجربہ غالب کے ذہن و فکر پر بھی اثر انداز ہوا اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے کی پریشانیاں بھی ان کے حصے میں آئیں اور آتی رہیں اور ان کی ادبی سعی و کاوش میں بھی اس کا ایک بڑا حصہ رہا کہ انھوں نے بہت سے انگریزوں کے لیے قصیدے لکھے ان کی تعریفیں کیں اور ہماری قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ بعض انگریز اُن کے دوست بھی تھے ان میں سے ایک میجر جان جاکوب تھے۔

میجر جان جاکوب اس طبقے کی نمائندگی کرتے تھے جو ہندوستان میں انگلستان یا کسی دوسرے ملک سے محض گھومنے نہیں آتا تھا یہاں کی زندگی سے بھی دلچسپی لیتا تھا اور ادب کو ایک نیا رُخ دینے کی خواہش اس کے دل میں ہوتی تھی اور وہ کوشش بھی کرتا تھا۔

میجر جان جاکوب (جیکب) غالب اور کلام غالب سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا اور اسی نسبت سے غالب کے فن کا قدر دان اور ان کا مخلص و مہربان تھا۔ غالب نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ یہ مغرب کا باشندہ اور انگریز کمپنی بہادر کا افسر مجھ سے فارسی میں کہنے کی فرمائش کرتا ہے اور اردو میں کہنے سے مانع آتا ہے

یہ ہندوستان اور یہاں کے تہذیب سے دلچسپی تھی اور وہ اس ماحول میں رہنا چاہتا تھا تبھی تو اس نے گوالیار میں ایک مکان لے لیا تھا جس میں ایک کنویں کی تعمیر بھی عمل میں آئی اور اس کی تاریخ غالب سے لکھوائی تھی۔

دہلی کالج کی ملازمت

(اور غالب کی معاشی صورت حال)

غالب نے سو پشت سے ہمیشہ آباء سپہ گری ہونے کے باوجود کبھی بحیثیت سپاہی کسی بھی سرکار یا دربار میں خود کو پیش نہیں کیا۔ جبکہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں اور چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں نے اپنے باپ دادا کی طرح اسی بہادرانہ پیشہ سے خود کو وابستہ کیا اور اسی میں جان دی۔ غالب نے اپنے بارے میں خود ہی یہ کہا کہ میں نے تو اپنے آبا و اجداد کے تیر شکستہ کو اپنے لیے قلم بنا لیا ہے۔

شد تیر شکستہ نیاگاں قلم

اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے بیشتر اعزا کسی نہ کسی سرکار اور دربار کے وثیقہ دار اور وظیفہ خوار تھے اس صورت حال کو اس زمانے کے جاگیردارانہ قدروں سے وابستہ خوش حال خاندانوں کے افراد، جو خود کو رئیس زادہ قرار دیتے تھے اپنے لیے وجہ عزت اور باعث احترام سمجھتے تھے۔ غالب کو مہاراجہ الور کی طرف سے

ایک دو گاؤں بطور جاگیر معافی ملے تھے جوان کے والد کی وفات کے بعد مہاراجہ الور نے ان کے یتیم بچوں کی پرورش کے لیے بطور عطیہ دیے تھے مالک رام صاحب نے ان میں سے ایک گاؤں کا نام "پالسڑا" لکھا ہے، یہ جاگیر کے طور پر یا پرورش کی غرض سے ملے ہوئے گاؤں پھر کس طرح اور کیوں چھن گئے غالب نے یا ان کے کسی سوانح نگار نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

ایسا بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ معلوم ہو کہ غالب اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف نیز ان کی والدہ اور ایک بہن اس سے کب محروم ہوئے اور اس محرومی کی وجوہ کیا تھیں ان کے عم محترم نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد وہ جاگیر تو بحق سرکار ضبط ہو گئی جو ان کے چچا کو ملی تھی اور تنخواہ بھی باقی نہ رہی مگر چونکہ نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے بڑے بھائی کے یتیم بچوں کی پرورش اور سرپرستی اپنے ذمہ لے لی تھی اس لیے انھیں نصر اللہ بیگ کے وارثوں میں شامل کیا گیا اور لارڈ لیک بہادر نے جو اس وقت افواج انگلشیہ کے سربراہ اعلےٰ تھے اس کے حق میں ایک دستاویز لکھ دی کہ مرزا نصر اللہ بیگ کے وارثوں کو بسلسلۂ پرورش اتنی اتنی پنشن دی جائے یہ پنشن غالب کی نگاہ میں ان کے حق سے بہت کم تھی اور اسی پر آیندہ چل کر انھوں نے سرکار انگریزی میں مرافعہ داخل کیا جس کا کوئی نتیجہ ان کے حق میں نہیں نکلا۔

بایں ہمہ وہ اس طرف بھی متوجہ نہیں ہوئے کہ کسی سرکار سے بحیثیت ایک عسکری خدمت انجام دینے والے کے منسلک ہو جائیں وظیفہ جتنا بھی ملتا رہا وہ اس پر مطمئن ہوں یا نہ ہوں مگر اسی کے سہارے انھوں نے اپنا بہت سا وقت گزارا۔

شروع شروع میں ان کی سرپرستی ان کے نانا غلام حسین کمیدان کی طرف سے بھی ہوئی جو شہر اکبر آباد میں صاحب املاک و جائیداد تھے بعد ازاں ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہو گئی۔ زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ نواب صاحب کی طرف سے بھی بحیثیت خانہ داماد اُن کی سرپرستی کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جاتا ہوگا۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کی پریشانیاں بڑھ گئیں

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بہت قرض دار ہیں اور قرض داروں کی طرح گیر ودار میں مبتلا ایسی صورت میں اس پر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے سرکارِ انگریزی کی طرف سے جو ملازمت ان کو دی جاسکتی تھی اس سے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ سکریٹری ان کے استقبال کو نہیں آئے۔

یہ واقعہ آب حیات کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔

" یادگار غالب میں اس سے متعلق عبارت ان الفاظ میں آئی ہے۔ تذکرہ آب حیات میں لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ عیسوی میں جبکہ دہلی کالج نئے اصول پر قائم کیا گیا تھا مسٹر ٹامسن سکریٹری گورنمنٹ ہند جو آخر کو اضلاعِ شمال و مغرب کے لفٹیننٹ گورنر ہوگئے تھے مدرسین کے امتحان کے لیے دہلی آئے اور یہ چاہا کہ جس طرح سو روپے ماہوار کا ایک عربی مدرس کالج میں مقرر ہے اسی طرح ایک فارسی کا مدرس مقرر کیا جائے۔ لوگوں نے مرزا اور مومن خاں اور مولوی امام بخش کا ذکر کیا۔

سب سے پہلے مرزا صاحب کو بلایا گیا مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سکریٹری کے ڈیرے پر پہنچے، صاحب کو اطلاع ہوئی انھوں نے فوراً بلا لیا مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھیرے رہے کہ دستور کے موافق صاحب سکریٹری ان کے لینے کو آئیں گے جب بہت دیر ہوگئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا کہ جب دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اسی طرح استقبال کیا جائے گا۔

اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقعہ پر وہ برتاؤ نہیں ہوسکتا مرزا صاحب نے کہا کہ گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو، نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آجائے۔ صاحب نے کہا کہ ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔

مرزا صاحب نے کہا کہ مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر چلے آئے۔" [1]

---

[1] یادگار غالب؛ ص ۲۶ ـ ۲۷۔

یہ بڑی رواروی میں قلم بند کی گئی ہے اس میں بعض باتیں مبالغہ آمیز ہیں اور قرین قیاس نہیں۔

قدیم دہلی کالج ۱۸۴۲ء میں نہیں ۱۸۲۵ء میں قائم کیا گیا تھا اُس کی بعض توسیعات ۱۸۴۲ء یا اس کے قریبی زمانے سے متعلق ہیں اس میں فارسی مدرس کے تقرر کیے جانے کی بات ہوگی۔ سنہ ۱۸۳۵ء یا اس کے قریبی زمانے میں اس کا کوئی ذکر نہیں آتا۔

غالب انگریزوں سے بہت زمانے پہلے سے ملتے تھے اور ان کی محفلوں میں شریک ہوتے آرہے تھے ایسا کیا ہے کہ وہ عام رئیس زادوں کی طرح اس مسئلے کے انتظامی پہلو کو سمجھ ہی نہ سکے اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔

مولانا غلام رسول مہر اور مالک رام صاحب نے اس واقعہ کی طرف غالب کی سوانح عمریوں میں کوئی اشارہ نہیں کیا۔ مسٹر ٹامسن سے غالب کے دوستانہ تعلقات تھے جب وہ لفٹیننٹ گورنر ہوگئے تو غالب نے ان کے لیے مدحیہ اشعار بھی لکھ کر بھیجے تھے اور ان سے اپنی پنشن کے معاملے میں مدد بھی چاہی تھی۔

ایسی صورت میں کسی ایسے شخص یا کرم فرما دوست کو اس طرح جواب دینا اور اس کے احترام کو بھی ملحوظِ خاطر نہ رکھنا سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ بات اپنی جگہ ہے کہ غالب کو اپنے سرکاری اعزاز کا بہت خیال رہتا تھا لیکن اس کی وجہ سے سرکار اور دربار کے الگ الگ دائروں میں رہتے ہوئے رسوم و آداب کو ملحوظ دیکھا اور پرکھا جائے۔

نواب حسام الدین حیدر دہلی کے معززین میں سے تھے۔ ان کی حویلی غالب کی رہائش گاہ سے بہت قریب تھی یہ حویلی اب بھی نواب صاحب کے نام سے منسوب ہے اور عرف عام میں پنجابیوں کا پھاٹک کہلاتی ہے۔ نواب صاحب غالب کے مخلص دوستوں میں تھے۔ ان کا تعلق دربار اودھ سے بھی تھا۔ ایک بار بادشاہ اودھ نے کوئی خواب دیکھا اور نواب صاحب سے اس کا ذکر کیا غالباً نواب صاحب کی خواہش کے پیش نظر غالب نے اس خواب پر چند رباعیاں سپرد قلم کیں۔ جنھیں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

رباعیاں

خوابے کہ فروغ از و جلوہ گرست　　در روز نصیب شہ روشن گہرست
پیداست کہ دیدن چنیں خواب بروز　　تعمیل نتیجہ دعائے سحرست

یہ خواب جس سے خوش بختیوں کے فروغ کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور جس کو دن میں دیکھنا شاہ روشن گہر کی خوش نصیبی کی تابندہ علامت ہے ....اب ظاہر ہےکہ ایسے کسی خواب کا دن میں دیکھنا "دعائے سحر" کا نتیجہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

بر دل و دیدہ فتح باب است ایں خواب　　بارانِ امید را سحاب است ایں خواب
زنہار گماں مبر کہ خوابست ایں خواب　　تعبیر ولائے بو تراب است ایں خواب

یہ خواب آنکھوں نے دیکھا ہے اور دل کے تئیں فتح باب بن گیا ہے۔ یہ خواب' بارانِ اُمید کے لیے موتی برسانے والے سحاب کا درجہ رکھتا ہے، یہ خیال ہرگز نہ کر کہ یہ محض ایک خواب ہے۔ یہ حضرت علیؓ کی "ولا" کا ثمرہ ہے۔

بینائیٔ چشم مہر و ماہست ایں خواب
پیرایۂ پیکرِ نگاہست ایں خواب
بر صحتِ ذاتِ شہ گواہست ایں خواب
بیداری بختِ بادشاہست ایں خواب

یہ خواب چاند سورج کی بینائی ہے۔ اور دل و نگاہ کا پیکر روشن ہے بادشاہ کی ذاتِ والا کی صحت مندیوں پر یہ خواب گواہی دے رہا ہے، اور بادشاہ کے بخت بیدار کی شہادت دے رہا ہے

ایں خواب کہ روشناسِ روزش گویند
چوں صبحِ مراد دلفروزش گویند
زاں رو کہ بروز دیدہ خسرو چہ عجب
گر خسروِ مُلکِ نیم روزش گویند

یہ خواب جسے روز روشن کا روشناس کہنا چاہیے اور جسے صبح مراد کی طرح دیدہ افروز کہا جا سکتا ہے اس لیے کہ بادشاہ نے اُسے دن میں دیکھا ہے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ ملکِ نیم روز کا بادشاہ ہے۔

مرزا نے۔ نواب صاحب کی طرف سے جو عرضداشت نامہ بزبان فارسی تحریر کیا تھا وہ بھی ایک اچھے دوست کی فرمایش کی تعمیل تھی، بہر حال اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی تحریر و نگارش میں سرمایۂ آرایش گفتار کے کیا معنی تھے۔

"سریر سلطنت کہ ایک مدت سے بلندیوں کی طرف مایل رہا ہے اب رتبۂ عالی پر ہے کہ سات آسمان اس پر اپنا سرمایۂ ناز نچھاور کریں اور فرشتے جو ہمیشہ سے فلک ثوابت کو مزین اور آئینہ بند کرتے رہے ہیں اب اس فرد زندہ انجمن میں با چشم روشن و دل شاداں زانو بزانو بیٹھے ہیں۔

روشن سوادانِ سپہر ایک زمانۂ دراز سے آئنہ فلک کی صیقل نمائی اور شیشہ گری کرتے رہے تاکہ آج کے دن شاہ اودھ کے جلوۂ تمثالی کو دیکھ سکیں . . . زمانۂ دراز سے عہد موجود تلک مہر درخشاں کی ضیا باریوں کی دست مزد یاقوت سازی تھی . . . سو اُس کی غرض و غایت اب سامنے آئی۔"

اس سے ہم غالب کی اس دور زندگی میں ادبی دلچسپیوں کا بھی کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

غالب نے اسے محمد علی خاں بہادر کو بھیجا کہ "اُس کی توجہ فرمائی سے یہ دوبارہ نظر سلطانی سے گذر جائے اور حکم نوازش اکسی دوسرے وقت سے متعلق نہ ہو یہ ضرور درخواست کی جائے" اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ غالب کن حالات سے دو چار رہتے تھے ایک اور خط میں انھوں نے اپنی ایک خاص مثنوی کا ذکر کیا ہے جس کے نتیجہ میں غالب اور خود بادشاہ کے خلاف بہت ہنگامہ ہوا تھا جس میں اپنی روش اور ذمہ داری سے متعلق غالب نے یہ کہا ہے کہ نگارش مثنوی میں مضمون بادشاہ کا تھا اور الفاظ میرے۔

"پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ سب کچھ میری زبان میں نہ تھا دوسروں نے کچھ مصرعے بڑھا دیے ہوں گے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر غالب لغزش فکر و نظر سے آزاد نہ تھے۔

غالب نے سلطان محمد بہادر کے نام اپنے ایک خط میں اپنی ادبی سرگذشت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"طبع عالی پر روشن ہو کہ دس سال کی عمر میں موزونی طبع کے آثار مجھ میں ظاہر ہوئے یہاں تک کہ شدہ شدہ دید و دانست کا سرمایہ فراہم ہو گیا زبان نے اندازِ گذارش اور قلم نے اسلوب نگارش کے آداب سیکھ لیے اب کے عمر گذراں ستر کی منزل تک پہنچ گئی تو میری خاطر ناشاد میں یہ بات آئی کہ پچاس سالہ نگارشات کے مسودوں کو فراہم کیا جائے۔

"عدم استطاعت کے باوجود ان کے مصارف طباعت کو برداشت کیا اور ان تحریروں نے مطبوعہ صورت پائی۔" یہاں غالب سے اگر اپنی عمر کا حال بیان کرنے میں کوئی تسامح نہیں ہوا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ پچاس سالہ مسودات ستر برس کی عمر میں اگر طبع کرائے جائیں گے تو موزونی طبع کا آغاز بیس سال کی عمر سے متعلق ہو گا جب کہ ایک دوسرے خط میں غالب نے آغاز نگارش کے زمانے کو پندرہ برس کی عمر سے وابستہ کیا ہے جو زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

غالب حسّاس آدمی تھے۔ ذرا سی بات ان کو پریشان کر سکتی تھی اور پھر انھیں خود ہی اپنے حالات اور خیالات کو سنبھالنا پڑتا تھا، ہم انھیں اکثر یہ کہتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ "اس صورتِ حال نے مجھے کچھ اور بھی زیادہ افسردہ اور دل زدہ کر دیا ہے" ان کے اپنے الفاظ میں انھیں مشقِ سخن کے ساتھ اور مشقِ سخن کو ان کے ساتھ "زنجیر" سے تو باندھا نہیں جا سکتا۔ لکھتے ہیں "سخن گوئی سے مجھے مس نہیں رہا اور میری زبان یہ کہیے کہ طرزِ گفتار بھول گئی۔"

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے نام ایک خط میں انھوں نے یہی بات دُہرائی ہے کہ میں بے طرح ناسازگاریٔ حالات کا شکار ہو گیا ہوں، خوش نوائیوں کے ساتھ سانس لینا اور ادائے خاص کے ساتھ باتیں کرنا مجھ پر اس حد تک گراں ہے کہ اگر اچانک دل خوش گفتاری اور نشاطِ تحریر سے زمزمہ سرا ہو جائے تب بھی اپنے دل کو اندوہ و ملال کے گرداب سے موکشاں باہر لانا اور سخن سرائی پر آمادہ کرنا ممکن نہ ہو۔

ان کو یہ خیال بھی رہتا ہے کہ لوگوں نے میری قدر نہیں کی اور ناخنِ فکر کی گرہ کشائی کی داد نہیں دی۔ میں رفتہ رفتہ اس منزل پر آ گیا جہاں میرا ذہن خالی ہو گیا۔ اور میرے دل اور دماغ میں کچھ نہ رہا۔ میرے اس درد سے زیادہ کوئی جاں گداز غم کیا ہوگا کہ جب تک میری دوکانِ فکر کا در کشادہ تھا اور رنگا رنگ متاعِ سخن فراوانی کے ساتھ اس میں موجود تھی مشتریوں میں نے کسی نے دروازے پر دستک نہ دی اور خریداری کا سودا کسی سر میں پیدا نہ ہوا۔ جب دکان میں سامان نہ رہا اور حرف ہائے جگر گداز زبان سے غائب ہو گئے تو ایک بلند پایہ اور گراں مایہ خریدار پیدا ہوا۔"

بایں ہمہ وقتاً فوقتاً وہ اپنی زبانِ قلم کو ازبی گفتگو کے لیے جنبش دیتے رہتے ہیں۔ منشی امیر اللہ سرور کے نام مذکورہ خط میں انھوں نے لکھا:

"ان تمام بزرگوں میں جن کا ذکر ہے مرزا حیدر علی افصح میری نگاہ میں مردِ کامل ہیں۔ روشِ پسندیدہ اور طرزِ دلکش رکھتے ہیں۔

غالبؔ نے اپنے اس دور کے خطوط میں جن علمی اور ادبی خیالات کو اپنے مکتوبات میں قلم بند کیا اور اپنے دوستوں کو بھیجا ہے' ان میں ایرانِ قدیم سے متعلق ان کے تصورات بھی ہیں' جن کی مدد سے ان کے افکار و خیالات کے سرچشموں تک پہنچنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تصوّرات مولوی سراج الدین احمد کو لکھے گئے خط میں سامنے آتے ہیں۔

پارسی نژاد لوگ بھی "منتخبانِ روزگار" میں سے تھے اور وقت نے ان کو برگزیدہ بنایا تھا۔ اپنی فرماں روائی کے دور میں وہ "دانش سود مند" اور "دستور خرد پسند" رکھتے تھے۔ وہ ستارہ شناس تھے اور سلسلۂ آفرینش کو گردشِ ہفت افلاک سے وابستہ تصوّر کرتے تھے اور "نمود ہستی" کو مہر و ماہ کی حرکاتِ سماوی سے نسبت دیتے تھے۔

وہ رگِ تاک سے مئے ناب افشردہ کرنا جانتے تھے۔ خستگی و رنجتگی کے معنی سمجھتے تھے اور صحت و تندرستی کے احکام و علائم اور چارہ گری کے فن سے واقف تھے، انھوں نے جہاں داری و فرماں روائی کے ضابطے مرتب کیے تھے اسی کے ساتھ وہ فرماں پذیری و بندگی کی حدود سے واقف تھے۔

"مختلف بیماریوں کا جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے کے طریقوں سے وہ بخوبی آگاہ تھے صید افگنی کے فن کو انھوں نے ماہرانہ صورت بخش دی تھی۔ ہر طرح کی دانش و بینش کے مسایل ان فرزانوں کے اندیشہ و خیال میں موجود تھے اور رفتار و کردار کے شایستہ انداز اور حسنِ معاشرت کے آداب و رسوم انہیں باندازۂ بایست آتے تھے۔ یہ انھیں کی دانش و فرہنگ کا تحفہ ہے۔ جو بعد کی نسلوں کو مِلا ہے۔"

خسروانِ پاک سرشت کے خزانوں میں ہر علم و فن کے دفتر موجود تھے اور ہر دفتر گراں مایگی کے لحاظ سے لعل و گوہر کے بہترین خزانوں سے زیادہ بیش بہا تھا

قدیم ایران سے متعلق غالبؔ کے یہ خیالات تاریخ سے ان کی دل چسپی کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور ایرانی تہذیب سے وہ کس قدر متاثر تھے اس کا اندازہ بھی ان کے اس اظہارِ خیال سے ہو جاتا ہے۔

قدیم ایران کی تہذیب عراق و مصر اور فنیقی تہذیب کے ساتھ ساتھ

آگے بڑھی اور اس نے اس عظیم و قدیم وراثت سے بھی بہت صالح اور صحت مند عناصر اپنے اندر جذب کیے۔ شہنشاہیت کا ادارہ ایرانِ قدیم میں بھی بہت پرُ قوت رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اپنے کچھ آداب و رسوم ہوں گے ایران کی یہ تہذیب قدیم سومیری بابلی نینوائی اور فنیقی کلچر دل سے بھی استفادہ کرتی اور اپنی ثقافتی توسیع کرتی رہی بالآخر اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گئی۔

غالبؔ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ جب اس گروہ کی جہاں داریوں کا دن بے نور ہو گیا اور سکندر ابن فیلقوس یونانی کے لشکر نے ان پر تسلط حاصل کر لیا۔ شاہی کتب خانے تاراج کر دیے گئے اب جو کچھ ادھر اُدھر پراگندہ حالت میں تھا اور جسے گمنام افراد اور غیر ممتاز خاندان اپنے گوشۂ کنار میں متاعِ عزیز کی طرح سمیٹے بیٹھے تھے عربوں کی فتوحات اور حکمرانی کا زمانہ آیا تو ہر جگہ سے کوشش و کاوش کر کے یہ سرمایہ بھی اکٹھا کیا گیا، اور خلیفہ کے حکم سے ۔ ذخیرہ بغداد کے حماموں کو گرم کرنے کے لیئے برسوں آگ میں جھونکا جاتا رہا یعنے کہ آذر پرستی کے احکامات آگ ہی کی طرف واپس لوٹا دیے گئے۔

غالبؔ اس کے بھی شکوہ سنج نظر آتے ہیں کہ عرب کی زبان آوروں نے فارسی کو عربی سے ملا دیا اور اس سے ایک نئی زبان پیدا کر دی۔ اب کون ہے جو اس زبان میں جو موتی پرونے کے لائق تھی درستی کے ساتھ کچھ لکھ سکے۔ اور اس دیرینہ آئین کے بارے میں صحیح صحیح کچھ خبر دے سکے۔ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ جستجوئے فراواں کے بعد بھی جو حاصل ہو گا وہ اس لائق نہ ہو گا کہ جس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔“

غالبؔ نے اس موقع پر یہ بھی کہا ہے کہ ”دبستان المذاہب“ نام کی کتاب کا مصنف پارسیوں کی تاریخ اور ان کی تہذیب سے آشنائی کے باوصف جو کچھ کہتا ہے نہ وہ صحیح ہے نہ اُسے کافی و شافی سمجھا جا سکتا ہے۔

آذر کیوان کے بارے میں جو ”دبستان المذاہب“ کا مصنف ہے اُن کی رائے اپنی جگہ صحیح ہے۔ ویسے اس کتاب کو قاضی عبدالودود بھی ایک جعلی تصنیف قرار دیتے تھے۔ غالبؔ کا قدیم ایرانیوں کے بارے میں جو بھی خیال ہے وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے قدیم ”عجمی تہذیب“ جسے ”عیلامی کلچر“ کہا جاتا ہے اپنی جگہ بہت متموّل تہذیب تھی۔ لیکن غالب کا یہ کہنا

تاریخی اعتبار سے محل نظر ہے کہ سکندر ابن فیلقوس یونانی نے ایران کے کتب خانہ برباد کر دیے اور پھر آخر گیارہ سو برس کے بعد عربوں کی فتوحاتِ عجم نے اس تہذیب کے علمی اور ادبی ورثے کو اس طرح برباد کیا کہ خلیفہ کے حکم سے بغداد کے حمام اُن کتابوں کے اوراق کو جلا کر گرم کیے جاتے رہے۔ اس زمانہ تک اتنا کاغذ دستیاب ہی نہ تھا کہ برسوں کتابوں کو جلا جلا کر حمام گرم کیے جاتے رہیں۔ جو خلیفۂ بغداد اور عربوں کے خلاف ایرانیوں میں تعصب اور تفاخر کے زیر اثر مشہور ہو گئی تھیں۔ ان کے پیچھے کوئی سچائی نہ تھی غالب کو تاریخ و تہذیب سے دلچسپی ضرور تھی مگر وہ محقق بہرحال نہ تھے اس لیے زبان قلم سے یہ باتیں بے تکلف صفحۂ قرطاس پر آگئیں یہ کوائف غالب کی زندگی میں سوچ کے سفر کی سمت و رفتار کی بھی نشان دہی کرتے ہیں۔

یہ باتیں سچ تو یہ ہے کہ تاریخی حقائق کے ذیل میں نہیں آتیں بلکہ تاریخ سے وابستہ کیے گئے افسانوں کا حصہ ہیں کہنے کو یہ بات دل چسپ معلوم ہوتی ہے کہ سالہا سال تک کتابیں جلا کر حمام روشن کیے گئے اور آتش پرستی کے مقدس قانون جو صد کتاب و صد ورق کی صورت میں موجود تھے شعلہ ہائے آتش کو واپس کر دیے گئے۔

غالب جیسے کسی ذہین آدمی کے یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس وقت اتنا کاغذ تھا بھی کہاں۔ قرآن پاک کو جب جمع کیا گیا تو ایران کے فتح ہو جانے کے باوجود مسلمانوں کے پاس اتنا کاغذ نہیں تھا کہ وہ اپنی کتاب مقدس تمام و کمال کاغذ پر لکھ لیں۔

بھوج پتر اور لکڑی کی تختیوں پر بعض قدیم زمانے کے متن ملتے ہیں مگر وہ بھی اتنی بڑی تعداد میں نہیں کہ ان سے برسوں حمام روشن کیے جاتے رہیں اور یہ سب کام خلیفہ کے حکم سے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کچھ باتیں فرض کر لیتے ہیں اور وہ ایک مرتبہ جب کسی بڑے آدمی کے قلم سے معرض تحریر میں آجاتی ہیں تو آئندہ آنے والی نسل اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتی ہے۔

غالب کا واقعۂ اسیری

غالب کی زندگی میں بہت سی ناہمواریاں ملتی ہیں جو ان کے حالات، ناخوش گوار واقعات ان کی فضول خرچی اور آمدنی کی کمی نے پیدا کی ہیں۔ قرض خواہوں کی شکایت انھوں نے بہت خطوط میں کی ہے۔ جس زمانے میں نواب شمس الدین احمد خاں کو ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں دار پر لٹکایا گیا تھا اس دور میں بھی وہ قرض خواہوں کی طرف سے ڈگری ہو جانے کے باعث گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے اور صرف رات کے وقت نکلتے تھے۔

انھوں نے خود ایک سے زیادہ خطوں میں ان کا ذکر کیا ہے کہ ان کی پرواز بوم کی طرح شب کی ساعتوں ہی میں ممکن ہے اس وقت تو کسی طرح غالب اسیری اور گرفتاری سے محفوظ رہے لیکن سنہ ۱۲۶۴ھ مطابق سنہ ۱۸۴۷ عیسوی میں وہ اسیری کے دور ابتلا سے گزرے۔ حیرت یہ ہے کہ غالب نے اپنی فارسی اور اردو خطوط میں بہت واقعات ایسے لکھے ہیں جن پر عام لوگ پردہ ڈالے رکھنا زیادہ مناسب خیال کرتے اور خود اپنی ذات سے متعلق سچائیوں کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے ہیں مگر غالب نے انھیں پیش کیا اس پر بھی وہ اپنی گرفتاری سے متعلق سلسلہ واقعات کو کسی خط میں ——— بہ تفصیل بیان نہ کر سکے ہاں اردو کے بعض خطوط میں اس کی طرف اشارہ ہے نیز اس کے اسباب کا مختصراً ذکر بھی۔

حالی کے یہاں اس کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں چوسر اور شطرنج کھیلنے کا بہت شوق تھا اور بقول حالی جب بھی وہ کھیلتے تھے کچھ بد کر

کھیلتے تھے اس طرح کے شوق اس زمانے کے رئیس زادوں میں عام تھے۔

غالب میں انکا ہونا کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ وقت وبخت ان کے مخالف ہوگئے کوتوال دشمن ہوگیا اور اس نے مرزا کے خلاف قمار بازی کا مقدمہ بنادیا مجسٹریٹ غالب کی حیثیت ان کے ادبی مرتبے اور ذاتی کمالات سے ناواقف تھا اس نے چھ ماہ کی قید کی سزا دے دی اور گرفتاری کا وقت آگیا سیشن جج کے یہاں اپیل کی گئی، جو مولانا حالی کی فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں غالب کا دوست بھی تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلف ملاقات ہوتی تھی لیکن اس نے بھی اس موقعہ پر دانستہ تغافل برتا۔ چشم پوشی اختیار کی اور سزائے قید کو بحال رکھا۔

صدر میں اس کی اپیل دائر کی گئی لیکن یہاں بھی اس کی کوئی شنوائی نہ ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ غالب کو اس ابتلا سے گزرنا پڑا۔

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ یہاں ہر طرح کی سہولت تھی کھانا کپڑا گھر سے جاتا تھا مرزا کے دوست بھی باآسانی مل سکتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے نرمی اختیار کی گئی یا پھر مولانا نے اس صورت حال کا ذکر خوبصورتی و پردہ داری سے کیا۔ غالب نے اپنے واقعہ اسیری سے متعلق جو زنداں نامہ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی کو ملنے کی اجازت نہ تھی یا اس میں مشکلات بہت تھیں۔

یار دیرینہ قدم رنجہ مفرما کاینجا
آں نہ گنجد کہ نو درکوبی دمن بازکنم

اے دیرینہ دوستو یہاں ازراہ خلوص آنے کی زحمت برداشت نہ کر کہ اس زندان خانے کا قانون وہ نہیں ہے کہ تم دستک دو یا زنجیر در کھڑکاؤ اور میں دروازہ کھول دوں۔

غالب کا یہ زنداں نامہ۔ــــــــــــــــسات بندوں پر مشتمل ہے اور اشعار کی تعداد چوراسی ہے۔ــــــ

..... پورے ۱۲ یا ۱۱ شعر ہیں مگر غالب نے جو بھی کہا اس کے لیے گویا انہوں نے خونِ دل میں اپنی انگلیاں ڈبوییں اور اس دور گرفتاری کے لمحات کو اپنے شعری تاثر میں ڈھال دیا غالب جب اپنے ذاتی حالات لکھتے ہیں تو ان کے قلم میں غیر معمولی ادبی حیثیت آجاتی ہے یہاں تک کے ان کے قصائد میں جب اس طرح کے شعر آتے ہیں تو قصیدے کا موضوع ہونے کے باوجود ان کی الم انگیزی بھی شفق شام کے ان رنگوں جیسی ہوتی ہے۔ جو اس شکست رنگ کو بھی حد درجہ دلکش بنا دیتے ہیں یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے اور یہ تو بہر حال بیانِ واقعہ بھی ہے اور خود موقعے کا تقاضا بھی تھا یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

پاسبانان بہم آئید کہ من مے آیم
درِ زنداں بگشائید کہ من مے آیم
ہر کہ دیدے بہ در خویش سپاسم گفتے
خیر مقدم بسرائید کہ من مے آیم
جادہ نشناسم دزا نبوہِ شُمامے ترسم
راہم از و در نمائید کہ من مے آیم
عارض خاک بہ پاشیدنِ خوں تازہ کنید
رونق خانہ فزائید کہ من مے آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است
بہرہ از من بہ ربائید کہ من مے آیم

اے پاسبانو! سب مل کر آؤ کہ میں آرہا ہوں قید خانہ کا دروازہ کھول دو تاکہ میں اندر آسکوں جو مجھے اپنے دروازے پر دیکھتا تھا وہ میری ستائش کرتا تھا اب تم بھی میرے خیر مقدم میں کوئی نغمہ پیش کرو کہ میں آرہا ہوں میں اس راستے کو جانتا نہیں ہوں اس وقت نہ جانے کیوں تم لوگوں کے ہجوم سے ڈرتا ہوں اب تم میری دور سے راہنمائی کرو مٹی کے عارضوں کو اپنے خون دل سے نئی تازگی بخشو اور اس گھر کی رونق بڑھاؤ کہ میں آرہا ہوں۔

سخن سنجی اور فرزانگی میرا آئین ہے دستورِ زندگی ہے اب تم مجھ سے کوئی حصہ حاصل کرو آخر میں تمہارے پاس ہوں اور تمھاری طرف آ رہا ہوں ــ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اپنے بارے میں کس طرح کی سوچ رکھتے تھے اور کیا سوچ رہے تھے۔

اس زندانِ غم میں غالب گرفتار رہے، تو ان کے بیان کے مطابق یہ وہ گھر تھا جس کی تاریک راتوں میں کوئی چراغ موجود نہ ہوتا تھا سوائے اس خواب کے جو نگہبان کی آنکھوں میں شعلے کی طرح جلتا تھا یہ ایسا گھر تھا کہ جہاں ہوا کا گذر نہیں ہوتا تھا سوائے لو کے ان جھونکوں کے جو بیاباں کے خس و خار کو جلا دیتے ہیں چند اور شعر ملاحظہ ہوں۔

آنچہ فرداست، ہم اِمروز در آمد گوئی
آفتاب از جہتِ قبلہ، بر آمد گوئی

دل و دستے کہ مرا بود فرو ماند ز کار
شب دردِ زیکہ مرا بود سر آمد گوئی
سرگزشتم ہمہ رنج والم آرد، گفتی
سرنوشتم ہمہ خوف و خطر آمد گوئی

"جو کل ہونا ہے وہ یہ کہیے کہ آج ہی ہو گیا اور آفتاب جو قیامت کے دن مشرق کے بجائے مغرب سے نکلے گا وہ آج نکل رہا ہے مجھے جو دل اور ہاتھ بخشے گئے تھے اب وہ کسی کام کے لائق تھوڑی رہے، (ان میں تو ہتھکڑیاں پڑ گئیں ہیں) اور رات اور دن جو میری زندگی میں شامل تھے وہ ختم ہو گئے اور اب وقت سناٹوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ میری سرگذشت میں سوائے رنج والم کے اور کیا باقی رہا"

باقی تو خیر بہت کچھ تھا لیکن اس وقت غالب نے اسے محسوس کیا اور شدت سے محسوس کیا غالب کی رُودادِ زندگی کا یہ حصہ ہمیں کہیں ان کے خطوط میں ملتا ہے اور کہیں ان کی شاعری میں۔

بعد میں بہر حال ان کے دوستوں کی سعی کامیاب ہوئی۔ سزا میں تخفیف عمل میں آئی اور تین ماہ کے بعد ایسی رپوٹ تیار ہوئی جس کے نتیجہ میں مدت سزا ختم ہونے سے پیشتر ہی (بگمان غالب وہ) زندانِ غم سے نجات پا چکے تھے۔

اس سے ان کی شخصی انا کو جو ٹھیس لگی تھی اس کا اثر ان کے ذہن اور زندگی پر دور تک اور دیر تک رہا جس کا اظہار ان کے متعدد مکتوبات سے ہوتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے قدیم اخبارات سے جو حالات فراہم کیے ہیں اور جن سے مولانا غلام رسول مہر نے بھی استفادہ کیا ہے، ان میں ۲۵ جون ۱۸۴۷ سے پیشتر جو حالات گرفتاری سے پہلے تھے اور اس ضمن میں جو صورت حال بیان کی جا رہی تھی اسے ہم ان سطور میں دیکھ سکتے ہیں۔

"مرزا اسداللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا . . . . . . ریزیڈینٹ کے نام سفارشی خط لکھا گیا کہ ان کو رہا کیا جائے کہ معززین شہر میں سے ہیں۔ عدالتِ فوج داری سے نواب صاحب کلاں بہادر ریزی ڈینٹ نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب ۲۵ جون کو یا اس سے چند روز قبل گرفتار ہوئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کے درباریوں کی بھی یہی رائے تھی کہ یہ گرفتاری صرف حاسدوں کی فتنہ پردازی سے عمل میں آئی ہے۔ اور غالب قمار بازی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ جیل ریکارڈ میں ۲ جولائی ۱۸۴۷ کے حالات میں پھر غالب کے مقدمے کا ذکر آیا اور لکھا گیا ہے۔

"مرزا اسداللہ خاں غالب پر عدالت فوج داری میں، جو مقدمہ دایر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ ماہ کی قید با مشقت اور ۲۰۰ روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر ۲۰۰ (دو سو روپے) جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے

زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل ہیں سوائے پرہیزی غذا کے کوئی اور چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مشقت اور محنت برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج کی عدالت میں اپیل کی جاتے۔ اور اس مقدمے پر نظرِ ثانی ہو تو نہ صرف یہ کہ یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالتِ فوج داری سے یہ مقدمہ اُٹھا لیا جائے۔

یہ بات عدل وانصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال شخص کو معمولی جرم میں اتنی بڑی سزا دی جائے۔[1]

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ اقتباس کا آخری حصہ احسن الاخبار کے نامہ نگار کا تبصرہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ مشقت ۵۰ روپے دے کر ختم کرائی گئی ہو گی۔ اور دو سو روپیہ جرمانہ بھی ادا کر دیا گیا ہو گا۔[2]

جو بھی صورت رہی ہو غالبؔ نے اس کو محسوس کیا اور اس وقتی قید و بند کو وہ بہت زمانے تک فراموش نہ کر سکے خواجہ حالیؔ کے بیان کے مطابق وہ فرماتے تھے۔

" اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گذرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب اس دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ مصر ہے ایران ہے، بغداد ہے یہ بھی جانے دو، خود کعبہ ہے کہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانِ رحمت رحمۃ اللعالمینؐ ہے دلدادگان کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت

---

[1] بحوالہ یادگارِ غالب۔ ص ۲۷ — ۲۸۔ [2] غالب : ۲۱۷

کب آئے گا کہ در ماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے میں نجات پاؤں گا بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں۔

اردو معلیٰ میں تفتہ کے نام ایک خط ہے کہ جس پر دس دسمبر ۱۹۵۲ کی تاریخ ثبت ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

"سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا پورا خلعت پاتا تھا اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے"۔

یہ تاثرات بھی بگمان غالب ان ہی پرچھائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کا تعلق اب سے پانچ برس پہلے کے واقعۂ اسیری سے ہے۔ اس لیے کہ غالب کی زندگی میں اور کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جو ان کے لیے اس حد تک ذلت آمیز اور رسوائی کا باعث امر خیال کیا جائے جس کی جانب غالب کے اپنے الفاظ بھی اشارہ کرتے ہیں۔

غالب کی زندگی بڑی کشمکش میں گزری اس کی وجہ غالب کی افتاد طبع ہے ان کی آزاد روی، جرعہ نوشی۔ ایک گونہ فضول خرچی اور قرض داری ہے، کلکتہ کے سفر کی گراں باری اس پر مستزاد۔ واقعۂ اسیری کی پریشانیاں اور ناخوش گواریاں اس کے ماسوا!۔

اس کی شکایت بھی ان کی زبان قلم پر آتی رہی ؎

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

غالب بیشتر خود کو ایک فن کار کے طور پر پیش کرتے رہے، ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا بھی ان کو رہی۔۔۔ رئیس زادوں جیسے شوق بھی ان کی زندگی میں داخل ہیں کچھ بد کر کھیلنا اسی کا ایک حصہ تھا۔ جس کے نتیجہ میں یہ افتاد پڑی جو یقیناً ایک تکلیف دہ بات تھی۔

خود بیتی لکھی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ وہ اپنے مکتوبات اور اپنی شاعری کی صورت میں اپنی انسانی اور ادبی زندگی سے متعلق اتنا کچھ بکھیر گئے کہ اب اس کا سمیٹنا بھی آسان نہیں، ان کے شعروشعور کی مختلف جہتیں ان کے قطعات قصائد۔ غزلیات وغیرہ میں بہ ادنیٰ توجہ دیکھی جاسکتی ہیں اور ان کی سوانح عمریوں کے ماسوا اُن کے مکتوبات میں ان کے سوانح اور کوائف کو جزئی جزئی طور پر جگہ جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔ —— وہ حالات و خیالات اور وہ سوالات — جن سے غالب کی زندگی عبارت تھی، ان کے حیاتی مطالعے اور نفسیاتی تجزیے میں ان کے یہ قلمی آثار بہت مدد کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا بہت بڑا حصہ روایتی نہیں غالب کے ذہن اور زندگی سے اس کا بہت گہرا رشتہ ہے۔

غالب کو اس گرفتاری کا بہت خیال رہتا تھا اور سچ یہ ہے کہ بہت دنوں تک وہ اس کے سحر سے آزاد نہیں ہوسکے انھوں نے اس کو اپنے کلیات میں بھی شامل نہیں کیا۔ ممکن ہے ان کے دوستوں کا مشورہ اس کا سبب بنا ہو کہ یہ ان کی بدنامی کا باعث ہوگا۔ اس زمانے کے اخبارات میں ان کی اسباب گرفتاری سے متعلق جو باتیں لکھی گئیں ممکن ہے وہ کچھ مبالغہ آمیز ہوں لیکن ان سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صورت حال کتنی تکلیف دہ تھی جس میں غالب کا واقعہ اسیری عمل میں آیا۔

مولوی غلام رسول مہر کے مطابق اس عہد کے گورنمنٹ ریکارڈ سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں شہر دہلی میں قماربازی بہت ہوگئی تھی جس کی وجہ سے ایسے مقامات کے خلاف قدم اُٹھایا گیا بلکہ سخت قدم اُٹھایا گیا، جہاں قماربازی کے اڈّے قایم تھے۔

بہرنوع جہاں قماربازی کا سلسلہ جاری تھا وہاں بہت سے افراد گرفتار کیے گئے اور اسے ہم مستثنیات میں شامل کرسکتے ہیں کہ غالب کی گرفتاری عمل میں آئی مگر یہ اس سلسلے کا کوئی اہم واقعہ نہ تھا اسے ہم غالب کی اُفتادِ حیات ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسے حالات میں گھر گئے کہ اُن جیسا ایک اعلیٰ درجے کا ادیب اور شاعر قماربازی کی لعنت سے محفوظ نہ رہ سکا۔

ہرگوپال تفتہؔ کے نام ایک خط

"اس زمانے میں کہ میری عمر کے روزِ سیاہ کی رات ہوگئی اور تم جانتے ہو کہ روزِ سیاہ تیرہ شبی میں کیسے بدلتا ہے میں تاریکی کے سبب دل تنگ اور تنہائی کے باعث خود سے مصروفِ جنگ ہوں میرے دلِ سودا زدہ کے ماسوا کہ جب وہ مجھے تنہا دیکھتا ہے میری بے کسی پر جل اٹھتا ہے۔ میرے ظلمت کدے میں کوئی اور چراغ نہیں شمع نہیں۔"

منشی نبی بخش حقیرؔ کا بھی ذکر اسی خط میں ہے۔ جن کی ملاقات پر غالب بہت خوش ہیں۔ اور ان کی موجودگی کو بہت بڑی نعمت تصوّر کرتے ہیں۔

اس وقت تک معنی نگاری کرتے ہوئے چالیس برس گزر رہے ہیں آغاز نگارش کے وقت (جب لوح وقلم ان کا مقسوم بنے) از روئے قیاس غالب کی عمر پندرہ برس تھی تو یہ خط سنہ ۱۸۵۲ء میں لکھا جانا چاہیے۔ لیکن اگر موزونیٔ طبع کے آثار دس برس کی عمر میں ظاہر ہوئے تو اب ان کی عمر ۵۰ برس کے قریب ہو جاتی ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں یہ بھی لکھا ہے۔

"شباب ایک حسین رات تھی اور خیال ایک شب زندہ دار اور گرمیٔ نظم و نثر ایک خوبصورت ہنگامہ اب کہ صبح پیری نمودار ہو رہی ہے"......
...... کیا تم نہیں دیکھتے کہ انجمن کے شمع و چراغ افسردہ اور نیم مُردہ ہوتے جاتے ہیں اور شب زندہ داری کے حسین ہنگامے درہم برہم ہو چکے ہیں۔"

غالب کے اُردو اور فارسی کے بہت سے شعر اپنے تصوّر اور تاثر کے اعتبار سے اسی طرزِ فکر اور انداز نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ غالبؔ کے خطوط کا مطالعہ بطورِ خاص ان کے ذہنی سفر اور سیر زندگی پر نظر داری اور تخلیقی حسیّت کی ادا شناسی کے اعتبار سے بے حد اہم ہے جو ذہن کو ان کی روداد زندگی سے بہت قریب لے آتا ہے۔

نواب زین العابدین خاں عارفؔ کی وفات

عارف نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کے نواسہ اوران کی بڑی بیٹی بنیادی بیگم کے نورِ نظر تھے، ان کے والد کا انتقال ان کی بہت تھوڑی عمر میں ہوگیا تھا۔
اس کے بعد غالباً ان کی سرپرستی خود نوابؔ الٰہی بخش خاں معروفؔ نے کی تھی ان کے انتقال کے بعد غالب کی بیگم نے ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا غالبؔ کا سلوک بھی اپنی بیگم کے اس بھانجے کے ساتھ مخلصانہ اور مُربیانہ تھا۔
نواب زین العابدین خاں عارف شاعری بھی کرتے تھے۔ غالبؔ سے اصلاح بھی لیتے رہے ہوں، یہ عین ممکن ہے۔ غالبؔ نے اپنے ایک فارسی قطعہ میں عارف کی تعریف کرتے ہوئے لکھاہے۔

صفحہ ۲۶۱۔

قطعہ :-

آں پسندیدہ خوئے عارف نام
کہ رُخش، شمع دودمانِ مَنَست
آں کہ در بزمِ قرب و خلوتِ اُنس
غمگسار و مزاج دانِ مَنَست

وہ پسندیدہ شخص جس کا نام عارف ہے وہ میرے خاندان کی (اپنے رُخِ روشن کے اعتبار سے) شمعِ تابناک ہے۔ عارف میری محبّت کی انجمن اور تنہائیوں کی محفل میں میرا غمگسار اور مزاج داں ہے۔ اسی سلسلے کے ایک شعر میں غالبؔ نے یہ بھی کہاہے کہ میں تمہارے قلم کی گلفشانیوں سے خوش ہوں کہ وہ میرے گھرانے کا ایک ایسا نخل آرزو ہے جو ثمرافشاں رہتاہے۔
بیگم حمیدہ سلطان نے لکھاہے۔

"وہ طرزِ سخن میں مرزا غالبؔ کے پیرو تھے' ان سے اصلاح لیتے تھے"

عارف سے متعلق بیگم حمیدہ سلطان نے مزید یہ اطلاعات فراہم کی ہیں کہ نواب زین العابدین خاں عارف ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ عارف کو سرکار انگلیشیہ سے ڈھائی سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔

ممکن ہے یہ وہی وظیفہ ہو جو عارف کی شادی کے بعد نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھرکہ کی سرکار سے ان کو ملتا تھا۔ یہ شادی نواب احمد بخش خاں کی بیٹی نواب بیگم سے ہوئی تھی۔ نواب بیگم کا شادی کے دو سال بعد انتقال ہو گیا۔

ان سے کوئی اولاد نہیں تھی ان کی دوسری شادی دہلی کے ایک شریف خاندان میں مرزا محمد علی بخارائی کی لڑکی سے ہوئی جن کا خطاب "نواب دلہن" تھا ان سے دو لڑکے ہوئے' باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔

عارف پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں تپ و اسہال کے عارضہ میں انتقال فرما گئے۔ یہ غالبؔ کے لیے ایک بڑا صدمہ تھا۔ ان کی دوسری بیگم نواب دلہن" کی وفات عارف سے چھ ماہ قبل ہو گئی تھی۔

عارف بستی حضرت محبوب الٰہی میں اپنے نانا نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ عارف کے بعد ان کی والدہ بنیادی بیگم بھی زیادہ دنوں نہ جی سکیں اور راہی ملک بقا ہوئیں۔

اس کا ذکر جو عارف کی جوانا مرگی سے متعلق ہے' غالب کے سوانح نگاروں نے کیا ہے اور اس غزل کا حوالہ دیا ہے جسے عارف کی موت پر غالب کا ایک درد خیز والم انگیز "نوحہ" کہا جا سکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کے چند شعر بہت متاثر کن ہیں ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد وستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیرّ سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش؟
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

یہ اشعار اس معنی میں عجیب و غریب صداقتوں کا مجموعہ ہیں کہ ان سے غالبؔ کی محبت، ان کے خلوصِ خاطر کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔ اور اس ذہنی فضا کا بھی پتہ چلتا ہے جس میں خاندانی تعلقات اور ان سے وابستہ تعینات کی پرچھائیاں بکھری ہوئیں تھیں، خاص طور پر یہ مصرعہ

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیرّ سے لڑائی

نیرّ نواب ضیاء الدین احمد خاں کا تخلص تھا، ان سے اور عارف سے لڑائی رہتی تھی یا اس وقت تھی یہ بھی کچھ کم افسوس کی بات نہیں، لیکن غالبؔ کا یہ کہنا "مجھ سے تمھیں نفرت سہی" خاندانی رشتوں پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالنے والا کلیدی فقرہ ہے، اب صورت حال جو بھی ہو اور اس کے خاندانی اور ذاتی اسباب و وجوہ جو بھی رہے ہوں، اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ نے نواب زین العابدین خاں عارف سے بھی محبت کی اور ان کے انتقال کے بعد ان کے پسماندگان میں چھوٹے بیٹے حسین علی خاں اور بڑے بیٹے باقر علی خاں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اور ان سے ہر طرح پر ہمدردی کی۔

بیگم حمیدہ سلطان نے عارف کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ..."شروع میں وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور ان کے رنگ میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا۔

مگر غالب کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد ان کے رنگ میں کہنے لگے اور ایک اور دیوان "مطلع مہر سعادت" کے نام سے ترتیب دیا۔

عارف کو مشاعرہ کا بہت شوق تھا۔ ان کے مشاعروں میں تمام شہزادے سلاطین زادے اُستادانِ فن اور امرائے شہر شریک ہوتے تھے۔

یہ صرف سخنورانہ ذوق کی بات نہ تھی' اس میں مرتبہ شناسی اور موقع و محل کے مطابق قدم اٹھانے اور مناسب سلوک کرنے کے لیے بڑی نظر داریوں کی ضرورت ہوتی تھی۔

بیگم حمیدہ سلطان نے عارف کے غیر مطبوعہ کلام کے دو نسخوں کی نشاندھی بھی کی ہے۔ ان میں سے ایک ضخیم دیوان قلمی نسخہ کی صورت میں رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے اس کا زیروکس غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے حاصل کیا ہے اس عکسی نسخہ کو راقم الحروف نے بھی دیکھا ہے کاتب بے حد غلط نویس ہے جگہ جگہ ضروری اجزاء متن چھوٹے گئے ہیں، قدیم املا کے ضابطے بھی لفظوں کی قرأت اور تلفظ کی ادائیگی میں مشکلات کا باعث ہوتے ہیں، عارف غالب کے شاگرد ضرور ہیں مگر ان کی روشِ فکر اور طرزِ ادا کی پیروی وہ بالکل نہیں کرتے ان کی غزلیں بیشتر طویل الذیل ہیں ۔ اشعار میں اکثر قافیہ پیمائی کرتے نظر آتے ہیں' ان کے یہاں جو مضامین حال و خیال ملتے ہیں وہ بھی عمومیت کا رنگ لیے ہوتے ہیں ان کو محاورہ بندی کا بھی زیادہ شوق نہیں ــــــ

ــــــ روزمرہ کی پابندی وہ ضرور کرتے ہیں فارسی تراکیب بھی ان کے یہاں نہیں ملتیں ان باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا فنی شعور اور فکری اسلوب کبھی عارف کا شعری آئیڈیل نہیں رہا،

ان کی شاعری ان کی اپنی جذباتی سطح اور حسیت کی ترجمان ہے یا پھر اس زمانے کے عام شاعرانہ مزاج ادبی معیار اور مشاعروں کے ماحول سے متاثر ہے،

دوستانہ تعلقات اور بے تکلفانہ روابط کا اندازہ ان ادبی فرمایشوں اور ان کی تعمیل سے بھی ہوتا ہے۔ اپنے بعض مکتوبات میں غالب نے دوستانہ انداز کی اپنی خواہشوں اور فرمایشوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

ایک دفعہ غالبؔ کو شدید گرمی کے زمانہ میں کسی انگریز افسر سے ملنے کے لیے جانا تھا۔ تو مرزا نے ان کو خط لکھا اور پالکی طلب کی۔

"آج ایک انگریز افسر سے ملاقات کی غرض سے جانا ہے۔ ان صاحب کا مسکن چونکہ بیرون شہر ہے۔ اور باغ محلّ دار خان کے قریب ہے، ماہ فرداد کی شدید گرمی کے باعث طبیعت خوف زدہ ہے۔ اگر آپ بینس مرحمت فرما دیں تو گویا تمازت آفتاب سے تپتی ہوئی راہ کا سفر آپ کے سایۂ عاطفت میں سکون واطمینان سے ہو سکے گا۔" [1]

نواب صاحب کے نام ایک اور خط میں غالب نے نواب امین الدین خاں کی کسی خاص معاملے میں سفارش کی ہے۔ اور لکھا ہے "لالہ ہری چند صاحب نواب امین الدین خان بہادر کا خط لا رہے ہیں۔ یہ خط کرنیل اسکنر صاحب بہادر کے نام ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ لالہ صاحب حضرت والا کے ہمراہ کرنیل اسکنر کے حضور میں اس عرض نامے کو پیش کریں اور جناب کی زبان گوہر فشاں کی بدولت اپنے مدعائے دلی کو پہنچیں۔ لالہ صاحب چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ رہوں۔ جبکہ میں خود کسی لائق نہیں ہوں۔" [2]

ان ہی کے نام اپنے ایک اور خط میں غالبؔ نے یہ خواہش کی ہے کہ نواب صاحب سفارش کر کے انھیں (اندرجیت اور ہیرالال سے روپیہ قرض دلوادیں۔ یہ خط غالبؔ کی مالی مشکلات کو سمجھنے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

"اب میں اپنا فائدہ اسی میں دیکھتا ہوں کہ ملازمانِ بارگاہ کسی کو بھیجیں اور اندرجیت و ہیرالال کو بلائیں ان کو اپنے دیوان خانے میں بٹھائیں۔ انھیں کے ساتھ مجھے بھی یاد فرمائیں۔ جب وہ لوگ

[1] اوراقِ معانی: [2] ایضاً

آجائیں تو باتوں کا سلسلہ شروع کریں اور جو کچھ بھی کہا جائے ماحصل اس گفتگو کا یہ ہو کہ اسداللہ تمہارا دام پرست یعنی قرض خواہ ہے۔ وہ اندوہِ تنگ دستی سے بے طرح خستہ دل ہے اور بے زری نے اس کو بے طرح عاجز و درماندہ کر رکھا ہے۔ اسے ایک ہزار روپیہ قرض دے کر اس کے کام آؤ۔ تمھاری یہ سعی ہرگز ضائع نہ جائے گی بلکہ یہ بات تمھارے اور اس بیچارے کے لیے سودمند ثابت ہو گی

اسی زمانے میں ہم ایک اور خط کی سیر سے گذرتے ہیں جس میں غالب نے ایک سکّے کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ کہا ہے" ایک مسکوک بنام گرو گوند سنگھ، کہ والیِ لاہور کے فرمان کے مطابق اس سرزمین میں رائج ہے، مجھے سپرد کیا گیا ہے اور مجھ سے یہ خواہش کی گئی ہے کہ میں اسے الہ آباد بھیج دوں، تاکہ ایک نئے سکّے کو دیکھ کر مشاہدہ کرنے والے کا دل خوش ہو" غالب نے اس کو روانہ بھی کیا۔ لیکن محکمہ ڈاک نے اسے لینے سے انکار کر دیا کہ ایسے کسی ملفوف کو قبول نہیں کیا جاسکتا جس میں سکّہ موجود ہو۔

غالب نے اسی خط میں مولوی محمد علی خان صدر امین باندہ کے وارثوں کے متعلق بھی یہ ذکر کیا ہے کہ وہ آپس میں آویزشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار ہیں۔ یہ وہ صورت ہے جو ہمارے یہاں صاحب حیثیت شخصیتوں کے انتقال کے بعد ان کے وارثوں میں اکثر دیکھنے کو ملا کرتی ہے۔

سید علی خاں بہادر غمگین عرف حضرت جی غالبؔ کے کرم فرماؤں میں تھے۔ [یہ وہی بزرگ ہیں جن کی خانقاہ سے قصہ مہر افروز و دلبر کا نادر و نایاب نسخہ ملا تھا] انھوں نے اپنے کسی خط میں غالب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہو گی، اس کے جواب میں غالب نے لکھا کہ "نیکوئی میں میرا یہ درجہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کہ کوئی غالبؔ کی تعریف کرے اور اسے دیکھنے کا آرزومند ہو۔

"اور وہ بھی ایسا کوئی بلند پایہ اور اعلیٰ مرتبت شخص جو اپنی ذات کے اعتبار سے آبروئے ہفت دریا ہو۔"

آگے چل کر غالب نے پنشن کے مقدمہ کے سلسلے میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ میں کیا کروں ایک مُدّت سے میری ہمّت ایک کام میں اٹکی ہوئی ہے۔ اور وہ ایک بہت ہی نازک کام اور مَطلبِ مشکل ہے۔ اب سے پہلے کئی سال تک ریزیڈینٹ دہلی کی سرکار میں میرا مقدمہ معرضِ کشاکش میں رہا۔ مزید ایک اچھے خاصے لمبے عرصے تک کلکتہ کی دادگاہ میں پیچ وتاب کھاتا رہا۔ اب عرصہ دو سال کا ہوا کہ وہ داوری گاہ لندن میں پیش ہے۔ اور اس پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ جب تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا، میں یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا۔ سوچ رہا ہوں کہ جیسے ہی ولایت سے قطع خصومت حکم نامہ آجائے گا۔ میں بغیر کسی تاخیر کے گوالیار کا سفر اختیار کروں گا۔ مگر اب تو قدم اٹھانا بھی ممکن نہیں۔

غالب نے ایک خط منشی فضل اللہ خاں کو لکھا ہے یہ خط حکیم احسن اللہ خاں کی جانب سے ہے۔ اس میں عرقِ کیوڑا بھیجنے کا شکریہ ادا کیا ہے اب ظاہر ہے کہ یہ غالب کے خیالات نہیں پھر بھی یہ مکتوب ان کے اندازِ گل افشانی گفتار کا نمونہ ہے۔ غالبؔ دُکھی رہتے ہیں، طرح طرح کے افکار اُن کو ستاتے رہتے ہیں اور پریشان روزگار بنائے رکھتے ہیں پھر بھی ان کی طبیعت، حسن کاری اور ادب نگاری پر آمادہ رہتی ہے۔ "زلالِ مشک بو جو ارمغاں کے طور پر بھیجا گیا ہے نام اس کا عرقِ کیوڑا ہے۔ یہ وہ آبِ معطّر ہے جس کی خوشبو روح کو آسودگی اور جس کی جرعہ کشی خرد کو افزونی بخشتی ہے۔ یہ وہ آب نشاط انگیز (مئے ناب) نہیں ہے جس کی خوشبو سے مبارک فرشتے روگرداں ہوں اور جس کو پینے سے تر دامنی لازم آئے . . . . . ."

اس طرح کی عبارت آرائیاں ان کے اکثر خطوط میں مل جاتی ہیں

اس طائفے کے دل زدگان کی شورش کو کسی دوسری زبان کے لب و لہجہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا اور اس کی سخن طرازی گفتارِ پارسی کے اپنے رنگ و آہنگ میں صورت پذیر نہیں ہو سکتی۔

غالب کو فارسی زبان اور شاعری کے بارے میں جب بھی کچھ کہنے کا موقع ملتا ہے، وہ اردو پر فارسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح کی فکر رکھنے والے غالب سے کافی پہلے بھی موجود تھے اور غالب کے بعد بھی موجود رہے۔ اس کا تعلق ادبی اور لسانی "تفاخر اور تعصب" سے بھی ہو سکتا ہے اور تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی غالب کے رویئے میں جذباتیت بہر حال کچھ زیادہ ہے اور غیر ضروری۔

. . . غالب نے ریختی کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور اس ضمن میں یہ کہا ہے "دہلی اور لکھنؤ کے چند شعرائے ریختہ گو نے طرح تازہ ڈالی ہے اور عورتوں کی اپنی بولی ٹھولی میں ایک دل آویز رنگِ تغزل کو رواج دیا ہے۔ اس صنفِ شعر کو "ریختی" کہتے ہیں زبان دری میں "واسوخت" کہنا ایسا ہی ہے جیسے اس پاکیزہ زبان میں ریختی کہنے کی سعی کرنا واسوخت میں پیش کش کا جو انداز اختیار کیا جاتا ہے وہ فارسی میں آ ہی نہیں سکتا اور نثر میں تو اس کا کوئی امکان نہیں نظم میں بھی اردو زبان جیسا لطف اس میں پیدا کرنا ممکن نہیں۔"

منشی فضل اللہ خاں جو راجہ الور کے دیوان ہیں، ان کو غالب نے خط لکھا ہے اور اس میں کسی ایسے خط کا بھی ذکر آ گیا ہے جو غالب کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ یہ کسی مخالف کا خط ہونا چاہیئے۔ اسی لیے غالب نے اس خط کے حوالے کے ساتھ لکھا ہے:

"بہر نوع اپنے برادرِ والا گوہر سے پوچھیے اس نوشتہ کے بارہ میں جو لکھا نہیں گیا اور اس پُر استعارہ تحریر کے متعلق جو بھیجی نہیں گئی آپ تک اسے کس نے پہنچایا۔ صاحب من یہ حکایت ہے شکایت نہیں، تکلم ہے تظلم نہیں۔

اس خط کو ختم کرنے سے پہلے وہ لکھتے ہیں "وہ رنگ جو افزائش نگاہ کا باعث ہے وہ کہاں اور وہ "جرعۂ انبساط" جو راحتِ روح کا سبب ہو، وہ کیسے میسر آئے اس بزمِ دل نشین کے دوست اب کہاں سے آئیں"!

محمد علی بہادر خاں کے نام جو مرزا حیدر کے عُرف سے مشہور تھے اپنے ایک خط میں اپنا تعارف کرایا ہے اور لکھا ہے۔

جناب والا نے سنا ہوگا کہ شہر دہلی میں ایک آزادہ مزاج آشفتہ سر سخن ور رہتا ہے جو اپنی آشفتہ نوائی کو رنگینی بخشنے کے لیے خونِ دل پیتا ہے اور خود کو غالب کہتا ہے، اسی عبارت کی ذیل میں یہ شعر آیا ہے۔

غالب نام آورم، نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

میں غالب نام آور ہوں میرا نام و نشان کیا پوچھتے ہو۔ میں اسد اللہ بھی ہوں اور اسد اللّٰہی بھی، اودھ دربار سے غالب کا جو تعلق تھا وہ اتنا براہِ راست نہیں جتنا دوسروں کی معرفت تھا اور بڑی حد تک ستایش کی تمنا اور صلے کی پروا جس میں کشمکش کا باعث بنی رہی۔

غالب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے "اس نیاز مند نے شاہ انجم سپاہ حضرت سلطان عالم کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور ایک عرض داشت نثر میں بھی تحریر کی تھی اس قصیدے اور عرض داشت کو قطب الدولہ کی نظرگاہ میں بھیج دیا تھا۔

قطب الدولہ نے اسے سلطانِ دارا دربان کی نظر گاہ والا تک پہنچا دیا اور مولانا حمید سلمہٗ نے اس نظم و نثر کو شاہی فرمان کے مطابق اسی ادائے خاص کے ساتھ پڑھا کہ بزم شاہی میں گوہر ہائے شاہ وار سمیٹ دیے بادشاہ نے قطب الدولہ کو حکم دیا کہ کسی دوسرے وقت اس عرض داشت کو پیش کیا جائے تاکہ سائل کی امیدوں پر جائزہ سلطانی کی بارشِ کرم کی جاسکے لیکن ابھی اس کا وقت نہ آیا تھا کہ ناگاہ وہ محفل درہم برہم ہو گئی اور قطب الدولہ کی جاہ مندی کا سورج ڈوب گیا۔ اس غریب نے عرض داشت اور قصیدہ مجھے واپس کر دیا اور جو میں نے اس تک پہنچایا تھا وہ اس نے مجھ تک پہنچا دیا۔

یہی شیوہ مکری شیخ امام بخش ناسخ خواجہ حیدر علی آتش اور لکھنؤ کے دوسرے تازہ خیالوں کا ہے۔

معلوم نہیں غالب یہ بات بار بار کیوں دہراتے ہیں — نواب صاحب ہی کو ایک اور خط میں لکھا ہے۔

"اب کہ میری طبیعت کے زلال میں وہ روانی اور فکر کی آگ میں وہ گرمی و درخشانی باقی نہیں رہی . . . . شاعری کے سلسلے میں روز ازل جو کچھ میری زبان کو بخشا گیا تھا وہ کہا جا چکا یہ خیال نہ فرمایا جائے کہ میں بطور تصنع یہ باتیں لکھ رہا ہوں۔ مجھے دیکھئے اور دفتر اشعار پر نظر ڈالیے کہ اس غزل کے ماسوا جس کا مقطع و مطلع سنایا جا چکا ہے کوئی زمین خاطر میں ہوتی تو کوئی غزل ضرور ہو جاتی جو کچھ گذر چکا ہے وہی نظر سے گذر رہا ہے۔ اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہی دوبارہ نذر قرطاس ہو رہا ہے۔"[1]

اس سے ہم اس دورِ زندگی میں غالب کے نفسیاتی ماحول اور ذہنی کوائف کو بھی کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔

غالب کی حساس طبیعت: ورزندگی کی دشوار راہوں میں ان کے سفر حیات کا ایک رہ آورد ہے غبار خاطر، جس کو وہ اپنے روشن وسفاف ذہن اور اس زلال طبع کے مقابلہ میں گاہ گاہ ابھرتا اور ان کے حسنِ طبیعت اور بالیدگی فکر پر اپنی پرچھائیاں ڈالتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ ان کی نفسیات کو ہم ان کے ان اشعار میں پرتو فگن دیکھتے ہیں:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل

انساں ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

ان کے مزاج کی خوش آئینی اور طبیعت کی شگفتگی کی خبر دیتی ہے۔

غالب ۔۔ اپنے اِس دور یا اُس دور میں اپنے افکار کو پیش کرتے ہیں تو ادبی خیالات ونظریات کو بھی زبان قلم پر لاتے ہیں۔

منشی رحمت اللہ خاں کے نام ایک خط میں کسی فرمائش کی تکمیل نہ کر سکنے پر معذرت طلب کی ہے اور لکھا ہے اس کی انجام دہی ممکن نہ ہوئی۔ خواہش کی پذیرائی اور خدمت کی سرانجامی منحصر اس پر ہے کہ قلم صفحہ نوردی اختیار کرے اور سخن کے گو ہر شب چراغ کی روشنی میں راستے کی جستجو کرے۔

(آگے چل کر لکھتے ہیں:) کس حد تک پراگندہ سخن ریزوں کو یکجا اور فراہم کیا جائے کہ فارسی زبان بالخصوص نثر میں "واسوخت" لکھا جا سکے۔ پہلوی زبان کے زور آوروں میں سے میرے علم میں کوئی ایسا نہیں کہ جس نے ان روشوں میں اپنی تابِ سخن کا مظاہرہ کیا ہو۔ ملا وحشی (یزدی) کہ خراسان کے سخن وروں میں ہے اس نے ایک جریدہ نظم مُسدّس کے انداز میں لکھی ہے کہ لوگ اسے "واسوخت" کہتے ہیں، ہر چند میں اپنے حافظے پر اعتماد نہیں کر سکتا پھر بھی ممکن ہے یہ بیت اسی مسدّس کا ہو۔

تو نہ آئی کہ غم عاشق زارت باشد

ور شود خاک، برآں خاک گزارت باشد

تو "وہ" ہے ہی نہیں کہ تجھے اپنے عاشقِ زار کا غم ہو اور وہ مر بھی جائے تو اس کی خاک پر بھی تیرا گذر ہو۔ یعنی اس کا بھی امکان نہیں کہ تو اس کی قبر پر بھی ایک بار آ جائے .... اگر دیدہ ور اور دانا دل فراہم ہوں اور مُلا کے واسوخت کو لکھنؤ کے اردو شعراء کے واسوخت کے مقابلے میں رکھ کر پڑھیں تو حاشا یہ ممکن ہی نہیں کہ شورانگریزی اور ذوق افزائی میں ـــــ ـــــ فارسی ہندی کے مقابلے میں آ سکے۔ پہلوی اور فارسی کی شان اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ اسے اس درجہ تک نیچے لایا جائے۔

مظفر حسین خاں کے نام ایک خط ۔۔ سات شعروں کا ایک قطعہ ہے جس کا ایک شعر ہے۔

مشکل اُفتادہ است، درد فراق،
با مظفر حسین خاں، گفتن

اس مکتوب میں غالب نے اس کا اظہار کیا ہے۔

"عالم جوانی میں جب میرے کالے بالوں سے زیادہ میرا چہرہ میرے اعمال کی وجہ سے سیاہ تھا اور پری رُخوں سے محبت کا سودا میرے سر میں چھایا ہوا تھا زمانہ میرے ساغر کو بھی اس زہر آبہ ۔۔۔"

"کتنے روز ہائے روشن مجھ پر گذرے ہیں کہ میں اپنے محبوب کے غم فراق میں سیاہ پوش اور پلاس بدوش رہا ہوں اور کتنی سیاہ راتیں ایسی بھی آئی ہیں کہ میں اپنی خلوت غم میں پروانے کی طرح شعلہ در آغوش اور شمع خاموش کی طرح اشک بار رہ کر گزاری ہیں۔"

غالب نے اپنی محبوبہ کے غم کا اظہار اردو کی ایک دو غزلوں میں کیا ہے اب اس پر حیرت ہوتی ہے کہ اس خط میں وہ اس رازِ سربستہ کو زلفِ محبوب کی طرح کھولتے نظر آتے ہیں۔

وہ میری، ہم خوابہ جسے رشک کی وجہ سے میں خدا کو بھی نہیں سونپ سکتا تھا زمانے کا مجھ پر کتنا بڑا ستم ہے کہ میں اس کے تنِ نازنین کو خاک کے سپرد کر دوں میری وہ محبوبہ دل نواز جسے نگاہِ نرگس کی چشمِ زخم کے ڈر سے گُل گشت چمن کی دعوت بھی نہیں دی جا سکتی تھی اس کی نعش کو میں گورستان لے جاؤں۔

خاک خوں باد کہ در معرضِ آثارِ وجود
زلف و رخ در کشد و سنبل و گُل باز دہد

اس خاک کا دل خون ہو جائے جو آثار وجود کی عرض گاہ میں زلف رخسار کو اپنے پردے میں چھپالے، خود

کو دیکھوں اور اپنے کام وزبان کی تراوشوں کو تمھیں بطورِ تحفہ بھیجوں . . . . لیکن اس کی فرصت کہاں اور اس کا دماغ کسے اتنی دستاری اور غم خواری کی امید بھی کسی سے نہیں کہ میں اپنے قلم سے جو ورق لکھ دوں کوئی اُس کی نقل ہی کر دے یا جب میں نظر ثانی کی نظر سے اوراق کو اِدھر اُدھر کروں تو پھر کوئی ان منتشر کاغذوں کو اکٹھا ہی کر سکے۔"

اس سے مسودہ سازی اور نقلِ اوراق کا حال معلوم ہو سکتا ہے حکیم احسن اللہ خاں کو بھی انھوں نے اپنی اس خواہش اور حقیقتِ حال سے آگاہی بخشی ہے۔

"میں جانتا ہوں اور میرا خدا کہ میں اپنے پراگندہ نثر پاروں کو کبھی جمع نہیں کر سکا بلکہ خود کو اس کشائش سے الگ رکھا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے قلم کے یہ نقوش و آثار یا تو لایعنی صورتوں کے زُمرے میں آئیں گے یا انھیں رقوم خوش جوہر کے سلسلے سے منسلک کیا جائے گا پہلی صورت میں کیا ضروری ہے کہ خود کو ایک بے قیمت شے کے بدلے فروخت کیا جائے اور آیندہ ان نقش ہائے صورت کے دیکھنے والوں کی ناپسندیدگی کو مول لیا جائے۔ ..

... دوسری صورت میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ جانے والے اپنے ساتھ کیا لے گئے جو ہم لے جائیں گے اور جس کے حصول کی آرزو ہمیں اس درجہ بیتاب رکھے۔ آگے چل کر اسی بات کو اس طرح کہا ہے "کس سے پوچھوں کہ میری جدتِ طبع کے نتائج کیا ہیں۔؟ اور میں نے اس جگر سوزی میں کیا لذت پائی ہے۔"

وہ ان چند سطور میں جو دیوان ریختہ کے لیئے بطور دیباچہ معرض تحریر میں آئی ہیں

ان سے اس کا اظہار ہوتا ہے کہ اپنے دیوان ریختہ کی جمع آوری اور مسودہ سازی کے وقت تحریر و نگارش جمع آوری و نقل برداری میں غالب کی مشکلات کیا تھیں اور وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی کاوش کے سلسلہ میں کیا سوچ رہے تھے۔

وقت گزر جاتا ہے تو اکثر یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کام کے انجام دہی میں کس کے سامنے کب اور کس مرحلہ میں کیا دشواریاں تھیں۔ وہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں دیوان

ریختہ کہ میرے سویداءِ دل سے لکھا گیا ہے' اسے بطور خاص خدمت عالی میں بھیج رہا ہوں۔

جو بات یہاں اس حوالے یا اُس حوالہ سے سامنے آئی ہے' مولوی سراج الدین کے نام ایک مکتوب میں اس کا تذکرہ نسبتاً زیادہ واضح صورت میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔ اور ان سے خطوط کی فراہمی کی خواہش کی ہے۔

" میں ابھی سفینہ' نثر کی تکمیل کے بارہ میں کچھ نہیں کہتا۔ کہ وہ تو جناب والا کی نگاہ لطف پر منحصر ہے۔ اور آپ کی یہ چشم عنایت اس کے ماسوا اور کیا ہے کہ میری اپنی نگارشات جو جناب والا کی نگاہ میں ہیں' مجھے واپس بھیج دی جائیں۔ تاکہ انہیں انتخاب اور التقاط کے طور پر اس مجموعہ میں شامل کر لیا جائے۔"

اسی زمانے میں اپنے ایک دوسرے نگارش نامہ میں یہ اطلاع فراہم کی ہے

میں بہت دنوں سے یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ میری نظم و نثر سے فراہم ہوا ہے اس کو نظر گاہِ قبول سے روشناس کراؤں' ان میں الحال اپنے منتخب دیوان ریختہ کو حضرت مولوی غلام امام شہید کے بندگان عالی مثال کے سپرد کرتا ہوں کہ اس کے لیے اس سے زیادہ روشن آئینی کی کوئی اور صورت نہ ہوگی۔[1]

غالب نے ایک سے زیادہ موقعوں پر یہ لکھا ہے کہ ان کا کلام کبھی ان کے پاس نہیں رہا۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے ہنگامہ سنہ ۱۸۵۷ء میں ان کے گھر اجڑ گئے ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہو گئے اب وہ اپنا کلام دیکھنے کو خود ہی ترستے ہیں' ہنگامہ' ۱۸۵۷ء کے دوران ایسا کچھ ہونا بھی ممکن ہے مگر غالب کے دیوان ریختہ اس ہنگامہ سے سولہ سترہ برس پہلے منتخب صورت میں ترتیب پاکر شائع ہو چکا تھا اور اس کی تدوین میں غلام امام شہید کا بھی بقولِ غالب ایک کردار تھا۔ کہ ان اوراق کی ترتیب و تدوین میں ان کا دستِ تعاون شریک حال دخیال تھا۔

---

[1] اوراق معانی؛ ص ۱۳۷۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور خطوط غالب

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ غالبؔ کے لیے دوسرے اہلِ شہر کے ساتھ بہت سی پریشانیوں کا سبب بنا رہا، انہوں نے اس ہنگامے میں انگریزی عمل داری کے خلاف یا اُس کی حمایت میں کوئی حصہ نہیں لیا، ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ اپنے گھر میں ایک طرح سے نظر بند ہی رہے، کہیں آئے گئے بھی نہیں۔

بہادر شاہ ظفرؔ انگریزوں کے باغی سپاہیوں کے ساتھ اس معنی میں شریک ہو گئے تھے کہ وہ ان کے حامی اور ہمدرد تھے، دہلی میں ان باغی سپاہیوں کی سرگرمیاں بہادر شاہ ظفرؔ کے نام پر اور ان کی حمایت کے ساتھ مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر ستمبر ۱۸۵۷ء تک جاری رہیں، بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ رہنے کے باوجود ایسی کوئی قابلِ وثوق شہادت موجود نہیں جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ وہ باغی سپاہ کے معاون یا مددگار رہے، پھر بھی ۱۸۵۷ء کے اس ہنگامے کے گزر جانے کے بعد وہ انگریزوں کے معتوب رہے، ان کا وظیفہ بھی بند رہا اور دربار و خلعت بھی موقوف ہوا، جس کی بحالی کے لیے انہیں کافی جدوجہد کرنی پڑی اور انگریزوں کے حامی بعض بڑے لوگوں نے ان کے حق میں سعیؑ و سفارش کی اور آخر اُن کا خاندانی وثیقہ اور دربار بحال ہوا۔

اس ہنگامے کے گزرنے پر جسے غالبؔ ''رستخیزِ بیجا'' کہتے ہیں، شہرِ دہلی کو جن مصائب و مشکلات سے گزرنا پڑا اُس کی روداد غالب کے اردو خطوں میں محفوظ اور اپنی بعض تفصیلات کے ساتھ موجود ہے، جسے بعض اقتباسات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

غالب نے اپنے احباب اور شہر کے معزز افراد کی گرفتاریوں نیز وقت کی تباہ کاریوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ان میں خاندان لوہارو کی مصیبتیں بھی شامل ہیں۔

جب شہر فتح ہوا تو نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ تین ہاتھیوں اور چالیس گھوڑوں سمیت لوہارو کی طرف روانہ ہوئے۔ دو تین روز آرام کی غرض سے مہرولی میں ٹھیرے اس اثناء میں لشکریوں نے اُن کا سامان لوٹ لیا اور صرف تین ہاتھی باقی رہ گئے وہ بے سروسامانی کی حالت میں دوجانہ پہنچے . . . . .

. . کمشنر دہلی کو ان کے حالات کی اطلاع ملی تو امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں کو اپنے پاس بُلایا ، بات چیت کے بعد درمیان میں صفائی ہوئی۔ دیوانِ خاص کے پہلو میں قلعہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ . . . . . دہلی میں ان کے مکان میں پتھروں اور اینٹوں کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔ چاندی سونا اوڑھنے بچھانے اور دوسرے استعمال کی چیزوں کے نقصانات کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے شہر اور اہل شہر کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا غالب نے اُن کا ذکر اپنے بہت سے خطوں میں کیا ہے۔

شہر کی ویرانی کا ذکر اِن الفاظ میں کرتے ہیں۔

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں اور دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے کوئی میرے پاس آوے تو شہر میں ہے کون جو آوے گا۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سزا پاتے جاتے ہیں شہر میں جرنیلی بندوبست ہے۔ کچھ نیک و بد مجھے نہیں معلوم ہنوز ایسے اُمور کی طرف حکام کی توجہ بھی نہیں ، انجام دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" [1]

آگے چل کر بہت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ واللہ

---

[1] اردوئے معلّٰی :

ڈھونڈے کو اس شہر میں کوئی مسلمان نہیں ملتا جو ہیں سو باہر کے ہیں۔ آبادی میں صرف ہندوؤں کے ساتھ رعایت کی گئی ہے اور مسلمانوں پر بہ دستور شدت کا عمل جاری ہے۔ بلا اجازت کسی کو شہر میں قیام کی رُخصت نہیں۔ شہر کے دروازوں پر پہرے بیٹھے ہیں"۔

مرزا کے دوستوں اور شہر کے ممتاز لوگوں میں علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی بھی شامل تھے۔ یہ ریاست "جھجر" چلے گئے تھے۔ اور ۱۸۵۷ء کے دوران اسی سرکار سے وابستہ تھے۔

جب نواب صاحب جھجر پر انگریز حکومت کا عتاب نازل ہوا تو مولانا فضل حق کیسے اس عتاب سے محفوظ رہتے، گرفتار ہوئے اور "عبورِ دریائے شور" کی سزا دی گئی... کالے پانی بھیج دیے گئے۔ اُس زمانہ میں "انڈمان نکوبار" کے جزیروں میں مجرموں کو بھیج کر سزا دی جاتی تھی۔

مولانا فضل حق کے علاوہ اور نہ جانے کتنے لوگ تھے۔ جو... دہلی سے چلے گئے تھے یا موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے تھے۔ غالب کے لیے غدر کے سانحہ میں جو حادثات کا مجموعہ تھا یہ صورتِ حال بھی بہت تکلیف دہ تھی جس کے لیے انھوں نے لکھا ہے۔

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی تباہی و بربادی کے غم میں مرتا ہوں جو دُکھ مجھ کو ہے اس کا حال تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ انگریز کی قوم میں جو اِن روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے ان میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا، کوئی میرا شفیق کوئی میرا دوست، کوئی میرا یار . . . ہندوستانیوں میں کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب خاک میں مل گئے، ایک ہی عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اَب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔

یہاں کے اہل علم میں مولوی امام بخش صہبائی بھی تھے اُن کو بھی بغاوت کے الزام میں ماخوذ کر کے توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ طالع یار خاں ایک ایسے شخص ہیں جن کے دو جوان بیٹے ٹونک سے دہلی آئے ہوئے تھے' ہنگامۂ غدر کے باعث نہ جا سکے آخر اس گیر و دار میں موت کے منہ میں پہنچ گئے۔"

مولانا غلام رسول مہر نے منشی جیون لال کے روزنامچے میں آمدہ ایک اطلاع یہ بھی فراہم کی ہے کہ غالب نے بادشاہ کے لیے اس زمانے میں کوئی سکہ کہا تھا غالب نے اپنے خطوط میں اس کا ذکر بار بار کیا ہے۔ مگر یہ کہا ہے کہ وہ سکہ ذوق کا کہا ہوا تھا اور کسی اور موقع پر کہا گیا تھا۔ غالب نے نہ خود اسے کہا تھا ' نہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے دوران کسی تقریب میں پیش کیا تھا۔

یہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا جب انگریزوں کی عمل داری ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنے دوستوں ساتھیوں اور خیر خواہوں کی حفاظت اور بقا کے لیے شہر میں موجود ہی نہیں تھے تو پھر باغیوں کے ظلم وستم اور جابرانہ اقدامات سے بچنے کے لیے اگر کسی نے کوئی قدم اُٹھایا تو یہ کیسے مان لیا جائے کہ وہ باغیوں کا وفادار بن گیا تھا اور انگریزوں سے غداری پر آمادہ تھا — اپنے جاسوسوں کی شہادت اور خفیہ خبروں کے زیر اثر' دہلی پر دوبارہ قبضہ کے بعد انگریزوں نے جو اقدامات کیے اور سختیاں روا رکھیں' بے گناہوں کی جان لینے میں بھی تامل نہ کیا اس کے لیے وجہ جواز تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔

غالب کیا کرتے اور کیسے کرتے کسی کی جان و مال محفوظ نہیں تھا بڑے بڑے صاحبان حیثیت اور اہل اقتدار حالات کی ناسازگاریوں میں پھنس گئے تھے بعض ریاستیں ختم کر دی گئی تھیں، جاگیریں' جائیدادیں اور املاک ضبط ہو رہی تھیں' ہنگامۂ غدر کے فرو ہونے کے بعد بھی قیامت کا سا ہنگامہ برپا تھا تین چار برس اسی کشمکش و آلام میں گزر گئے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران اور اس کے بعد دہلی
پس طرح کی جذباتی قیامتوں سے گزری خاص طور پر یہاں جو اہل فکر اور ارباب
فن رہتے تھے ان پر کیا گھڑی بیت گئی آدمی اپنے ماحول سے ایک خاص طرح کی
اُنسیت رکھتا ہے اور اس کو اپنے ذہن اور زندگی کے لیے ایک مانوس فضا خیال کرتا
ہے، اُسی میں سانس لینا چاہتا ہے بلکہ یہ کہیے کہ اسی میں جینا اور مرنا چاہتا ہے، مگر ایسا
ہوتا نہیں۔ وقت بدلتا ہے حالات کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں، مانوس چہرے نگاہوں
سے اُوجھل ہو جاتے ہیں اور شناسا آوازیں وقت کے سناٹوں میں گم ہو جاتی
ہیں اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ میں اور میری زندگی بتا رہی ہے
کہ میں خود ایک گذرتا ہوا بلکہ گریز پا سایہ ہوں۔

بھائی بند۔ دوست احباب اپنے بیگانے ، در و دیوار کوچہ و برزن
گلیاں اور بازار سبھی تو اس کی زندگی کا حصّہ ہوتے ہیں، وہ ان سے الگ ہو کر
خود کو اجنبی محسوس کرتا ہے ــــــ یوں تو انسان بھیڑ میں بھی تنہا ہوتا
ہے لیکن غالب جس شہری ماحول میں اس ہنگامہ کے بعد جی رہے تھے، اس کے
شاندار ماضی کو یاد کر رہے تھے، اگر ہم اس دور کی تفصیلات میں جائیں اور خود
غالب کے یہاں دن بدن، ماہ در ماہ اور سال بہ سال ہونے والے واقعات
کو تلاش کریں تو شہر کی بربادی اور تباہی کی پوری داستان غالب
کی زبان سے سننے کو مل جائے گی۔

حویلیاں نیلام ہو گئیں اور وہ بھی دس دس بیس بیس روپے میں
ان کو خریدنے والے دیکھتے دیکھتے صاحبانِ ثروت اور ارباب دولت میں
شمار ہونے لگے اور جو رؤسا اہل شہر میں ممتاز، مقبول اور مرکز دل و نگاہ تھے
ان کی آزمائشوں، ذلتوں اور خواریوں کا دور شروع ہو گیا۔

اس کا ذکر ایک سے زیادہ بار آیا ہے کہ مفتی صدرالدین نواب مصطفٰے خاں
شیفتہ، نواب ضیاءالدین احمد خاں اور حسین مرزا کے ساتھ کیا ہوا، علی گڑھ

فرخ نگر اور جھجر کے نوابوں کے ساتھ وقت نے کیا سلوک کیا۔ اِدھر سے اُدھر تک دار و رسن کا مرگ بردوش ہنگامہ تھا کہ شہر دہلی کی آنکھیں اُسے دیکھ رہی تھیں، موت کی کالی آندھی کا رقص جاری تھا دوسروں کے ساتھ، میر احمد حسین میکش بھی موت کی سزا کے مستحق ٹھہرے اور فنا کے گھاٹ اُتر گئے۔

جس وقت دہلی اور اس کی آبادی ان مشکلات کا شکار تھی، غالبؔ کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہوا۔ مرزا یوسف [حالیؔ کے بیان کے مطابق جو غالبؔ ہی کی ایک تحریر سے اخذ کیا گیا ہے] ۳۰، سال کی عمر سے اختلال ذہنی کا شکار تھے، غالبؔ اور اس کے بعد حالیؔ سے یہاں کچھ تسامح ہو گیا ہے ورنہ غالبؔ جب کلکتے کے سفر میں ہیں، اس وقت خود ان کی عمر بھی پورے تیس ۳۰ سال نہیں ہے۔

کلکتے کے زمانہ قیام میں اُنھوں نے مولوی محمد علی صدر امین باندہ کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں سے ایک خط وہ بھی ہے جس میں مرزا یوسف کے اپنے شدید مرض سے افاقہ پانے کی خوش خبری ہے، اس خوش خبری کو پا کر خوشی سے غالبؔ کے آنسو نکل پڑے تھے، غالب نے اس خط میں یہ اطلاع بھی فراہم کی تھی کہ قلعہ سے تعلق رکھنے والی ایک عورت نے ان کا علاج کیا تھا اور یہ علاج ٹونے ٹوٹکے سے ہوا تھا جس سے اس خط کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مرزا یوسف کی اس دماغی بیماری کا سبب بھی جادو ٹونا ہی رہا ہو گا، جو بھی صورت ہو مرزا یوسف کی زندگی دُکھوں سے بھری زندگی تھی اور یہ دُکھ غالبؔ کے لیے بھی باعثِ تکلیف بنے رہے۔

ہنگامۂ غدر کے دوران جب نہ کھانے کے لیے کچھ ملتا تھا نہ پینے کے لیے مرزا یوسف کی خبر گیری اور تیمار داری کا مسئلہ غالبؔ کے لیے اور زیادہ پریشان کن ہو گیا تھا ایک بوڑھی خاتون اور اسی کے ساتھ ایک بوڑھا ملازم گھر میں اور ڈیوڑھی میں رہتے تھے، بہت ہی سستا زمانہ تھا دو دو چار چار روپے ماہوار میں ملازم مل جاتے تھے مرزا یوسف کے لیے بھی اسی طرح سے کوئی انتظام کیا گیا ہو گا اس ہنگامے کے دوران اور انگریزوں کی

بیش قیمتوں کی مثال اسے بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ مظفر الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں کے بڑے بیٹے تھے جو اس ہنگامے کے دوران الور چلے گئے تھے، وہاں سے گرفتار ہوئے اور راستے میں ان کو گولی ماردی گئی۔ حسین علی خاں ان کے چھوٹے بھائی کو غالب سے بڑی عقیدت تھی اور مرزا کا کلام، نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پاس جمع رہتا تھا یا حسین مرزا کے سو، اُن کی حویلیاں برباد ہوئیں کتب خانے لٹ گئے اور نوادرات کے ذخیرے کوڑیوں کے مول فروخت ہوئے کون جانے کون سی کتاب کہاں پہنچی۔ ع —— ورق در ورق ہر طرف برد باد

آگے چل کر ایک دوسرے خط میں غالب نے اطلاع دی ہے کہ نواب بہادر جنگ خاں رئیس بہادر گڑھ کا فیصلہ ۷ / جون ۵۸ء کو ہوا ان کی ریاست ضبط ہوئی۔ ایک ہزار روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوگئی اور انھیں لاہور روانہ کردیا گیا۔ نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں بے گناہ ثابت ہوئے اور ان کی ریاست لوہارو واگزار ہوئی۔

حکیم احسن اللہ خاں کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ انگریزوں سے مل گئے تھے اور چوڑی والان گلی میگزین کا بارود خانہ انھیں کی سازش سے نذرِ آتش ہوا تھا۔ دہلی اردو اخبار میں ایسی بھی ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ باغیوں نے حکیم احسن اللہ خاں کے مکان کو گھیر لیا تھا اور بادشاہ کی دخل اندازی پر باغی وہاں سے واپس ہوئے تھے۔ غالب کے خطوں میں صورت حال اس سے مختلف ہے، ان کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے حق میں سازش کرنے والوں میں بہر حال نہیں تھے۔

مولانا غلام رسول مہر نے غالب کے خطوں کی روشنی میں اس مسئلے سے متعلق لکھا ہے:

"حکیم احسن اللہ خاں کے ایک پروردہ نے ناجائز طریقوں سے روپیہ جمع کرلیا تھا حکیم صاحب اس راز سے آگاہ تھے، اس نے اپنی بددیانتی

کو پردۂ خفا میں رکھنے کی غرض سے یہ افواہ اڑادی کہ حکیم صاحب انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں اور ان کے لیے جاسوسی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ باغی بگڑ گئے اور حکیم صاحب کے قتل کی نیت سے ان کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ حسنِ اتفاق سے حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس موجود تھے۔ باغی سپاہی قلعے میں پہنچے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے کسی نہ کسی طرح حکیم صاحب کی جان بچائی۔ باغیوں نے حکیم صاحب کا سامان لوٹ لیا مکان کو آگ لگادی۔ سارا مکان جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ دیواریں دھوئیں سے اَٹ گئیں۔"[1]

قلعے سے تعلّق کی بنا پر غالب کو بھی بطور ملزم کرنل براؤن کے سامنے پیش کیا گیا انھیں کوئی سزا تو نہیں دی گئی مگر پنشن ضبط ہوگئی اور بڑی مشکل سے واگزار ہوئی۔۔ غالب کے لیے ہنگامۂ غدر کی مصیبتیں ہی کچھ کم نہ تھیں۔ بعد کے حالات اور ۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کے دوبارہ شہر پر قبضے کے بعد شہر اور اہلِ شہر پر جو آفتیں نازل ہوئیں اُن کی کہانی بلکہ کہانیاں بہت ہی دردناک اور رُوح فرسا ہیں۔

غالب کی اطلاع کے مطابق مُغل شہزادے یا بندوق کی گولیوں کا شکار ہوئے یا پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ جو باقی بچے وہ قید ہوئے یا فرار ہوگئے اور ایک زمانے تک آوارہ و سرگرداں رہے۔ بادشاہ پر مُقدمہ چلا جھجھر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے رؤسا، کو ایک ایک کرکے پھانسی دے دی گئی۔ مسلمانوں پر زیادہ سختی تھی اس کا اندازہ اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مخبر نے یہ خبر اُڑا دی یا پھر حاکم شہر کے پاس شکایت کی کہ شریف خانی

---

[1] غالب از غلام رسول مہر : ص ۲۱۸۔

خاندان کا مکان مہاراجہ پٹیالہ کی حفاظت میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی جائے پناہ بن گیا ہے۔ ممکن ہے اس میں باغی بھی چھپے بیٹھے ہوں۔ اس جاسوسی کے نتیجہ میں ۳ر فروری ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوج کے سپاہیوں کا ایک دستہ اس مکان پر چڑھ آیا اور اس میں رہنے والے حکیموں کو ۶۰ (ساٹھ) آدمیوں سمیت پکڑ کر لے گیا۔ ۷ر فروری کو حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور ان کے چچازاد بھائی حکیم عبدالحکیم خاں رہا ہو کر آ گئے۔ چند روز کے بعد کچھ اور آدمیوں کی بھی رہائی عمل میں آئی۔ بقیہ اپریل میں قید فرنگ سے رہا ہوئے۔ [1]

اس وقت سختی اور دار و گیر کا یہ عالم تھا کہ شہر میں مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار افراد سے بھی کم ہو گئی تھی۔ غالب لکھتے ہیں:

"کہ مسلمان اس قدر دور نکل گئے تھے کہ گویا وہ شہر دہلی کے باشندے ہی نہ تھے بہت سے شہر کے ارد گرد دو چار کوس کے فاصلے پر گڈھوں چھپروں اور کچے مکانوں میں پناہ لیے ہوئے تھے اور گویا اپنی قسمت کی طرح سوتے پڑے تھے۔"

مرزا نے جگہ جگہ اپنے خطوں میں جہاں شہر اور اہلِ شہر کا حال لکھا ہے وہاں اپنے حال احوال پر بھی روشنی ڈالی ہے:

"حقیقتِ حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں کسی محکمے میں اب تک بلایا نہیں گیا۔ باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" [2]

۲۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"انصاف کرو لکھوں تو کیا لکھوں بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔" [3]

---

[1] غالب از غلام رسول مہر: ص ۲۶۷ [2] عود ہندی: [3] ایضاً

ایک اور خط میں ہم یہی حال ان الفاظ میں غالب کی زبان قلم سے سنتے ہیں:

"مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے وہ نکالے گئے جاگیر دار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں مفصل لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ملازمان قلعہ پر شدت ہے باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں مگر وہ جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے اور ہنگامہ میں شریک رہے ہیں"۔[1]

شہر سے نکلنے اور باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اسی زمانے میں جبر یلی بندوبست کے تحت یہ حکم نافذ ہوا۔

"کل سے یہ حکم نکلا کہ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو . . . آج تک یہ صورت ہے دیکھیے شہر کے بسنے کی، کون سی مہورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی شہر سے نکالے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں الملکُ لِلّٰہ والحکمُ لِلّٰہ"۔[2]

انگریز ۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر دوبارہ قابض ہو گئے تھے مگر جنوری ۱۸۵۹ء تک شہر کے دروازوں پر پہرے بیٹھے ہوئے تھے۔ غالب، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے ملنے میرٹھ گئے اجازت لے کر گئے ہوں گے۔ واپس آئے تو دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

---

[1] غالب از غلام رسول مہر: ص ۲۷۱۔

[2] غالب از غلام رسول مہر: ص ۳۷۵۔

"گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں لاہوری دروازہ کا تھانہ دار موتڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھ جاتا ہے، جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے حاکم کے یہاں پانچ پانچ بیت لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے آٹھ دن قید رہتا ہے۔ [1]

ایک اور خط میں یہ صورتِ حال جس سے اس وقت اہلِ شہر گزر رہے ہیں اور غالب بھی دہلی کے انھیں مصیبت زدہ شہریوں میں سے ہیں اس طرح سامنے آتی ہے۔

"بھائی وہ زمانہ آیا ہے کہ سینکڑوں عزیز راہی مُلکِ عدم ہو گئے سینکڑوں ایسے مفقود الخبر ہوئے کہ ان کی مرگ و زیست کی خبر نہیں جو دو چار باقی رہے ہیں خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں"۔ [2]

غالب کی زندگی کے یہ شب و روز اور شہر دہلی کے یہ حالات و حادثات ایک الم نامہ ہے جو غالب کی نگارش قلم کا مرہونِ منّت ہے۔ اور شاید ہی تاریخ میں کسی دوسرے شہر کی تباہی اور بربادی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس طرح قلم بند اور محفوظ کیا گیا ہو کہ جس سے ایک مرقع تیار ہو گیا یہ خط دوستوں، عزیزوں اور مخلصوں کے نام لکھے گئے ہیں... جن کے بارے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ غالب نے کسی بناوٹ یا تکلف و تصنع سے کام لیا - ہو گا۔

غالب کوئی مورخ نہیں تھے لیکن اس دور اور اس زمانے کے شہر دہلی کے بیچے یہ کہیے کہ وہ بہت اچھے اور سچے سوانح نگار ہیں یہاں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعات کا سادہ بیان اور حقیقت کی داستان ہوتے ہوئے بھی نہایت دل آویز ہے۔

---

[1] غالب از غلام رسول مہر، ص ۲۷۶۔

[2] غالب از غلام رسول مہر: ص ۲۷۹۔

مرزا یوسف کی موت فتح دہلی کے بعد غارت گری اور لوٹ مار کے نتیجے میں غالب نے خود بھی بہت نقصانات اُٹھائے اور مرزا یوسف کے پاس بھی جو کچھ ہوگا اس کی بھی حفاظت کہاں کی جا سکی یہاں تک کی ایک دن اطلاع آئی کہ اسی دیوانگی کے عالم میں مرزا یوسف باہر نکل گئے اور کسی گورے نے ان کو گولی مار دی۔

غالب کو جب اس کی اطلاع دی گئی تو وہ بچارے بہت پریشان ہوئے شہر میں سناٹا تھا مکان ویران پڑے ہوئے تھے جنازہ کون اُٹھائے تجہیز و تکفین کا انتظام کیسے ہو۔ کن لوگوں کے ذریعے ہو، مجبوراً گھر میں ہی سے دو چادریں لی گئیں میت کو غسل دیا گیا اور محلے کی ایک مسجد کے صحن میں ان کی لاش سپردِ خاک کر دی گئی۔

غالب کا یہ شعر ایک غم نامہ بھی ہے اور مرزا یوسف کے لیے ایک مرثیہ بھی ہے

خدایا بریں بندہ بخشائشے
کہ نادیدہ در زیست آسائشے

اے خدا تو اپنے اس بندے کی روح پر اپنی رحمتوں کے پھول برسا کہ جس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی آسائش نہیں دیکھی۔

ہنگامۂ غدر انگریزوں کی فتحِ دہلی کے بعد ختم ہوگیا لیکن دہلی والوں پر ظلم وستم کا سلسلہ جاری رہا جاگیرات و املاک ضبط ہوگئیں حویلیاں کوڑیوں کے مول نیلام ہوگئیں مکین ومکان ویران ہوگئے اور گیرو دار کا سلسلہ تھا کہ ایک زمانے تک جاری رہا غالب نے اپنے خطوں میں یہ ساری داستان مختلف اشخاص اور مختلف واقعات کے تذکرے کے ذیل میں سنائی ہے کہ دہلی پر مسلسل مصیبتیں نازل ہوتی رہیں۔

" برسات کا نام آگیا تو پہلے —— سنو ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا۔ ایک فتنہ انہدام مکانات کا' ایک آفت وبا کی' ایک

مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔

اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے کوئی دن نہیں، کہ دو چار گھروں کی چوری کا حال نہ سنائیں مبالغہ نہ سمجھنا ہزار ہا مکانات گر گئے۔ قصہ مختصر وہ آن کال تھا کہ پانی نہ برسا اناج نہ پیدا ہوا پن کال ہے کہ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے زمانے کو کس طرح دیکھا اور اپنے اس شہر دل یعنی دہلی کی مصیبتوں کو کس طرح محسوس کیا۔

یہی بات ایک اور خط میں بھی لکھی ہوئی آتی ہے اور احساس کی شدت کو ظاہر کرتی ہے۔ "پانچ لشکروں کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا کہ اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال ننگ و ناموس مکان و مکین و آسمان و زمین غرض کہ آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا کہ اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و تواں نہ رہی اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں۔ ایک بڑا لڑکا باقر علی خاں اور دوسرے داروغہ کلو۔

شہر کی بربادی اس پر مستزاد زمینی اور آسمانی آفتیں اور سانحے مسلسل اس شہر کی مصیبتوں میں اضافہ کرتے رہے۔

غالب کے دوستوں میں شاید ہی کوئی وضیع و شریف ہو جس کی شخصیت پر اس ہنگامے کے دوران یا اس کے خاتمے پر کوئی آنچ نہ آئی ہو۔۔۔۔ مولوی محمد باقر مولانا محمد حسین آزاد کے والد جنھوں نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے پہلا اردو اخبار نکالا تھا اس ہنگامۂ گیر و دار میں وہ بھی گرفتار ہوئے اور انھیں گولی سے اڑا دیا گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ.......

یہ ایام غالب نے کس کرب و اضطراب کے ساتھ بسر کیے ہونگے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ غالب کے نہایت عزیز دوست تھے۔ غالب نے ان کے لیے ستائش نامے بھی تحریر کیے ہیں۔ ایک خاندانی امیر ہونے کے علاوہ صاحبانِ علم وادب میں سے تھے۔ آبائی رئیس اور نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی کمان میں شہرِ دہلی فتح ہوا تو نواب مرتضیٰ خاں کو حسنِ خدمات کے سلسلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ بہ طورِ جاگیر عطا ہوا۔ ۱۸۱۴ء میں جہانگیر آباد کا علاقہ نواب مرتضیٰ خاں مرحوم نے خرید لیا۔ ان کی وفات کے بعد جاگیر واپس ہوگئی اور ارکان خاندان کی پنشن مقرر کر دی گئی۔ جہانگیر آباد کا علاقہ نواب مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں نواب مصطفیٰ خاں کے نام منتقل کر دیا تھا۔ نواب صاحب نے ۱۸۳۸ء میں حج کا سفر اختیار فرمایا جس کی تفصیل ان کے سفر نامے "رہ آورد" میں ملتی ہے۔

نواب صاحب تذکرہ "گلشنِ بے خار" کے مصنف بھی ہیں جس کا ذکر غالب کے فارسی خطوط میں بھی ملتا ہے زمانۂ غدر میں فتنہ و فساد اِدھر سے اُدھر تک پھیل گیا تو یہ مقام بھی خطرے میں پڑ گیا نواب صاحب سب کچھ چھوڑ کر اپنے ایک دوست کے یہاں خان پور چلے گئے۔ مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے:

"ٹھاکروں نے قلعہ جہانگیر آباد پر قبضہ جما لیا۔ نواب صاحب کے عالیشان محلات میں آگ لگا دی، قیمتی سامان جلا کر خاک کر ڈالا، حتیٰ کہ ان کا گراں بہا کتب خانہ بھی آگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا۔"

حسنِ اتفاق سے رام پور کی فوج اس راستے سے گزری اور اسے حالات کا علم ہوا تو اس فوج نے ٹھاکروں کو شکست دے کر جہانگیر آباد پر نواب صاحب کو دوبارہ قبضہ دلایا۔ اب یہ سوئے اتفاق ہے کہ ہنگامۂ غدر کے فرو ہونے کے بعد نواب صاحب پر باغیوں کی اعانت کا الزام لگا دہ

گرفتار ہوئے اور محض ان کی جائیداد ہی ضبط نہ ہوئی بلکہ سات سال کی قید کی سزا بھی ہوگئی۔

غالبؔ نے لکھا ہے:

"نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہوگئے تھے اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور رہائی ملی، ابھی صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔"

یہ واقعات سلسلہ در سلسلہ اور گرہ در گرہ ہیں۔

انگریزوں کے جانے مانے دوستوں اور جاسوسوں کے سوا سارا شہر ہی سوختنی اور گردن زدنی ٹھہرا۔ ظلم کی رسّی برابر دراز ہوتی جا رہی تھی اور اس کے سرے قید و بند کی زنجیروں، پھانسی کے پھندوں، بندوقوں کی نالیوں اور توپوں کے دہانوں سے جا کر مل گئے تھے۔

شہر میں گویا آفات و ادبار کی آندھیاں چل رہی تھیں، بُرے وقت کا قیامت کی طرح رقصِ تخریب جاری تھا۔

مولانا غلام رسول مہرؔ نے لکھا ہے اور غالب کی شہری نفسیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

غالب کو ایک بڑا رنج اس بات کا تھا کہ ان کے اکثر ملنے والے غدر میں مارے گئے یا تباہ ہوگئے تھے۔ فرماتے ہیں

. . . بھائی وہ زمانہ آیا ہے کہ سیکڑوں عزیز راہی ملکِ عدم ہوگئے۔ سیکڑوں ایسے مفقود الخبر ہوئے کہ ان کی مرگ و زیست کی خبر نہیں، دو چار باقی ہیں مگر جانے کہاں بستے ہیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "کس کس کو یاد کروں کس سے فریاد کروں، جیوں تو کوئی غم خوار نہیں مروں تو عزادار نہیں۔" [1]

---

[1] غالب : ۲۷۹۔

۹ جنوری ۱۸۵۸ء کو لکھے گئے ایک مکتوب میں بھی یہی صورت ہے :

" جو دم ہے غنیمت ہے اس وقت تک معہ اطفال جیتا ہوں بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں قلم ہاتھ میں لینے پر بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو آپس کا دُکھ درد کہہ لیں گے ورنہ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔"

غدر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بہت بڑا ہنگامہ تھا جس میں شہر دہلی کے زمین و آسمان اُلٹ گئے تھے مرنے والے تو دوسری دنیا میں پہنچ ہی گئے تھے جینے والے بھی یہ سوچ رہے تھے کہ جیسے ان کا ۔۔ جون بدل گیا ہو اور جیتے جی ایک نئی زندگی ملی ہو پہلے سے بالکل مختلف۔ غالبؔ نے اس کو اپنے الفاظ میں بہت ہی مؤثر انداز سے پیش کیا ہے :

" صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت در پیش آئے، شعر کہے، دیوان ترتیب دیے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ہمارے تمہارے دلی دوست تھے۔ منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص، نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط

بعد مدت کے پھر دوسرا جنم ملا اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا اس کا جواب آیا ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال متخلص بہ تفتہؔ ہو اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلّی ہے اور اس محلّے کا نام بلّی ماران کا محلہ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا۔" لہ

لہ غالبؔ از غلام رسول مہر : ص ۲۷۱۔

غالبؔ اس شہر آرزو کے تماشائی نہیں ماتم دار تھے۔ اس شہر دل کی تباہیاں
ے خدا کی پناہ کس غضب کی تباہیاں تھیں عمارتیں مسمار کی جارہی تھیں قدیم
بستیاں اور محلّے ختم کیے جارہے تھے لال قلعہ اور جامع مسجد کے ما بین نہ جانے
کتنے مکان حویلیاں آباد تھیں جن کو مسمار کر کے ملبے کے ڈھیروں میں بدل دیا گیا تھا ملبے
کے اُٹھ جانے پر اُن کو لق ودق میدان ہو جانا تھا کابلی دروازے کے قریب
وہ محلّہ تھا جہاں کبھی مولانا محمد حسین آزاد کے والد اور ذوقؔ رہتے تھے۔
نوّاب لطف علی خاں کی خاندانی حویلی بھی یہیں تھی انھیں نوّاب صاحب کی
سرکار میں ذوقؔ کے والد شیخ محمد رمضان (کوئی) کام کرتے تھے ذوقؔ کی پرورش
اسی محلّے میں ہوئی تھی اور دیکھتے دیکھتے یہ محلّہ اور یہ بستی بے نشان ہو گئی تھی
اور وہاں آہنی سڑکوں کا جال بچھ گیا تھا۔
غالب نے اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ ان مٹتے ہوئے نقوش و آثار کی طرف
اشارے کیے ہیں اور یہ بتلایا ہے کہ کیا سے کیا ہو گیا غنیمت ہے کہ جامع مسجد
اور قلعۂ مبارک کی شاہی تعمیرات اور شہری یادگاریں بچ گئیں ورنہ
انگریزوں کا ارادہ تو یہ تھا کہ ان دونوں یادگاروں کو بھی زمین کے برابر کر دیا جائے
تا کہ انھیں دیکھ کر دہلی کی مسلمان آبادی کو اپنا شاندار ماضی اور مغل دور حکومت یاد نہ آئے۔
غالب نے اس داستانِ شکست و ریخت کو اس طرح لکھا ہے کہ اس تصویر کا
گوشہ گوشہ نظر کے سامنے آجاتا ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت غالب
جیسا ایک حسّاس ادیب دہلی میں موجود ہے اور اس شہر کے، المیہ کا نہ صرف
یہ کہ آنکھوں دیکھا حال اس کے سامنے ہے بلکہ وہ خود بھی اس اندوہ ناک صورتِ حال
کا ایک کردار ہے جو دہلی کے حالات اور حادثات کی ایک ایک کیفیت کو اپنے
دل کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا ہے اور اسے نہایت موثر پیرائے میں پیش کر رہا ہے۔

ان کا نقطۂ نظر یہ ہوگیا تھا کہ دہلی شہر اور اس کی شہریت دونوں برباد ہو چکے ہیں ۔ یہاں کی تہذیب اور ثقافتی ماحول اب ہے کہاں ۔

مولوی عزیز الدین کے نام ایک خط میں اسی ہنگامۂ ہوش رُبا کے واقعات کو یاد کیا ہے جسے ہماری عام یاد داشت اور تاریخ میں "غدر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔

" صاحب کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی آگے تھی قاسم خاں کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی اسپتال ہے' اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحبِ عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں' ضیاء الدین احمد خاں اور ان کے بھائی معہ قبائل و عشائر لوہارو میں ہیں' لال کنوئیں کے محلہ میں خاک اڑتی ہے آدمی کا نام نہیں ۔ لہ . . . . . .

دلی اور اہل دہلی کے لیے یہ وقت بہت سخت تھا غالب نے اپنے اسی خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "یہاں شہر ڈھے رہا ہے' بڑے بڑے نامی بازار' خاص بازار' اُردو بازار' اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں ۔ صاحبانِ امکنہ .. و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی' برسات بھر مینہ نہیں برسا اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے

محلے کے محلے تباہ و برباد ہو گئے

اہل شہر کی جمعیت میں فرق آگیا ۔ اور وہ حالت ہوئی (سب کچھ بہا کر لے گیا آیا تھا اِک سیلاب سا) ۔ دلّی والے نہ رہے قلعہ ویران ہو گیا دہلی دروازے سے لے کر جامع مسجد کی سیڑھیوں تک میدان ہو گیا تو وہ صورت کیسے بنی رہتی کہ بقول میرؔ میرے کلام کے لیے یا محاورہ اہل دلی ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں " ۔ اس معاملہ میں ان کے شاگرد عزیز میر مہدی کا نقطۂ نظر دوسرا تھا' غالب کا بیان

لہ عودِ ہندی

ہنگامۂ غدر کے بعد کی دہلی آفتوں مصیبتوں میں پھنسے ہوئے شہر کی کہانی ہے جس کے ساتھ بہت سی مشکلات بھی موجود ہیں اور محرومیاں بھی ان میں دہلی کی شہریت کا اُجڑ جانا بھی شامل ہے اس کا ذکر غالب کی زبان پر بہت بار آیا ہے میر مہدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں اور اپنے خاص انداز میں میر مہدی کو محبتوں بھرے لہجہ میں بُرا کہتے ہیں۔

"او میاں سید زادہ آزادہ دہلی کے عاشق، دل دادا ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنو کو بُرا کہنے والے نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم دلی والے ہیں کہاں ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود مد ہوش نہ سخنوری نہ سمندانی کس برتے پر تتّا پانی، ہائے دلی وائے دلی بھاڑ میں جائے دلی"۔[2]

مرزا کے بہت سے بے تکلف حالات میر مہدی کے خطوط میں سامنے آتے ہیں ان کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے کہ غالب بے تکلفی کے موڈ میں کس طرح باتیں کرتے تھے۔

دہلی اور لکھنو کے حالات کا مقابلہ اس طرح کرتے ہیں:

"بھائی لکھنو میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندستانی عمل داری میں ایسا امن و امان ہو گا نہ اس فتنہ و فساد کے پہلے انگریزی عمل داری میں یہ چین ہو گا امراء اور شرفاء کی ملاقاتیں بقدر رتبہ و تعظیم و توقیر پنشن کی تقسیم ......

معلوم ہوا کہ دہلی کے حالات سے متعلق غالب نے جو اظہار خیال کیا ہے اس کا نفسیاتی پس منظر کچھ اور بھی ہے یہاں کے حالات ہیں جو پیچ پڑے وہ گرہ در گرہ ہیں۔

"یہ تو آفت دلی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے لکھنو کے سوا اور سب شہروں میں عمل داری کی صورت وہ ہے جو غدر سے پہلے تھی۔

پنجابی کٹرہ۔ دھوبی واڑہ۔ رام جی داس گنج۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔ جرنیل کی بی بی کی حویلی۔ رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ۔ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔۔۔" لہ

یہ دہلی کا الم نامہ بھی ہے اور لکھنؤ کے لیے غالب کا اعتراف نامہ بھی ۔ اس خط کا آخیر ان جملوں پر ہوتا ہے:۔

" اللہ اللہ دہلی نہ رہی اور دہلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں واہ رے حسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں! دلی واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر، نہ بازار نہ ہنر رہے نام اللہ کا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " ٢ہ

مجروح نے غالب کے نام جو خط لکھا ہے اور اپنے استاد سے جو اختلاف کیا ہے اس سے اُس عمل اور ردِ عمل کا اندازہ ہوتا ہے جو اس وقت ہندوستان یا مشرق کے ان دو بڑے شہروں کے رہنے والوں میں نفسیاتی طور پر موجود تھا۔ مجروح کے جواب کے یہ جملے ملاحظہ ہوں۔

" بھلا حضرت مجھے کیوں شرم آئے اگر شرم آئے تو رجب علی بیگ سرور کو آئے جس نے وہ لاف و گزاف کیا کہ جیسا لکھنؤ ہے ویسا کوئی شہر ہی نہیں ان سے کہا چاہیئے کہ ارے بندۂ خدا خدا سے ڈر لکھنؤ کس بادشاہ کا دارالخلافہ رہا ہے کون سی تاریخ میں وہاں کے لوگوں کی خوش بیانی کا حال لکھا ہوا ہے ماہیت تو اس کی یہی ہے نا کہ مضافات صوبہ اودھ میں کا ایک شہر ہے یہ دلی سے کیوں کر مقابلہ کرے گا۔" ٣ہ

غالب نے اس بحث و مباحثے میں اعلانیہ کوئی حصہ نہیں لیا لیکن ان کے آخری دور کے خطوط میں ہم اس کی پرچھائیاں ضرور دیکھتے ہیں۔

١،٢ہ لکھنؤ کی زبان از باقر شمس۔ ص ٧٠۔

٣ہ " " " ص ١٧٣

یہ سب اس لیے کہ غالب اسے صرف دیکھ ہی نہیں رہے تھے بلکہ جو کچھ گزر رہا تھا اور ہو رہا تھا اس کو محسوس بھی کر رہے تھے۔

غالب نے کبھی آگرہ اور کلکتہ کی طرح شہر دہلی کی تعریف نہیں کی مگر وہ اس تاریخی شہر کے خود کو ایک زندہ تارِ حیات (Living wire) سمجھتے تھے۔

اس سے ان کو دلچسپی تھی اس کے اہل شہر کے وہ دوست تھا اور اس کے ادیبوں کے ساتھ ہم قلم اور ہم قدم تھے۔ اور جب اس شہر کو اتنی بڑی افتاد سے گذرنا اور ایک پیغمبری وقت کا سامنا کرنا پڑا تو غالب اُن کے ہم قسمت بھی تھے ان کی زندگی میں بھی وہ انقلاب آیا تھا کہ ان کے زمین و زمان سب اُلٹ گئے تھے۔

لکھنؤ بھی اس وقت ایک ایسے ہی انقلاب سے گزرا تھا۔ اس ہنگامۂ ہوش رُبا سے ایک سال پہلے ۱۸۵۶ء میں اس کی سلطنت بھی چھن گئی تھی مگر اس کی شہریت اور شہری تہذیب کا شیرازہ اس طرح نہیں بکھرا تھا جس سے شہر دہلی کو گزرنا پڑا۔

وہاں کی گلیاں بازار، حویلیاں اور مکانات، دیوان خانے، مدرسے اور بالا خانے ابھی تک جوں کے توں تھے۔ غرض سلطنت گئی تھی مگر تہذیب اپنی جگہ پر تھی تاریخ نے ایک کروٹ لی تھی مگر وہ قیامت کا سا کوئی زلزلہ نہیں تھا کہ جس میں اِدھر سے اُدھر تک سب کچھ اُلٹ پلٹ جائے۔ کوئی نظام اور کوئی تنظیم اپنی جگہ باقی نہ رہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں ایک سے زیادہ موقعوں پر اس کا ذکر کیا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ فرق و امتیاز واضح طور پر موجود ہے جو انیسویں صدی کے نصف ثانی بلکہ اس کے چھٹے عشرے میں دہلی اور لکھنؤ نے دیکھا تھا۔ مشرقی شہریت کی ان دونوں محفلوں میں جو تبدیلیاں آئیں تھیں وہ غالب کی نگاہ میں تھیں۔ ایک جگہ بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی اور دوسری جگہ صورتِ حال بہر حال قابو میں تھی۔ تہذیبی سانچہ برقرار تھا۔

مجروحؔ کا اندازِ نظر کچھ اور ہے۔ غالبؔ ان سے محبت کے باوجود اور دہلوی شہریت کا ایک حساس رُکن ہونے کے باوصف لکھنؤ کی شہری عظمت کا اعتراف کرتے ہیں جبکہ ان کو لکھنؤ سے ذاتی شکایتیں بھی ہیں کہ دربارِ لکھنؤ سے ان کی جو سرپرستی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ مگر زبان و آداب اور شہری تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے وہ لکھنؤ کو ترجیح دیتے ہیں :۔

اے میر مہدی ! تجھے یہ کہتے شرم نہیں آتی :۔

" میاں یہ اہلِ دھلی کی زبان ہے "

اہل دہلی یا ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں فرق نہیں آیا ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔[1]

وہ دہلی کے ان محلّوں کا ذکر کرتے ہیں جو غدر کے بعد کے حالات سے تباہی و بربادی سے دوچار ہوئے :۔

" مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے گرم پانی نکلتا ہے پرسوں میں سوار ہو کر کنووں کا حال دریافت کرنے گیا تھا، مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے تک۔ بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اُٹھ جائیں تو ایک ہُو کا مکان ہو جائے یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اَٹ گیا کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک سڑک بنے گی۔

---

[1] لکھنؤ کی زبان از باقر شمس ص ۶۹۔

پنشن کی ضبطی و بازیابی

اس ہنگامہ دار و گیر اور کشمکشِ مرگ و زیست میں غالب کے لیے پنشن کے بند ہو جانے کا مسئلہ ہے جو ان کے لیے بہت پریشان کن بنا رہا انگریزوں کا رویہ مخالفانہ تھا اور اس کی موجودگی میں اپنے حقوق کا تحفظ اور پنشن کا حصول اور مشکل ہو گیا تھا ایسے مواقع پر بھی وہ اپنی شوخیِ اندیشہ حسنِ فکر اور سرمایۂ آرائشِ گفتار کے احساس تکلیف سے بھری باتوں کو اپنے بے تکلف اسلوب اظہار سے پُرلطف بنا دیتے تھے۔

"میرا حال سنو بائیس مہینے کے بعد پرسوں کو توال کو حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں پنشن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطہ کے چار گواہ مانگے ہیں سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے اور میری بے مقدوری ظاہر کرائیں گے تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد "ثبوتِ مفلسی" چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا اور آئندہ کو پنشن جاری ہو جائے گی نا صاحب یہ تو ممکن ہی نہیں بعد ثبوتِ افلاس مستحق ٹھہروں گا چھ مہینے یا برس دن کا روپیہ علی الحساب پاتے گا۔"[1]

غالب بڑے دلچسپ انداز میں باتیں کرتے تھے ان کی زندگی میں بہت سے دُکھ داخل تھے اور رہے مگر وہ موقع بموقع ہنسنے ہنسانے کا مواقع بھی نکال لیتے تھے اپنے ایک خط میں (جو میر مہدی کے نام ہے) لکھا ہے۔

"میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھنگ مجھ کو آ گیا ہے اس طرف سے خاطر جمع رکھنا رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا آئندہ خدا رزاق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے بس ایک چیز کھانے کو چاہیے اگر غم ہو تو پھر کیا چاہیے۔"[2]

---

[1] عود ہندی ص ۱۱۳۔ [2] عود ہندی ص ۱۱۴۔

پنشن کے سلسلے میں غالب نے جگہ جگہ اپنے دوستوں کو لکھ کر بھیجا اور اُن کے لیے ذہنی طور پر چاہے کتنی ہی تکلیف دہ حالت ہو اُس کا ذکر کیا اور واشگاف انداز میں کہا

بے خبر کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

" آپ کی خوشی اور خوشنودی کے واسطے اپنی رُوداد لکھتا ہوں ۔

. . . ۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی ، اہالیٔ دہلی کو ساتھ لے گئے میں نے کہا میں بھی چلوں فرمایا کہ نہیں۔ جب لشکر میرٹھ سے دلی آیا میں موافق اپنے دستور کے روزِ ورودِ لشکر مُخیم (خیمہ گاہ) میں گیا۔ میر صاحب سے ملا اُن کے خیمہ سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر صاحب بہادر کے پاس بھیجا جواب آیا کہ تم غدر کے دوران بادشاہ اور باغی سپاہ سے ملے ہوئے تھے تو اب ہم سے کیوں ملتے ہو اِس ضمن میں یہ بھی کہا گیا کہ تم نے ہنگامۂ غدر کے دوران بادشاہ کی تخت نشینی کے سلسلے میں قطعۂ تہنیت پیش کیا تھا اور سِکّہ بھی کہا تھا۔

غالب اس الزام سے بچنا چاہتے تھے ان کا کہنا یہ تھا کہ میں نے کوئی سکّہ نہیں کہا اور بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی پر جو سکہ کہا گیا تھا وہ ذوق مرحوم کا تھا جو ۱۸۳۷ء عیسوی میں بقیدِ حیات تھے غالب کا یہ بھی کہنا تھا کہ یہ سکّہ دہلی اُردو اخبار میں چھپا تھا اور ذوقؔ ہی کے نام سے چھپا تھا۔

انھوں نے چودھری عبد الغفور سرورؔ کے نام خط میں اس کی "تلاش" کا ذکر کیا ہے۔

جناب چودھری صاحب آج کا میرا یہ خط کاسۂ گدائی ہے یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں تفصیل یہ ہے کہ مولوی محمد باقر دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا مُسمّیٰ بہ "دہلی اردو اخبار" بعض اشخاص سنینِ ماضیہ

---

[1] عودِ ہندی صہ ۳۰ ۔

کے اخبار جمع کر رکھتے ہیں اگر احیاناً آپ کے یہاں یا آپ کے کسی دوست کے یہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے کے آگے کے اخبار دیکھ جائیں جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کے موقعہ پر میاں ذوق کے دو سکّے ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو، بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجئے معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ میں یہ تخت پر بیٹھے تھے اور ذوق نے اسی مہینے میں یا دو ایک مہینے کے بعد سکے کہے، احتیاطاً پانچ چار مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں یہاں تک میری طرف سے ابرام ہے کہ اگر —— کسی اور شہر میں آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اس پر علم ہو تو وہاں سے منگوا کر بھیجئے۔[1]

یہ اخبار نہ ملنا تھا نہ ملا اسی بات کو اپنے اِن ہی مکتوب الیہ کے نام انھوں نے ایک دوسرے خط میں اس طور پر دوہرایا ہے۔

"سکّے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرّا یا کوئی گرَاب، کس سے کہوں کس کو گواہ کروں، یہ دونوں سکّے ایک ہی وقت میں کہے گئے جب بہادر شاہ ظفر تخت پر بیٹھے تو ذوقؔ نے یہ دو سکّے کہہ کر نذر گذرانے، بادشاہ نے پسند کیے مولوی محمد باقر جو ذوقؔ کے مُعتمدین میں سے تھے انھوں نے دہلی اردو اخبار میں یہ دونوں سکّے چھاپے اس کے علاوہ اب بھی وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتے میں بھی یہ سکّے سُنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔

اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔

ہر چند قلمروِ ہند میں دہلی اردو اخبار کا پرچا ڈھونڈا کہیں ہاتھ نہ آیا، یہ دھبّہ مجھ پر رہا پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان بھی۔

پنشن کے مقدمے کی اڑچنیں غالبؔ کے تئیں برابر مشکلات کا باعث بنی رہیں

---

[1] عودِ ہندی صفحہ ۳۰۔

میر مہدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ اور اس وقت کے حالات کی سنگینی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"بھائی یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے سمجھ میں کسی کی نہیں آتا کہ کیا طور ہے اوائل ماہ انگریزی میں ادک ٹوک کی شدت ہوتی تھی آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی اس مہینے میں برابر وہی صورت رہی آج ۲۷ مارچ ہے پانچ چار دن مہینے میں باقی ہیں آنچ ویسی ہی تیز ہے خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔" لہ

اسی خط میں آگے چل کر غالب نے ایک خوش خبری بھی سنائی ہے جسے ان کے اپنے اور انگریزوں کے مابین ایک خوش آیند خبر کہہ سکتے ہیں۔

"اس غم زدگی میں ایک گونا خوشی اور کیسی بڑی خوشی میرے اللہ نے مجھے دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر کی نظر بھیجی تھی آج پانچواں دن ہے کہ نواب لفٹیننٹ بہادر کا خط الہ آباد سے بہ سبیل ڈاک آیا ہے ... وہی کاغذ زر افشانی وہی القاب قدیم کتاب کی تعریف عنایت کی تحسین مہربانی کے کلمات کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا پنشن ملنے کا حکم بھی آجکل میں آیا ہی چاہتا ہے، اور یہ بھی توقع بڑی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے وہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی خبر آجائے۔" ۲ہ

اس میں ہم غالب کی ذہنی کیفیات کی روداد بھی پڑھ سکتے ہیں ان کی سماجی نفسیات کو بھی اُن کے خاص زاویہ نظر کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں اور اس دور میں انگریز افسروں کے درباری آداب کو بھی کہ وہ افشانی کاغذ پر خط لکھتے ہیں اس میں مہربانی کے کلمات ہوتے ہیں۔ مگر یہ ہمیشہ نہیں ہوا۔

غالب پر وہ وقت بھی گزرا جب بڑے انگریز افسر اُن سے ملنا نہیں چاہتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ جب تم زمانہ غدر میں باغیوں کے ساتھ تھے تو اب ہم سے کیوں ملنا چاہتے ہو گورنمنٹ کو تم سے راہ و رسم و آمیزش منظور نہیں، جس کی طرف اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے

۱،۲ لہ عود ہندی ص ۱۰۴

غالبؔ نے اپنے خطوں میں پنشن کے جاری ہونے کی بھی اطلاع دی ہے اس کی اجرا کی توقعات کو بھی پیش کیا ہے۔ اس کے بند ہونے پر اپنے واویلا کو بھی وہ بے تکلف قلمبند کر گئے ہیں ۔ اُس کی طرف انگریز سرکار کا جو رُخ رہا ہے وہ اس سے بھی اپنے احباب کو مطلع کرتے رہے یہ خط غالب کے روزنامچے تو نہیں ہیں لیکن اِن میں ڈائریوں اور روزنامچوں جیسی کیفیت ضرور ہے ۔

ان کے یہاں صورت حال کی کشمکش بھی ہمیں جیتی جاگتی صورت میں ملتی ہے۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام اپنے ایک خط میں اس وقت کے انگریزی روبہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" میرا حال سُنیئے لارڈ کیننگ صاحب نے بعد فتح دہلی میرا قصیدہ مجھ کو واپس بھیج دیا۔ صاحب سکرتر نے مجھ سے کہہ دیا کہ تم ایام غدر میں بادشاہ باغی کے مصاحب بنے ہوئے تھے تو اب ہم سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔

انگریز حکام کی طرف سے جواب دہی کا یہ تکلیف دہ انداز غالب کو کافی زمانے تک برداشت کرنا پڑا۔ آخر اس کے خاتمہ کا وقت آیا۔ بقول غالب دہلی کے خبر تراشوں نے یہ افواہیں پھیلادیں کہ اب پینشن داروں کو بھر بھر جھولیاں روپے دیے جائیں گے اور انجام کار دربار گورنری سے وہی کاغذ " زر افشانی " اور کلمات تحسین آئے اور غالب کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے ۔

غالبؔ کے لیے پنشن کا مسئلہ بہت اہم تھا اُس سے ان کی مستقل آمدنی بھی والبستہ تھی اور سرکار و دربار سے ملنے والا اعزاز اور خلعت و خطاب بھی جس سے محرومی ان کے تئیں بڑی محرومی تھی ۔ انھوں نے اپنے کئی خطوں میں اس محرومی کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ سرکار و دربار میں بڑا پایہ رکھتا تھا اور سات پارچوں کا خلعت پاتا تھا ۔

لیکن رفتہ رفتہ صورتِ حال بدل گئی۔

"لارڈ ایلین صاحب بہادر کے وقت میں موافقِ معمول قصیدہ شملہ کے مقام پر بھیج دیا۔ خلاف تصور (وتوقع) بہ حسب دستور قدیم چیف سکتر بہادر کا خط آگیا، وہی افشانی کاغذ وہی القاب، وہی تحسینِ کلام وہی اظہارِ خوشنودی اب جو یہ امیر کبیر وائسرائے قلمرو ہند ہوئے خدمت دیرینہ بجالایا۔ ۱۳، فروری ۱۸۶۴ء حال کو قصیدہ مع عرضداشت کے ارسال کیا۔ آج تک کہ ۷، مارچ کی ہے، جواب نہیں پایا۔ موافق معرفت رسمِ قدیم کا عمل میں نہ آنا خاطر آشوب کیوں نہ ہو۔" لہ

غالبؔ کی اپنی کہانی کو اگر ان کی اپنی زبانی سُنا جائے تو ہم اس زمانے میں ذہنی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی اپنی روداد انھیں کے اپنے حرفوں، لفظوں اور اسلوبِ نگارش کے ساتھ زیادہ زندہ اور تابندہ ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

وہ اپنے بارے میں کیا کیا سوچتے ہیں، کس کس طرح سوچتے ہیں اور کیوں سوچتے ہیں، اسے اگر ہم انھیں کے پاس بیٹھ کر سُنیں اور انھیں کی صریرِ قلم کے ساتھ ان کی آواز ہمارے کانوں میں پہنچے تو ہم اُن کے ذہن اور زندگی سے گویا زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔

اس زمانے کے مکتوبات میں غالبؔ نے اپنی شاعری، اپنے شعور، فارسی اور اردو سے اپنے ذہنی رشتے اور اپنی تصانیف کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مجروح ہی کے نام ان کے ایک خط کی عبارت دیکھیے تو ہم ان سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن اُن کی سوچ کو ہم اس کی سچائیوں کے ساتھ جان سکتے ہیں۔

غالب نے اپنے معاملات اور اپنی زندگی کے وسائل پر بہت کچھ لکھا ہے اُس معاملہ یا اِس معاملہ میں اُن کے بارہ میں اگر کچھ جاننا چاہیں تو ان کی تحریریں خطوط اور دوسری نگارشات ہمارے لیے روشنی اور رہنمائی کا ایک بڑا وسیلہ ہیں۔ ان سے صرفِ نظر کر کے دوسرے وسائل کی طرف اگر ہم رجوع کرنا چاہیں تو ہمارے پاس ان کی شاعری کے ماسوا کوئی بھی اور ذریعہ معلومات نہیں۔

پینشن کی بازیابی: میر مہدی ہی کے نام ایک خط میں ہم اس مسئلہ کو نارسائی اور پزیرائی کے درمیانی مرحلوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

—— "میری جان سنو داستان صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی سانڈرس صاحب نے مجھکو بلایا پنجشنبہ ۲۴ فروری کو میں گیا صاحب شکار کو سوار ہوگئے میں الٹا پھیر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا ملاقات ہوئی کرسی دی بعد پرسش مزاج کے ایک خط انگریزی میں چار ورق کا اٹھاکر پڑھتے رہے جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہاکہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب اکبر صدر بورڈ پنجاب کا تمھارے نام آیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کرکے لکھو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو۔ حقیقت کہی گئی۔ ایک خط آمدہ ولایت لے گیا تھا وہ پڑھوادیا پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے اس کی حقیقت بیان کی کہا کہ ایک کتاب میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے۔ اور ایک ہم کو دے دو میں نے عرض کیا کل حاضر کردوں گا پھر پنشن کا حال پوچھا وہ بھی گزارش کیا۔

" دیکھو میر مہدی حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر کتابوں سے کیا اطلاع پنشن کی پرسش سے کیا مدعا یہ استفسار بہ حکم گورنر جنرل صادر ہوا ہے اور یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔" [1]

اس سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ غالب اور انگریز افسروں کے مابین گفتگو اور تعلقات ہیں کس طرح "چاندکی چاندنی جیسا مدو جزر آتار ہا اور غدر کے بعد خاص طور پر یہ صورت رہی اس سے ہم غالب کے شب و روز کو بھی جان سکتے ہیں اور ان کی چلتی پھرتی تصویر کچھ خاص حوالوں کے ساتھ ذہن پر ابھر سکتی ہے۔

یہ بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی آگے بڑھتی ہے اور غالب لکھتے ہیں یکشنبہ یوم تعطیل تھا میں اپنے گھر پر رہا دوشنبہ ۲۸ فروری کو گیا باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔

---

[1] عود ہندی ص ۱۰۱۔

اچھا توقف کرو بعد تھوڑی دیر کے گڑھ کپتان کی بیٹھی آئی سواری مانگی جب سواری آگئی باہر نکلے میں نے کہا وہ کتابیں حاضر ہیں منشی جیون لال کو دے جاؤ وہ اُدھر سوار ہو گئے میں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا پھر انبساط اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔" ۱؎

کبھی کبھی غالب کے خطوں میں وہ حالات بھی آتے ہیں جن کو امورِ عامہ میں شمار کیا جاسکتا ہے "ایک قاعدہ کلیہ دہلی کا سمجھ لو خالق کی قدرت مقتضی اس کی ہے کہ جو شہر پناہ کے اندر پیدا ہو مرد ہو یا عورت خفقان و مراق اس کی خلقت و فطرت میں ضرور ہوگا، آٹھ دس برس بعد ساون کے اخیر مینہہ خوب برسا لیکن نہ دریا جاری ہوئے نہ طوفان آیا ہاں شہر کے باہر بیس آدمی دب کر مرے دو تین شخص کوٹھے پر سے گر کر مرے مراقیوں نے غل مچانا شروع کیا اپنے اپنے عزیزانِ دور رفتہ کو لکھا جا بجا اخبار نویسوں نے ان سے سن کر درج اخبار کیا لو اب دس بارہ دن سے مینہہ کا نام نہیں دھوپ آگ سے زیادہ تیز ہے۔" ۲؎

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی والے کیسے سوچتے تھے اور یہ وہ سوچ تھی جس میں غالب بھی شریک ہو جاتے تھے یہ صرف سوچ نہیں بلکہ غالب کی "لائف ہسٹری" ہے جس کو انھوں نے وقتاً فوقتاً یادداشتوں کے طور پر ہی درج نہیں کیا بلکہ اپنے خطوط میں ان کا ریکارڈ چھوڑا کہ وہ کیسے اُٹھتے بیٹھتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، آتے جاتے ہیں، دوسروں سے معاملہ کرتے ہیں ان کی بات چیت کا انداز کیا ہے ان کے معمولات کیا ہیں، جس شہر میں رہ رہے ہیں جس ماحول اور جس فضا میں سانس لے رہے ہیں اس کو انھوں نے کب، اور کس حالت میں دیکھا یہ سب کچھ نہ سہی مگر اس "کچھ" میں بھی وہ باتیں ضرور آجاتی ہیں، جن کی مدد سے ہم بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

اپنے آخری دورِ حیات میں جن افراد کو غالب نے خطوط کی صورت میں یاد کیا ہے اور جن میں سے کچھ سے انھیں فائدہ بھی پہنچا، ان میں بہت سے نام شامل ہیں۔

۱؎ عود ہندی ص ۱۰۸۔ ۲؎ عود ہندی، غالب ص ۸۷۔

سرسید کو انگریز اپنا وفادار اور پُر وقار آدمی سمجھتے تھے اس لیے ان کے کہنے پر بہت لوگوں کی سزاؤں میں تخفیف ہوئی اور بہت سے مستحقین عطاو بخشش اور رعایت کے زُمرے میں آگئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور نے مرزا غالبؔ کی بہت ہی مشکل بلکہ آڑے وقت میں قدر افزائی کی اور معاونت فرمائی۔

اس نازک دور میں رئیس رام پور نے، اساتذۂ سخن اہل علم اور ارباب ادب کی سرپرستی کا فریضہ بڑی خوبصورتی سے انجام دیا انھوں نے لکھنؤ اور دوسرے مقامات سے آنے والوں کو اپنے یہاں پناہ دی منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ احمد امیرؔ مینائیؒ۔ نواب مرزا داغ دہلوی ان ہی اساتذہ سخن اور اہل شعروادب میں تھے جن کی سرپرستی ہوئی۔

غالبؔ دومرتبہ رام پور گئے۔ ایک بار نواب یوسف علی خاں سے ملاقات کے لیے اور دوسری بار ان کی وفات پر اظہار تعزیت اور رام پور کے نئے تاجدار نواب کلب علی خاں کو ان کی مسند نشینی پر نذرانہ تبریک پیش کرنے کے لیے۔ دوسری مرتبہ نواب زین العابدین خاں عارفؔ مرحوم کے دونوں بیٹے بھی ان کے ساتھ تھے۔ جو غالب کی سرپرستی میں آگئے تھے اور غالبؔ ان سے ہر طرح مخلصانہ ومربیانہ سلوک کرتے تھے۔

نواب یوسف علی خاں نے ۱۰۰ روپے ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کردیا تھا جبکہ ان سے کوئی خدمت وابستہ نہیں تھی، وہ نواب صاحب کے استادِ شعروسخن تھے اور یہ کہیئے کہ بسلسلہ شاعری وثیقہ پاتے تھے، آج سو روپے کے کچھ معنی نظر نہیں آتے، لیکن اس وقت ان کی حیثیت آج کے ہزاروں روپے کے برابر تھی۔ یہ سب سے بڑا وظیفہ تھا جو غالبؔ کے لیے کسی دربار کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا، انگریزوں کی طرف سے تو محض ساڑھے باسٹھ روپے وظیفہ ملتا تھا، بہادر شاہ ظفر نے صرف پچاس روپے ماہوار وثیقہ مقرر کیا تھا

اِدھر اُدھر سے جو کچھ ملتا تھا اکثر و بیشتر وہ رقم بہت معمولی ہوتی تھی جس کی وجہ سے مرزا کو یہ شکایت رہتی تھی کہ ایک وقت تھا کہ بادشاہانِ سلف نے اپنے زمانے کے شاعروں کو سونے چاندی میں تُلوا دیا تھا اور ہیرے جواہرات سے ان کی مٹھیاں بھر دیں تھیں کوئی میرے کلام ہی کو ان کے برابر میں رکھ کر تول لے.

نواب یوسف علی خاں کے تئیں غالبؔ بہت سپاس گذار اور منّت شناس تھے کہ نواب صاحب ان سے کوئی خدمت نہیں لیتے' دوستانہ ان کو دیتے ہیں — غالب نے نواب صاحب کو لکھے گئے اپنے متعدد خطوط میں جنھیں مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے مرتب کر کے مکاتیب غالبؔ" کے نام سے شائع کر دیا ہے' انھوں نے اپنی طرف سے احسان شناسی' نواب صاحب کی دوستانہ کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا ہے۔

نواب ناظم کی وفات کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی اس وظیفہ کو جاری رکھا اور اس طرح غالبؔ کے پایانِ عمر کے جو بھی ماہ و سال ہیں' وہ نسبتاً زیادہ اطمینان کے ساتھ گزرے' اب یہ الگ بات ہے کہ ان کے اخراجات کا پیمانہ ان کی آمدنی سے ہمیشہ کچھ زیادہ ہی رہا۔

کم آمدنی رئیسانہ وضع قطع جاگیردارانہ انداز واداکے ساتھ رہنا بھی کوئی آسان کام تو تھا نہیں۔ غالبؔ اس کو نبھاتے اور حالات کا جیسے بھی ہوا سامنا کرتے رہے۔ شعری حسیت اور تخلیقی سرجوش برابر اُن کی نگارش و گذارش میں جلوہ فرما رہا۔

اس دورِ زندگی میں ہم غالبؔ کو اپنی تصانیف کی اشاعت سے دلچسپی لیتا ہوا دیکھتے ہیں' فارسی میں پنج آہنگ' اور مہر نیم روز۔ کی اشاعت کا ذکر انھوں نے کئی خطوں میں کیا ہے۔ کلیات فارسی کی اشاعت کا بھی اہتمام انھوں نے کیا۔ ان کے مختلف خطوط سے اس کا اظہار ہوتا ہے " دستنبو " کی اشاعت اور بعض جلدوں کی تیاری میں پیشکش کے خیال سے خاص اہتمام برتا گیا۔

غالب گرمی کی شدت سے بہت متاثر ہوتے تھے اور آب رواں سے بہت دلچسپی رکھتے تھے ان کے یہاں دریاؤں کے دل آویز ذکر کو بھی اسی دلچسپی اور فکر و خیال کا حصّہ کہنا چاہیے۔

" میں نے جمنا کا کچھ حال نہ لکھا یہاں کبھی کسی نے اس دریا کی کوئی حکایت ایسی نہیں کی جس سے استعجاب پایا جائے موسم کیا ہے گرمی جاڑا دو فصلیں برسات میں اکٹھی تنگر گ باری اس کے علاوہ ایک بحرِ رواں کی حقیقت کیا . یہ بات کہ دلّی میں تغیر نہ ہو اور نہ پورب میں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں جمنا بانفراد بہہ رہی ہے اور وہاں کہیں کوئی اور ندی کہیں گنگا باہم مل گئی ہے " مجمع البحّار " ہے "

" اہا اہا میرا پیارا مہدی آیا آؤ بھئی مزاج تو اچھا ہے یہ رام پور ہے دارالسرور ہے . جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے، پانی سبحان اللہ یہاں شہر سے ۳۰۰ قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے، بے شُبہ چشمہ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے، خیر اگر یوں بھی ہے تو آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا "

غالب نے جیسا کہ اس سے پیشتر بھی ذکر آچکا ہے، غدر کے حالات میں بطور تاریخ نامہ ایک دستاویز مرتب کی تھی۔ (لکھتے ہیں)

" میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں بعبارت فارسی نبا میختہ بعربی لکھی ہے اور وہ پندرہ سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب ہے آگرہ کے مطبع مفید خلائق میں چھپنے کو گئی ہے " دستنبو " اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے "

جب ملکہ انگلستان نے غدر کے بعد کمپنی کا ٹھیکہ ختم کیا اور ہندوستان کو کمپنی کے ہاتھ سے لے کر اپنی حکومت میں شامل کیا تو دہلی میں اس موقع پر روشنی کی گئی اس کا

لہ عود ہندی ص ۴۷ ۔   ۲ہ عود ہندی ص ۸۱ ۔

۳ہ عود ہندی ص ۹۸ ۔   ۴ہ عود ہندی ص ۸۲ ۔

حال غالب نے مختصراً اپنے خط میں لکھا ہے:

"یہاں پہلی نومبر کو بدھ کے دن حسب الحکم حکّام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور سب کو کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلم روئے ہند کا بادشاہی عمل داری میں آجانا سنایا گیا نوّاب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزندِارجمند خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا میں تو قصیدہ اس کی تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔"[1]

علائی کے نام خط:

غالبؔ نے اس دورِ زندگی میں جگہ جگہ اپنے ماضی کو بھی یاد کیا ہے اور موجود سے بھی اپنے افکار کا سلسلہ جوڑا ہے۔ علاءالدین احمد خاں علآئی کے نام جو خط انھوں نے لکھا ہے وہ ان کے معروف خطوں میں ہے اور اس سے ان کی زندگی کے بعض واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور بات کہنے کے سلیقے میں غالبؔ کا اپنا انداز سامنے آتا ہے۔

یہ خط ایک طرح سے علامتی اظہار کا نمونہ ہے اور اس کی بنیادی علامت "قید" ہے اور یوں بھی قید و بند، گرفتاری، پیشی، گواہی، قانونی چارہ جوئی کے متعلق ان کے ادب و شعر میں بہت سے اشارے آئے ہیں۔ اس خط میں بھی ان کی زندگی کے واقعات ان ہی اشاروں کنایوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

"ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھکو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا ۱۳ برس حوالات میں رہا، ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوامِ حبس صادر ہوا ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا تین سال بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا پایانِ کار مجھے

---

[1] عود ہندی ص ۸۴۔

کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔''

''جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے تو دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں' پاؤں بیڑی سے فگار' ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار' مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی۔''

اس دلچسپ اور علامتی طرز اظہار کے ساتھ جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس میں غالب کی پیدائش' ان کا بچپن' پھر شادی' بعد ازاں کلکتے کا سفر اور بعد غدر سفر رامپور بطور خاص شامل ہیں'... نیز نواب زین العابدین عارف کے انتقال کے بعد غالب کی طرف سے ان کے دو بچوں کی کفالت' ان باتوں سے جو رمز و کنایے میں کی گئی ہیں.. ہم غالب کی زندگی کے اہم واقعات کو سمجھ سکتے ہیں اور غالب کے طرز اظہار کے ایک نئے پہلو سے بھی آشنا ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے پُر لطف فقرے اور ریمارکس غالب کے حسن طبع اور مزاج کی شائستگی کو بھی پیش کرتے ہیں اور ان کے پس منظر میں ان کی فن کارانہ نفسیات کا بھی کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے رہے اور ان بندھنوں سے آزاد ہو کر جینے کی خواہش' بھی ان کی رگوں میں دوڑنے پھرنے والے خون کے ساتھ متحرک اور کسی نہ کسی درجے پر مضطرب رہی۔

غالب کی اُفتاد طبع اور نزاکت مزاج پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ان کے یہاں ایک سے زیادہ فکری جہتیں ملتی ہیں' ایک فن کار کے مزاج کے ساتھ یہ تار پیرہ دو رنگ جیسی کیفیت کوئی غیر فطری بات بھی نہیں کہی جاسکتی' فطرت بھی موقع بہ موقع مجموعۂ اضداد نظر آتی رہے اور غالب کا تو یہ عالم ہے کہ وہ بقول خود عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا۔

یہ زمانہ وہ ہے جب ۔ غالب پایان
عمر سے گذر رہے ہیں۔ ان کی کتابوں کی طباعت کا زمانہ ہے۔ انھوں نے اس میں
اپنی طرف سے یہ اہتمام کیا ہے کہ یہ کتابیں چھپ جائیں اور ان کے قدر شناسوں
تک پہنچ جائیں۔
اسی زمانے کا ایک اور خط سلطان زادہ بشیر الدین کے نام ملتا ہے اس
میں بھی کتابوں کی طباعت کا ذکر ہے اور ان سے متعلق غالب کے تاثرات کا بھی

"میرے نقوش تحریریں بہ نثر فارسی جو ار ژنگ نامے میری نگارشات
سے ہیں،" پنج آہنگ"۔ مہر نیم روز" اور" دستنبو" نظرگاہ والا میں پہنچ چکے
ہیں۔ اور نگاہ روشن اساس کے روشناس ہو چکے ہیں تیسرے کے بارے میں
کوئی تعجب نہیں کہ وہ بھی شہر میسور تک پہنچ چکا ہو' اگر وہاں دستیاب نہیں
تو یہاں جیسے ہی وہ مل جائے گا حضرت والا کو اس سے مطلع کروں گا۔
آگے چل کر اس سلسلے میں مزید کچھ باتیں غالب کی زبان قلم پر آئی ہیں -
"حصۂ نظم دو سفینوں سے زیادہ نہیں۔ کلیات اردو اس لایق نہیں کہ فارسی زبان
کے شہسواروں کے سامنے اس کا نام بھی لیا جائے اب رہا" کلیات فارسی" تو خاطر عاطر میں
یہ بات نہ آئے کہ فارسی کلیات اپنی جگہ پر جامع اور مکمل ہے۔ جو بھی ہے وہ یہی
مطبوعہ دیوان ہے جو کلیات کا آدھا حصہ ہے۔ اگر پیش نہاد خاطر دونوں مجموعوں
کا ایک ساتھ روانہ کیا جانا ہے تو میں منتظر ہوں کہ جناب والا کی طرف سے کیا حکم
صادر ہوتا ہے۔"

اردو سے متعلق جن خیالات کا اظہار غالب نے کیا ہے وہ ان کے
دیرینہ خیالات ہیں' وہ اپنی فارسی کے مقابلے میں اردو کو کم درجہ دیتے تھے
اسی لیے بہت زمانے تک وہ فارسی ہی میں اپنے مکتوبات بھی تحریر کرتے رہے

قاطع برہان ہنگامہ (۱۸۵۷ء) کے دوران لکھی گئی تھی۔ زیرِ نظر خط میں آگے چل کر غالبؔ نے قتیلؔ کے کلام اور "غیاث اللغات" کے مصنّف کو پھر ایک بار بُرے الفاظ میں یاد کیا ہے اور لکھا ہے۔

" قتیلؔ لکھنوی اور غیاث الدّین ملّائے مکتبی کی قسمت کہاں سے لاؤں کہ تم جیسا کوئی شخص میرا معتقد ہو اور میرے قول کو مُعتبر سمجھے۔"

آگے چل کر مزید اس سلسلے میں ان کی زبانِ قلم پر یہ فقرات آتے ہیں:

" میں یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو، مگر اس کھتری بچّے اور اس معلّم مکتب سے مجھ کو کم تر نہ جانو عربی کا صرف اور ہے اور فارسی کا قاعدہ اور . . . غور کرو سمجھو عبدالواسع ہانسوی پیغمبر نہ تھا قتیلؔ برہمانہ تھا واقفؔ غوث الاعظم نہ تھا میں یزید نہیں ہوں شمر نہیں ہوں۔"

" غیاث اللغات ایک نام مؤقر اور معزز جیسے "الغریہ خواہ نخواہ" مرد آدمی آپ جانتے بھی ہیں کہ یہ کون ہیں ایک معلّم فرومایہ رامپور کا رہنے والا فارسی سے نا آشنائے محض اور صرف و نحو میں ناتمام انشائے خلیفہ وانشائے مادھو رام پڑھانے والا چنانچہ دیباچہ میں اپنا ماخذ بھی اس نے شاہ خلیفہ محمد مادھو رام و غنیمت و قتیلؔ کے کلام کو لکھا ہے "یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں آدمی کے گمراہ کرنے والے یہ فارسی کو کیا جانیں"۔ . .

یہ خط صاحب عالم کے نام ہے یہ وہ صاحب ہیں جن سے غالبؔ کے بہت ہی شگفتہ تعلقات ہیں لیکن قتیلؔ اور واقفؔ کا ذکر آتے ہی غالبؔ برافروختہ خاطر ہو جاتے ہیں۔

غدر کے زمانے میں غالبؔ کو جو نقصانات پہنچے ان کا ذکر وقتاً فوقتاً ان کی زبانِ قلم پر آتا رہتا ہے خاص طور پر اس وقت جب اپنے مصائب اور مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔

ان کا کلام بھی اس میں ضائع ہوا تھا اور بے طرح ضائع ہوا تھا۔ سرورؔ کے نام اپنے ایک خط میں انھوں نے اس کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے۔

---

[1] عودِ ہندی ص۲۵۔ [2] عود ہندی ص۲۹۔

"میرا کلام کیا نظم؟ کیا نثر؟ کیا اردو؟ کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا، دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسوّدات مجھ سے لے کر، جمع کر لیا کرتے تھے سوان کے لاکھوں روپیہ کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپیہ کے کتب خانہ بھی گئے اس میں وہ "مجموعہ ہائے پریشاں" بھی غارت ہوئے خود اس مثنوی کے واسطے "خوں در جگر" ہوں ہائے کیا چیز تھی۔"

اور بھی کئی جگہ غالب نے اس کا ذکر کیا ہے۔ صاحب عالم کے نام خط میں یہی بات اس طرح آئی ہے۔

"میرا ایک نسبتی بھائی ہے نواب ضیاء الدین احمد خاں ——— وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا چنانچہ مجموعہ نثر — اور کلیاتِ نظمِ فارسی اور کلیاتِ نظم اردو سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے وہ کتب خانہ . . . . بیس ہزار روپیہ کی مالیت کا ہوگا ایک ورق بھی باقی نہ رہا۔"

اس زمانے میں غالب کا مشہور مجموعہ نثرِ فارسی کا مطبوعہ نسخہ موجود تھا جو مطبع سلطانی میں چھپا تھا۔ وہ اس سے خوش نہیں تھے کہ اس میں غلطیاں بہت رہ گئی تھیں اس کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے اپنے اسی خط میں لکھا ہے۔

"چھاپے کی پنج آہنگیں اب بھی بکتی ہیں اور معیوب بدو عیب ہیں ایک یہ کہ بعد انطباع جو کچھ از قسم نثر تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں ہے، دوسرے یہ کہ اس میں کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے اگر یہ کہوں کہ کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو وہ "اغراق" ہے بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔"

غالب اپنے خطوں میں اپنے حالات اور خیالات کو سمیٹتے رہتے ہیں۔

---

[1] عودِ ہندی ص۳۷۔ [2] عودِ ہندی ص۸۷۔

[3] عودِ ہندی ص۱۴۱۔

"برہان قاطع" کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے سرور کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اسے چھاپنا چاہتے تھے

"برہان قاطع میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا ہزار ہا لغت غلط ہزار ہا بیان لغو، عبارت لوچ اشارات پادر ہوا میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدور نہ رہا مسودہ کاتب سے صاف کرالیا ہے اگر کہو تو بہ سبیل مستعار بھیجدوں تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں وہ اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔"

چودھری عبد الغفور کے نام ایک خط میں ان عوارض کی بھی تفصیل پیش کی ہے جن سے وہ اس وقت گزر رہے ہیں۔

"برس دن میں "اوجاع" (درد) سہتے سہتے روح تحلیل ہو گئی نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی۔"

علاج معالجے کے سلسلے میں غالب نے کئی بار لکھا ہے۔

"میرا خیال تھا کہ صرف تبرید و تعدیل سے کام نکل جائے تو کیا کہنا ورنہ بحسب رائے طبیب طریق تنقیہ ضروری ہوگا مجھکو آج دسواں منضج ہے (یعنی میں وہ دوائیں کھا رہا ہوں جن سے یونانی طریقہ علاج کے مطابق مادہ پک جائے گا) پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا۔"

حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں ضعیفی کے اس دور میں غالب پیشاب کی بیماری میں مبتلا ہیں اور پھوڑوں کی تکلیف اس کے ماسوا ہے۔

اس کی مزید تفصیلات ان سطور میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

۱؎ عود ہندی ص ۳۴۔ ۲؎ عود ہندی ص ۶۸۔
۳؎ عود ہندی ص ۷۷۔

اصل صورت حال کچھ اور ہے' اب ضعف و نقاہت برابر آگے بڑھ رہی ہے' اس میں عمر کو بھی اتنا دخل نہیں جتنا صحت کی خرابی کو ہے۔ اس کی وجہ سے اب وہ اگر کوئی کام بھی کرتے ہیں تو لیٹے لیٹے کرتے ہیں حاجتی پلنگ کے پاس رہتی ہے پیشاب بار بار آتا ہے (اس کا ذکر بھی ان کے خطوط میں آتا رہتا ہے)۔

" . . . . میرا حال کیوں پوچھو' اپنے کو دیکھو' جو تمہارا ڈھنگ ہے وہ ہی میرا رنگ ہے۔ بثور و اورام مرض خاص تھا اور رنج عام یہ ایک اجمال سُن چکے اب دوسرا اجمال سنو کہ مہینہ بھر سے صاحب فراش ہوں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پلنگ پر پڑا رہتا ہوں محل سرا اگرچہ دیوان خانے کے بہت قریب ہے' پر امکان کہاں جو جا سکوں' صبح کو نو بجے کھانا آجاتا ہے' پلنگ پر سے پھسل پڑا۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا' پھر ہاتھ دھو کے کلی کی پلنگ پر جا لیٹا۔"

اس ناطاقتی اور ناآسودگی کے باوجود وہ کام بہر حال کرتے رہتے تھے لیکن ان کا جسم بعض ایسے عوارض کا شکار ہو گیا جو ان کی حرکات و سکنات میں رکاوٹیں پیدا کرتے تھے ایک اور خط میں اپنی بعض بیماریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "برس دن میں اوجاع سہتے سہتے روح تحلیل ہو گئی نشست و برخاست کی طاقت نہ رہی اور پھوڑے تو خیر مگر دونوں پنڈلیوں میں ہڈیوں کے قریب بثور نکل آتے ہیں کھڑا ہوا اور پنڈلیوں کی ہڈیاں چرّانے لگیں اور رگیں پھٹنے لگیں۔ [1]

یہ غالب کا حسن بیان اور لطفِ زبان ہے کہ انہوں نے اپنے جسم کے پھوڑوں سے پھل جانے کا ذکر کیا تو بھی اتنی خوبصورت تشبیہ تلاش کی اور کہا "میرا جسم پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں بن گیا ہے۔"

اسی زمانے کے خطوں میں ان پھوڑوں کے علاج کا بھی ذکر آتا ہے کہ اس میں کچھ نہیں تو ایک پاؤ مرہم استعمال ہوتا ہے ممکن ہے اس میں کچھ شاعرانہ مبالغہ بھی ہو۔

---

[1] عود ہندی ص ۲۷ ۔

" ایک پھوڑا دائیں پہنچے میں جس کو ساعد کہتے ہیں دو پھوڑے بائیں پہنچے میں ہیں۔
بائیں پاؤں میں کفِ پا و پُشتِ پا سے لے کر آدھی پنڈلی تک ورم اور ورم بھی
سخت . . . . . . اب تجویز یہ ہے کہ نیم کا بھرتا باندھیے جب پکے پھوٹے تب مرہم
لگایئے۔ تم ہی کہو کہ کفِ پا میں جراحت کا عمل ہو تو قیام کا کیا ٹھکانہ۔"

اس کا اثر ان کی شعر گوئی پر بھی مرتّب ہوا اور جذبۂ خلوص خدمت پر بھی جس کے
ساتھ وہ دوستوں کی اصلاح اشعار پر توجہ فرما ہوتے رہتے تھے۔

"میں یہ لکھ چکا ہوں کہ نہ مجھے تحریر کی طاقت نہ اصلاح کا ہوش ایک بات کو
دس دس بار کیا لکھوں؟ اب میرا انجام کار دو طرح پر متصور ہے، یا صحت یا مرگ، پہلی صورت
میں خود اطلاع دوں گا، دوسری صورت میں سب احباب خارج سے سُن لیں گے۔"

ایک وقت میں انھوں نے کچھ پہلے دور زندگی میں باندا بندیل کھنڈ کے سفر کا
ارادہ بھی کیا تھا جو قوت سے فعل میں نہ آیا لکھا ہے۔

" باندہ بندیل کھنڈ آنے کا میں نے سب سامانِ سفر کر لیا . . . قصد یہ تھا کہ
فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا، وہاں سے نواب علی بہادر کے یہاں کی سواری
میں جا کر ہفتے بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا بسبیل ڈاک دہلی چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضور والا بیمار
ہو گئے اور مرض نے طول کھینچا، وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا۔"

ان کے اس دور کے افکار و خیالات میں وہ پرچھائیاں ملتی ہیں جن کا تعلق
عزیزوں کی روشس اور ان کی ستم کوشیوں سے بھی ہے۔

شفق کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں " یہ بات میں نے آپ کے اس خط میں
پائی . . سبحان اللہ اکثر امور میں تم کو اپنا ہم طالع پاتا ہوں، عزیزوں کی ستم کشی
اور رشتہ داروں سے ناخوشی . پانچ برس کی عمر سے ان کے دام میں
اسیر ہوں، ۶۱ برس ستم اٹھائے ہیں، نہ تم میری خبر لے سکتے ہو نہ میں تم کو مدد دے
سکتا ہوں، اللہ اللہ دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے دو ہاتھ لگائے اور بیڑا
پار ہے۔"

سرورؔ کے نام اپنے خطوں میں غالبؔ نے اپنے ماضی کو بھی یاد کیا ہے اور اس طرح ان کی زندگی کی کہانی اور اس کی بازیافت کے کچھ سلسلے اس دور کی تحریروں سے وابستہ ہیں۔

چودھری صاحب ہی کے نام اپنے ایک خط میں مقدمے کے معاملے کو پیش کیا ہے اور اسی کے ساتھ جن جن اشخاص، والیان ریاست یا اس دور کے حکمرانوں کی طرف سے ان کی مدد یا سرپرستی ہوئی ہے اس کا بھی ذکر آگیا ہے۔

لکھتے ہیں:۔

"پہلے کچھ باتیں، جو بادی النظر میں خارج از بحث معلوم ہوں گی، لکھی جاتی ہیں ــــ میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میرے شرکار حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے، انھوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپیہ سال اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال ــــ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا، کول برک صاحب بہادر ریذیڈینٹ دہلی اور مسٹر اسٹرلنگ چیف سکرتر صاحب بہادر متفق ہوگئے۔ ریذیڈینٹ معزول ہوگئے سکرتر بمرگ ناگہاں مر گئے۔

"بعد ایک زمانے کے بادشاہِ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا، ان کے ولی عہد نے ۴۰۰ روپیہ سال، ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے ــــ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بسلسلہ مدح گستری ۵۰۰ روپیہ سال مقرر

لہ عود ہندی ص۴۸۔

ہوئے، وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دس برس میں ہوئی۔"

دہلی کی سلطنت سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی ایسے مُربی کُش اور مُحسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب میں جو والئ دکن کی طرف رجوع کروں یا کہ متوسط یا مر جائے گا، یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی اور والئ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل چل جائیں گے۔"

ان حالات میں غالب اپنی خوش حالی اور فارغ البالی کی توقع تو خیر کر ہی نہیں سکتے تھے، بس یہ کوشش ہی کر سکتے تھے کہ جہاں جہاں سے کچھ ملنے کی اُمید ہو، وہ اس سرکار یا اس دربار سے رجوع کرتے رہیں، قصیدہ لکھ کر بھیجتے رہیں۔ ان مشکل حالات میں بھی غالب کا ذہن برابر کام کرتا رہا۔ یہ بڑی بات ہے۔ ان کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اخیر وقت تک ایک LIVING WIRE (زندہ رگِ حیات) رہے پھر بھی زندگی کے حالات اور حادثات نے ان کو پریشان خاطر ضرور کر دیا تھا۔ اپنے ایک اُردو شعر میں انھوں نے کہا۔

کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

اپنے مذکورہ خط میں اپنے حالات و خیالات کو پیش کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں

" بندہ پرور، یہ سب باتیں واقعی اور وقوعی ہیں اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو کر سکتا ہوں تمام کون کرے گا سوائے ایک ملکہ شعر گوئی کے کہ ۵۰ - ۵۵ برس کی مشق کا نتیجہ ہے کوئی قوت باقی نہیں رہی کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر کو دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ میں نے یہ نثر کیونکر لکھی تھی اور کیوں کر یہ شعر کہے تھے۔"

ایک اور موقع پر (چودھری عبدالغفور کے نام خط لکھا تو اس کا اظہار کیا)

"غزل کا ڈھنگ بھول گیا معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روشِ ضمیر میں آوے۔"

اوراق معانی

غالب نے لکھا ہے اسیر، صیاد کو آسودگی سے کیا علاقہ جس کے
... سے دام ٹوٹ گئے ہوں اور جس کا شکار اس کے شکستہ جال سے آزاد ہو گیا
ہو۔ اور اس گل چیں کو شگفتہ خاطری سے کیا نسبت جس کے ہاتھوں کے پھول مرجھا
گئے ہوں۔ اور پھولوں کی پھلجڑیاں نامرادی کی زمین پر بکھر گئی ہوں۔"

"عاشق کی ہمدمی کرتے ہوئے معشوق کو جان دینا چاہئے وہ ایک عمر کی
جاں فشانیوں کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ پھر بھی جنھوں نے کبھی دل دیا ہے، یہ
حقیقت ان سے چھپی نہیں کہ یہ بات بھی کتنی بڑی بات ہے اس معشوق وفا شعار
کی کیا بات ہے جس نے عاشق کا درجہ بہ اندازۂ بایست بڑھا دیا ہو اور اپنے
معشوق گلناز سے اس کا دل لے لیا ہو اور اسی کی محبت میں جان بھی دے دے۔"

یہ خط تو بہت بعد کے زمانہ میں لکھا گیا لیکن اس میں جس دور زندگی
کے قلبی واردے کا ذکر ہے وہ غالب کے عہد شباب سے تعلق رکھتا ہے۔

غالب نے اپنے عہد شباب کی زندگی اور اس کے بعد کے دور حیات کو
اکثر یاد کیا ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے جو غالب کے عزیز اور ان
سے دلی تعلق رکھنے والے مخلص دوست ہیں ایک بار جب اکبر آباد کا سفر کیا تو آگرہ
کے ذکر خیر کے ساتھ وہاں کی خوبصورت فضاء اور دل آویز ماحول کا بھی اپنے پرکشش
انداز میں، غالب نے ایک متحرک عکس پیش کیا اور لکھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ میرے شوق دور اندیش نے دیدہ و دل کو تمہارے
ساتھ کر دیا ہے تاکہ اس غربت میں دیدار وطن اور اس کی شادمانیوں
کی داد دے سکوں۔ زنہار اکبر آباد کو کم نگاہی سے نہ دیکھیں...
کہ وہ ویرانہ آباد، مجھ ایسے ایک "مجنون شوق" کی بازی گاہ دل
و نظر بھی رہا ہے اور ہنوز اس بقعۂ زمین کی رعنائیوں سے میرے
خون آرزو کا چشمہ بہ نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

حالی نے ان کا جو مرثیہ ان کی وفات کے بعد لکھا اس میں یہ کہا کہ ان کی ایک سیدھی سادی بات میں بھی غیر معمولی سطح پر ایک ادبی پُرکاری ہوتی ہے کہ جو مشکل ہی سے اوروں کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے ؎

سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

اسی زمانے میں مولوی غلام غوث بے خبر کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

" ایک امر جدید مقتضی اس کا ہوا کہ آپ کو اس کی اطلاع دوں نہ دوں، کاہلی آج لکھوں کل لکھوں۔ اب کون لکھے کل صبح کو لکھ لوں گا۔ صبح ہوئی غالب اس وقت نہ لکھ سہ پہر کو لکھیو۔ آج دوشنبہ ۲۳ ر جولائی کے ۱۲ پر دو بجے ہرکارے نے آپ کا خط دیا پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا۔ مگر بھجوادیا کل روانہ ہو رہے گا۔ [1]

غالب کے خطوط میں جو اس دور میں لکھے گئے اپنی بعض تصانیف کا حوالہ بھی شامل ہے اور بعض احباب کا بھی۔

بے خبر کے نام ایک خط میں اس قصیدے کا ذکر ہے جو انھوں نے رئیس رامپور کے لیے لکھا تھا۔ یہ قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے

تجلیٔ کہ زموسیٰ ربود ہوش بطور بہ شکل کاب علی خاں وگرنمود ظہور [2]

اور ۳۵ ر اشعار پر مشتمل ہے۔ اس سے متعلق زیر نظر خط میں یہ تحریر بھی آئی ہے :-

" والیِ رام پور کو خدا سلامت رکھے اپریل مئی ان دونوں مہینوں کا روپیہ موافق دستورِ قدیم آیا۔ جون ماہ گزشتہ کا روپیہ خدا چاہے تو آجائے آج جمعہ ۷ ر جولائی ہے۔ معمول یہ ہے کہ دسویں بارھویں کو رئیس کا خط معہ ہنڈی آیا کرتا ہے۔"

---

[1] عود ہندی ص ۲۴۴۔

[2] عود ہندی ص ۲۴۱۔

"بوستانِ خیال" کے ترجمے سے متعلق غالب کے اس خط میں یہ اطلاع نقل ہوئی ہے:

"میرے ایک رشتے کے بھتیجے نے بوستانِ خیال کا اردو میں ترجمہ کیا ہے میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے ایک دو ورقہ اس کا بصورت پارسل بلکہ بہیئت خط بھیجتا ہوں آپ کا مقصود دیباچہ ہے سو نقل کر لیجیے میرا مدعا اس دو ورقہ کے ارسال سے یہ ہے کہ آپ کے پسند آئے۔" لے

ایک طرف ان کی دلچسپیوں میں 'لوح و قلم' کے یہ مرقعے شامل ہیں اور دوسری طرف ان کی زندگی آلام اور امراض سے گھری ہوئی زندگی ہے، جس کی پرچھائیاں اس دورِ گزراں میں برابر ان کی تحریروں میں جھلملاتی نظر آتی ہیں:

بے خبر کے نام اسی خط میں لکھتے ہیں:-

"قبلہ پیری و صد عیب، ساتویں دہائی کے مہینے گن رہا ہوں قولنج آگے دَوری تھا اب دائمی ہو گیا ہے مہینہ بھر میں پانچ سات بار فضول مجتمعہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی منشاءِ حیات ہے غذا کم ہوتے ہوتے اگر مفقود نہ کہو تو بمنزلہ مفقود کہو پھر گرمی نے مار ڈالا ایک حرارتِ غریبہ جگر میں پاتا ہوں جس کی شدت سے بُھنا جاتا ہوں کہ کتنا پانی پی جاتا ہوں۔" لے

اسی آخری زمانے میں غالب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط لکھا ہے اور اس میں اس خیال کا اظہار کیا ہے:-

"فقیر ہمیشہ مَوردِ اعتراضات رہا ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعد دو چار دن کے معترض صاحب کا خط آیا ہے۔ لغت و ترکیب معترض فیہ کی سند کے اشعار حضرت نے اس خط میں درج کیے ہیں اللہ اللہ جو کلکتہ میں شور اُٹھا تھا۔" سے

اس کے بعد کلکتہ کے ادبی ہنگامے کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بعض تفصیلات

۱، ۲ لے عودِ ہندی ص ۲۴۸۔

۳ لے عودِ ہندی ص ۲۵۲۔

کو پیش کیا ہے۔

"قضارا اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا کفایت خاں اس کا نام تھا اس تک یہ قضیہ پہنچا اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے جس میں ہمہ عالم وہمہ روز" وہمہ جا" مرقوم تھا۔ لہ

اسی ضمن میں برہانِ قاطع اور قاطعِ برہان کا بھی ذکر آیا ہے۔

"وہ اشعار قاطعِ برہان میں مندرج ہیں ہاں صاحبِ قاطع برہان میں اور مطالب بڑھائے اور ایک دیباچہ دوسرا لکھا ہے اور درفشِ کاویانی اس کا نام رکھا ہے" ٢ے

اس سے درفشِ کاویانی کی شانِ نزول کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اپنی بیماری اور طرح طرح سے ضعف اور کمزوری کا ذکر قاضی عبدالجمیل کے نام ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں :۔

"مولوی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر منشی کا قول سچ ہے اب میں تندرست ہوں۔ پھوڑا پھنسی کہیں نہیں مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ۔ ضعف کیوں کر نہ ہو ۔۔ ٧٢ دن صاحبِ فراش رہا ہوں۔ ستر برس کی عمر جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر بہہ گیا۔ سِن کہاں جواب پھر تولید (پیدا ہونا) "دم (خون) صالح" ہو۔ بہر حال زندہ ہوں اور ناتواں۔" (ص ٢٣٦)

انھیں صاحب کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "میں نہ تندرست ہوں نہ رنجور۔ زندہ بہ دستور ہوں۔ دیکھیے کب بلاتے ہیں اور جب تک جیتا ہوں اور کیا دکھاتے ہیں۔" (ص ٢٣٧)۔

لہ عودِ ہندی ص ٢٥٢ ۔

٢ے " " " " ۔

بہرحال اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے ابتدائی کلام اور روشِ کلام کے بارے میں غالبؔ کا نظریہ کیا تھا یا کیا بنا اُس زمانہ ٔ زندگی میں غالب اپنی بیماری جسمانی آزار اور تکالیف کے باعث اشعار میں اصلاح دہی سے بھی گھبرانے لگے تھے اور اپنے دوستوں سے بھی معذرت چاہتے تھے۔

" بندہ نواز زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہ رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے . . . . کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی ہے اُردو ہی میں نیاز نامہ لکھا کرتا ہوں "[1]

جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے تھے ان سے بھی اب اسی مُروج زبان میں مُکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوتا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کی ادبی فکر اور لسانی رجحان میں دَور بدَور تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ ان کے ادبیانہ میلانات اور سخن ورانہ رویے زمانہ بزمانہ اس کی ترجمانی کرتے جاتے ہیں۔ غالب کی زندگی اور اس زندگی کے ارتقائی سفر کو۔ ان کی ذہنی روشوں ان کے عصری کوائف ذاتی مسائل اور شخصی تعبیرات ہی کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غالب کی شاعری ادبی شعور، معاشرتی زاویہ نگاہ، اور شخصی میلانات کہیں زندگی کی روداد کو پیش کرتے ہیں اور کہیں ذہنی افتاد کو جس میں ان کی طبیعت کا تلون بھی شامل ہے یہ بھی ہوا ہے کبھی وہ ایک طرح پر سوچتے ہیں اور کبھی ان کی سوچ کی سطح بالکل یا بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ اپنی اردو شاعری کو وہ بے رنگ من کہتے ہیں بلکہ اپنے باغ کا "برگ ذم" خیال کرتے ہیں ان سب باتوں کے لیے وہ الگ الگ پیمانے اختیار کرتے ہیں ان کے ایک قاری اور نقاد کو اس پر بھی نظر رکھنا چاہیئے۔

---

[1] عود ہندی ص ۱۷۸۔

غالب کے خط صرف خط نہیں ہیں ان کی روداد حیات ہیں واقعات کی دستاویزیں ہیں یادداشتیں ہیں ان کو ہم کبھی کبھی اور کہیں کہیں ر پورتاژ کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں ہم ایک خط میں انہیں یہ لکھتے ہوئے دیکھتے ۔ یا دوسرے لفظوں میں ان کی زبانِ قلم سے یہ باتیں سنتے ہیں۔

" جو کچھ تم نے سنا ہوگا بے اصل باتیں ہیں پنشن کا مقدمہ کلکتہ میں نواب گورنر جنرل بہادر کے پیش نظر ہے۔ یہاں کے حاکم نے اگر ایک روبکاری لکھ کر اپنے دفتر میں رکھ چھوڑی میرا اس میں کیا ضرر یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دو ایک آدمی آگئے دن بھی تھوڑا رہ گیا تھا میں نے بکس بند کیا باہر تختوں پر آبیٹھا شام ہوئی چراغ روشن کیا منشی سید احمد حسین سرھانے کی طرف مونڈھے پر بیٹھے ہیں میں پلنگ پر بیٹھا ہوا ہوں۔"

اس تحریر میں ہم غالب کی زندگی اور ان کے ذہن کی متحرک تصویریں دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح سوچتے ہیں کیسے باتیں کرتے ہیں اور کون سے سوالات اور خیالات ان کے ذہن کو گھیرے رہتے ہیں۔

یہ دور اُن کی سوچ کا دور بھی ہے فکر مندیوں سے بھرا دور۔ یہ ان کی یادوں کی بازگشت کا دور بھی ہے جیسے ایک شخص دریا کے کنارے بیٹھا ہوا اس کی لہروں کو اِدھر سے اُدھر جاتے اور آتے دیکھ رہا ہو۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی جن حالات اور حادثات سے گزر رہی ہے۔ وہ صورتِ حال بھی کسی ہنگامے سے کم نہیں۔

ان کے پھوڑوں کا ذکر اس سے پہلے آچکا اور جس طرح وہ اس اذیت کو برداشت کر رہے ہیں (انور الدولہ شفق کے نام) ایک اور خط میں اپنی اس بیماری کو انھوں نے پھر اپنی زبان قلم سے بیان کیا ہے۔

" سالِ گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا بارہ تیرہ مہینے صاحب فراش رہا۔ اُٹھنا دشوار تھا۔ چلنا پھرنا کیسا، نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ

لہ عود ہندی ص ۱۱۵۔

اس پر بھی انھوں نے "دستنبو" ترتیب دی یعنی غدر کے حالات اور حادثات کا وہ سوانح نامہ مرتب کیا جو اب بھی اس دورِ گذاں کے لیے ایک تاریخ نامے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد بھی ان کا قلم حالات کی تحریر و نگارش میں شہر کے ایک سوانح نگار اور وقت کے مورّخ کی طرح کام کرتا رہا۔

"دستنبو" کے علاوہ اسی زمانے میں ان کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے قاطع برہان بھی مرتب کی، برہانِ قاطع فارسی لغت پر، جو انھوں نے اعتراضات وارد کیے تھے وہ ہی "قاطع برہان" کے نام سے شائع ہوئے۔ غالب بڑے ذہین اور طباع آدمی تھے اور ادب کے معاملے میں ان کی لسانی اور لغوی حسیت کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی تھی۔ زبان کے مسئلے پر وہ اکثر لڑتے جھگڑتے رہتے اور ہندوستان کے فارسی نگاروں سے اختلاف کرتے تھے۔

ان کے خطوط میں بہت سی ایسی تشریحات اور تعبیرات ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کے لغت نگاروں اور زبان دانوں کو سند نہیں مانتے تھے، لغت، ادب اور محاورات کے معاملے میں اُن کی فکر و فہم اور رسائیوں سے انھیں کم ہی اتفاق ہوتا تھا۔

جو بات وجہِ نزاع بنتی رہی وہ غالب کا اپنا لب و لہجہ بھی تھا کہ وہ اپنے معاصرین کو خاطر میں نہیں لاتے تھے "قاطع برہان" لکھتے وقت انھوں نے بے طرح محمد حسین تبریزی کو غیر تحسینی رویے کے ساتھ یاد کیا، یہاں تک لکھ دیا کہ اسے اگر زبان، محاورے اور لفظ و معنی کے رشتے پر اتنا عبور نہیں تھا تو وہ لغت لکھنے کے لیے کیوں بیٹھ گیا، اُسے تو پان بیچنا چاہیے تھا یا پھر رسّیاں باٹنا۔ یہ لب و لہجہ مناسب نہیں تھا۔

قتیل و واقف، ناصر علی سرہندی اور غنی کاشمیری جیسے شعراء کو بھی وہ کچھ نہیں سمجھتے تھے، قتیل کی تو انھوں نے بہت ہی توہین کی ہے کہیں انھیں "کھتری بچہ" لکھا ہے اور کہیں اس سے بھی زیادہ تضحیک و تذلیل بھرے لفظوں میں یاد کیا ہے ان کی سوچ کا اندازہ ذیل میں درج کیے ہوئے اقتباسات سے بھی ہو سکتا ہے۔

علم عربی اور شے ہے اور فارسی کی حقیقت حال اور ہے جلا لائے طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ

نے شعرائے ہندی کو ایک رقعہ لکھا عبارت اس وقت یاد نہیں آتی مگر مضمون اس کا یہ ہے کہ ایک دن مولانا عرفی علیہ الرحمۃ اور ابوالفضل میں مباحثہ ہوا۔ شیخ نے عرفی سے کہا کہ ہم نے تحقیق کو حدّ افراط تک پہونچا دیا اور فارسی میں خوب کمال پیدا کیا۔

عرفی نے کہا کہ اس کو کیا کرو گے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے گھر کے بُڈھوں بُڈھیوں سے جو بات فارسی میں سنی وہی اپنے یہاں استعمال کی شیخ نے جواب دیا کہ ہم نے انوری و خاقانی سے فارسی سیکھی۔ عرفی نے جواب دیا کہ انھوں نے بھی تو بوڑھی عورتوں سے یہ زبان سیکھی تھی۔ اس کا تعلق زبان اور محاورہ سے تو ہو سکتا ہے مگر شعر وادب سے نہیں۔

غالب کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے دیکھو عبدالقادر بدایونی کیا لکھتا ہے۔ انہیں میں آگئے ناصر علی اور بیدل اور غنیمت سوا ان کی فارسی کیا۔

غالب نے ایک اور خط میں یہ بھی لکھا ہے۔

"کہ فارسی کی ترکیب الفاظ اور فارسی اشعار کے معنی کی پرداز میں میرا قول اکثر خلاف جمہور پایئے گا اور حق بجانب میرے ہوگا۔ . . . . . .

یہ صاحب جو شرحیں لکھتے ہیں کیا یہ سب "ایزدی سروش" ہیں اور ان کا کلام وحی ہے اپنے اپنے قیاس سے معنی پیدا کرتے ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ ہر جگہ ان کا قیاس غلط ہے مگر یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ یہ فرماتے ہیں وہ صحیح ہے۔"

غالب ہندوستان کے فارسی گویوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے سُرورہی کے نام اپنے ایک خط میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں۔

"فارسی کی تکمیل کے واسطے اصلِ اصول مناسبتِ طبیعت کی ہے" پھر

لہ عود ہندی ص۔

تتبع کلام اہل زبان لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اُس کے کہ ان کو موزونی طبع کا نتیجہ کہیئے اور کسی تعریف کے شایان نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک، ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفالِ دبستان جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں، وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں صرف کرتے ہیں۔"[1]

اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ غالب ہندوستان کے فارسی دانشوروں کے مقابلہ میں کس طرح اہل زبان کو ترجیح دیتے تھے۔ خود اپنے لیے لکھا ہے۔

" حضرت کو معلوم ہے کہ میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثلِ صائب، و کلیم اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا۔"

یہ وہ صورت حال ہے جس کے پیچ و خم میں رہتے ہوئے غالب برابر سوچتے رہے اور یہی خیال ان کے اور اُن کے معاصرین فارسی زبان جاننے والوں کے مابین وجہ اختلاف بھی تھا۔ یہ اختلاف اس وقت بھی سامنے آیا تھا جب غالب کلکتہ میں تھے اور اس وقت بھی نئی شدت کے ساتھ رونما ہوا جب غالب نے "برہان قاطع" پر اعتراضات کیے۔

اس ضمن میں انھوں نے اپنے اسی خط میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ وہ برہانِ قاطع کی غلطیاں نکال رہے ہیں۔

" جن لوگوں کے محقق ہونے پر جمہور کو اتفاق ہے، ان کے بارہ میں کیا گزارش کروں ایک ان میں صاحبِ " برہان قاطع " ہے . . . . ان دِنوں میں " برہانِ قاطع " کو دیکھ رہا ہوں اور اس کے فہم کی غلطیاں نکال رہا ہوں اگر زیست باقی ہے تو ان نکات کو جمع کر کے اس نسخہ کا نام " قاطع برہان " رکھوں گا۔ قاطع برہان غدر کے بعد شائع ہوئی اور پھر اس کے جواب، اور جواب الجواب کے طور پر کئی رسالے لکھے گئے اور اس ہنگامے نے کافی دنوں تک غالب کے ذہن کو گھیرے رکھا۔

---

[1] عود ہندی ص ۱۰۔ [2] عود ہندی ص ۲۳۔

قصیدے کے بارے میں غالب نے اپنے خیال کو اس طرح واضح کیا ہے۔

"گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ سے میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا رہا ہے اشرفیاں نہیں۔ خلعت ریاست دو دمانی ' سات پارچے اور تین رقم جواہر سرپیچ مالائے مروارید مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں، دربار میں بلانے کی توقع نہیں پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں' صناعتِ شعر اعضاء و جوارح کا کام نہیں دل چاہیے' دماغ چاہیے' ذوق چاہیے' یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں۔"

جیسے جیسے مرزا غالبؔ کی عمر بڑھتی رہی ان کی صحت کمزور ہوتی گئی' بیماریاں اس کمزوری میں ان پر غلبہ حاصل کرتی گئیں' غالب کے آخری دور کے خطوط میں ایسے بہت سے مکتوبات ہیں جن میں انھوں نے اپنی بیماری کا ذکر کیا ہے۔ صاحب عالم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

آم کھاتا تھا کہ پیٹ اُبھر جاتا تھا اور دم سینے میں نہ سماتا تھا۔[1]

یہاں آم کھانے کے شوق کا اظہار ہے لیکن صحت اجازت نہیں دیتی صحت کی خرابی کا شکوہ غالبؔ کی بہت سی تحریروں میں شامل ہے' خاص طور پر وہ تحریریں جو اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں' ایک اور خط کے یہ جملے ملاحظہ ہوں۔

"۔ ۔ ۔ یہ مصرعہ گویا میری زبان سے ہے" عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچؔ پایان عمر ہے دل و دماغ جواب دے چکے ہیں' سو روپیہ رام پور کے ساڑھے باسٹھ روپے پنشن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں گرانی اور ارزانی اُمورِ عامہ سے ہے' دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلہ کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے' ماہ گزشتہ میں گزر گئے۔ مجھ میں قصیدہ لکھنے کی قدرت کہاں اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں۔[2]

غالب کے یہاں کاروبار شوق کی فرصت و فراغت کی خواہش ہمیشہ رہی

---

[1] عود ہندی ص ۷۵ ۔ [2] عود ہندی ص ۵۲ ۔

"قصیدہ تہنیت جلوس بھیجا اس کا جواب آگیا۔ لے"

اسی خط میں غالب نے اپنی وہ غزل بھی بھیجی ہے جو نواب امین الدین احمد خاں کے اصرار سے خسرو کی غزل پر لکھی تھی جس کا مطلع یہ ہے :

ہم اَنا اللہ خواں، درختے را بگفتار آورد
ہم انا الحق گوئی مَردے را سرِ دار آورد

اور مقطع یہ ہے :-

نسبتے در منطقش جز ذکر شاہد حرف و صوت
شاہدے باید کہ غالبؔ را بگفتار آورد

اس طرح اگر ہم غالب کے فارسی اور اردو خطوط کا مطالعہ کرتے جائیں تو یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ ان کی کون سی تخلیق کس زمانے کی یادگار ہے۔ بے خبر ہی کے نام اپنے ایک خط میں انھوں نے خود بے خبر کی غزل کا بھی حوالہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

رام پور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی کیا کہنا ہے ابداع اس کو کہتے ہیں، جدت طرازی اس کا نام ہے جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا وہ تم بروئے کار لائے خدا تم کو سلامت رکھے اور میرے اور دکھنی جامع برہان قاطع کے جھگڑے میں بخلاف اور فارسی دانوں کے توفیق انصاف عطا کرے۔ ۲ے

غزل کا مطلع یہ ہے :-

چشم کہ باز شد زخواب، فتنہ ازو بچار سوست
پردہ زرُخ کہ کشاد مہر ز شرم زرد رُوست

اس سے ہم اس دورِ زندگی میں غالب کی ادبی دلچسپیوں کا بھی اندازہ کرسکتے ہیں

لے عودِ ہندی ص ۲۴۰۔

۲ے عود ہندی ص ۲۴۶۔

نہ بھیجے ہوئے خط کا منشی امین اللہ کے پاس پہنچنا ان کے تئیں حیرت کی بات ہے لکھتے ہیں یہ واقعہ میرے ہوش اڑا دینے کو کافی ہے۔ خدارا مجھے اس بندِ غم سے نجات دلایئے اور اس راز کا انکشاف کیجیے۔ اس نامہ حیرت ہنگامہ کو ملاحظہ کیجئے اور اپنے برادرِ خورد سے بھی پوچھیے اس میں کسی تاخیر کو راہ نہ دیجئے جب اس ملفوف کو کھولیں تو خاتم کی مہر پر ضرور نظر ڈال لیں۔"

غالب نے کوشش کر کے اور اپنے کچھ خاص دوستوں کے تعاون سے غزلوں کی جمع آوری اور انتخاب میں مدد لے کر اپنا دیوانِ ریختہ چھپوا دیا تھا جسے وہ "ناتمامی میں تمام" ہے ہیں۔ ولو ں ______

حبیب اللہ خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"گذشتہ ماہ میں کہ سالِ رواں کی فضائے عمر افزا میں ماہِ اگست آگے آگے رواں تھا اور ماہِ صفر پیچھے پیچھے چل رہا تھا منتخب دیوانِ ریختہ جس نے حال ہی میں غالب طباعت اختیار کیا ہے موی کپڑے میں لپیٹ کر میں نے نواب مختار الملک کی نظر گاہِ والا میں بھیجا ہے۔" (ممکن ہے یہ دیوان ریختہ طبع اوّل کی اشاعت ثانی ہو۔)

"نواب صاحب کی طرف سے ایسا کوئی خط نہیں آیا جس سے معلوم ہو کہ یہ پارسل انھیں مل گیا ہے اور یہ ادبی تحفہ انھیں پسند آیا ہے۔"

غالب اس تذبذب میں اپنے ذہن کو مبتلا پا رہے ہیں کہ بات کیا ہے اور کیوں ہے جس کا ذکر انھوں نے اسی زیرِ نظر خط میں کیا ہے۔ چونکہ صحیفہ سانی (والا نامہ) کا ورود پارسل کے روانہ کیے جانے کے بعد ہوا، اس لیے مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ یہ نگارشِ خط پیش گاہِ وزارت کے "ایما" پر ہے۔ اور سفینہ اشعارِ اردو کے بھیجنے کی بابت چونکہ اس میں کوئی تذکرہ نہیں اس سے یہ سمجھا جائے کہ مجموعۂ فارسی کو طلب کیا گیا ہے۔"

اس ضمن میں غالب کی زبان قلم پر "پرتوستان" ماہِ نیم ماہ اور مہرِ نیم روز کی بات بھی آئی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ خط ۱۸۵۷ کے بعد کسی وقت

لکھا گیا۔

بہر حال انھوں نے اس کی کہانی سناتے ہوئے لکھا ہے۔

"ماہِ نیم ماہ" کی خواہش کی گئی ہے مگر "ماہِ نیم ماہ" تو وہ اسم ہے جس کا کوئی مُسمّیٰ نہیں . . . . . پر تو ستان میں جب آدھا حصہ مکمل ہو گیا تو اس کا نام "مہر نیم روز" رکھا گیا۔ اب میں نے چاہا کہ ذرا دم لے لوں، اس میں کچھ تاخیر ہو گئی تو کار فرما کی جہانداری کا دن بے نور ہو گیا اور زمانے نے اپنا ورق اُلٹ دیا اور فراچار ترکمانوں کی دولت دیرینہ ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔"

(ماہِ نیم ماہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ناپید اور اس کا نام مہر نیم روز کی طرح آشکارہ ہے جس کا کوئی وجود نہیں اسے کیسے فراہم کروں۔)

غالبؔ نے اس کا ذکر کیا ہے کہ "پنج آہنگ، مہر نیم اور دستنبو" آپ کے پاس ہیں، اب میں جو بھیج سکتا ہوں وہ مجموعہ نظم فارسی ہے۔ (اس کے معنی ہیں کہ اس وقت تک غالب کی یہ تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔)

غالبؔ نے اپنے اسی خط میں لکھا ہے "میرا کلام میرے پاس کبھی نہیں رہا اہل شہر اور دوستوں کے پاس جو کچھ تھا وہ اس فتنہ آشوب قیامت میں برباد ہو گیا اس آراستہ شہر کی تباہی اور آفات داد بار کی اُڑتی ہوئی گرد کے بیٹھ جانے کے بعد ایک جاہ مند شخص نے کہ میرے اعزا میں ہوتے ہیں، اس کی جمع آوری کا ارادہ کیا اور گلیم فقب کی طرح پارہ پارہ کر کے اُسے جمع کیا۔ تقریباً ۵۰ جزو بہم پہنچے اب میں اس فکر میں ہوں کہ طباعت کے ذریعے اس کی شیرازہ بندی ہو جائے کہ اس صورت میں اس کی دست یابی بہت سے آرزو مندوں کے لیے ممکن الحصول ہو۔"

غالب اس کی طرف سے زیادہ پُر امید نہیں ہیں۔ ہاں ان کی یہ خواہش ضرور ہے۔

خط میں اگر ارادتاً غلط نگاری سے کام نہ لیا جائے یا حقیقتِ حال پر تکلفات کے پردے نہ ڈالیں جائیں تو لکھنے والے کے جذبات، احساسات اور اس کی زندگی کے خارجی واقعات اور داخلی کوائف کا وہ ایک جیتا جاگتا مرقع ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر اس کا ذکر آچکا ہے، غالب نے غدر کے حالات پر "دستنبو" کی صورت میں جو ایک "تاریخ نامہ" اپنی یادگار چھوڑا ہے وہ اس دور کی تاریخ کو اس کے اپنے رنگ میں پیش کرتا ہے، یہ غالب کا صرف اپنا سوانح نامہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ بہت سے وہ چھوٹے بڑے واقعات بھی ہیں جن کا تعلق اس زمانہ میں شہر دہلی کی اپنی روداد اور افتاد سے ہے۔

غدر کا ہنگامہ ابتدا میں کچھ اور تھا اور بعد میں جب انگریز دوبارہ قابض ہوگئے تو اس ہنگامہ ہوش رُبا کے جلو میں دامن تھام کر حشر برپا کرنے والی موت اور باقی رہ جانے والے زندہ انسانوں کی روداد کچھ اور

غالب نے اتنے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے درد کو محسوس کیا ہے کہ ان کی نگارشاتِ قلم سے شہدائے غدر اور مصیبت زدگان شہر کی ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔

یہ آفت اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ شہر اور اہل شہر کے سر سے گذر گئی تب بھی نہ جانے اور کتنی آفتوں کا سامنا رہا غالب بھی اس موج خون کے شناور تھے۔ ان کی پنشن بند ہوگئی تو زندگی گزارنا اور اس مسموم شہری فضا میں سانس لینا اور مشکل ہو گیا۔ ان کی جان تو بچ گئی، لیکن انگریزی سرکار سے وفاداریوں پر شک کیا جانے لگا، یہ سب کچھ انگریزوں کے جاسوسوں کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق تھا۔ غالب کا قلعہ سے تعلق ضرور تھا، وہ اس کے خطاب یافتہ بھی تھے، بہادر شاہ ظفر کے استاد شاعری بھی، ان کو پچاس روپے رقم بطور وثیقہ ملتی تھی، بایں ہمہ انگریزوں کے خلاف معاندانہ کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ ہوش ربا کے بعد غالب کی پریشانیوں کا نیا دور شروع ہوا جو کئی اعتبار سے تکلیف دہ دور تھا، پنشن بند ہو گئی خطاب و خلعت موقوف، غنیمت ہے کہ وہ باغیوں کی مدد کے الزام سے بچ گئے اور جو الزام ان پر آیا اس میں رفتہ رفتہ ان کا قصور معاف ہوا اور اس میں سر سید کی مدد اور نواب رام پور کی سفارش اور معاونت ان کے کام آئی، انھوں نے خود انگریزوں سے تعلقات کو دوبارہ ہموار کرنے کی کوشش کی اُس کے لیے قصیدے لکھے، درخواستیں دیں اور حالات غدر پر 'دستنبو' جیسی کتاب لکھی اور اس کی اشاعت میں بڑا اہتمام برتا۔

دستنبو سے غالب نے خاص طور پر اس لیے بھی دلچسپی ظاہر کی کہ اس کتاب کو پیش کر کے وہ انگریزوں سے اپنے تعلقات کو زیادہ بہتر اور خوش گوار بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے اس کتاب کی اشاعت اور اس کی بعض کاپیوں کی تیاری میں انھوں نے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا کہ اس کی یہ جلدیں وہ بعض بڑے انگریز افسروں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

"دستنبو" چاہے غالب نے اپنے کچھ خاص مقاصد کے پیش نظر مرتب کی ہو اور تحریر و نگارش میں اپنے مدّ نظر مُدّعا کا خیال رکھا ہو، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعاتِ غدر کے سلسلے میں یہ ایک اہم تاریخ نامہ ہے، اس کی اپنی کچھ حدود ہیں، زمانی حدود جن میں اضافہ غالب کے دوسری نگارشات کے ذریعے ممکن تھا اس میں بطور خاص ان کے خطوط آتے ہیں ——— ——— جن سے اس دور میں شائع ہونے والی اور مختلف حکام اور اہل ثروت کو بھیجی جانے والی کتابوں کا کچھ حال سامنے آتا ہے کہ غالب ان کے بارے میں کیا اور کس طرح سوچ رہے تھے اس۔ لیے کہ ان کے ذہنی مشاغل اور صبح و شام کی مصروفیات میں ان امور کو بہت دخل تھا۔

غالبؔ کی آخری زندگی

ان خطوں میں غالبؔ کے افکار بھی سامنے آتے ہیں، قدر و معیار بھی ان کی سوچ بھی زندگی کے معاملات و مسائل اور ادب کی مرتبہ شناسی کے لیے ان کی نظر میں جو پیمانے رہے ہیں، وہ بھی۔ مفتی سید عباس کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے :۔

"علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن پچپن برس سے محوِ سخن گزاری ہوں، مبداء فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے، ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسب ازلی و سرمدی لایا ہوں، مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مذاق ابدی لایا ہوں مناسبت خداداد تربیت استاد سے حسن و قبح کی ترکیب پہچاننے لگا فارسی کے غوامض جاننے لگا بعد اپنی تکمیل کے تلامذہ کی تہذیب کا خیال آیا۔" [1]

یہ واقعہ ہے کہ غالب کی اپنی تعلیم و تربیت کا دائرہ اپنے اندر وہ باقاعدگی نہیں رکھتا اور کسی دوسرے ادارے یا ادارہ نما شخصیت سے ان کے شخصی استفادے کی بات بھی سامنے نہیں آتی۔ کم از کم اس طرح سامنے نہیں آتی جیسا ہم اسے ان کے دوسرے معاصرین اور اکابرین کی زندگی میں شامل دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے کہا ہے فارسی کے ساتھ بلکہ یہ کہیے کہ ادبیات عالیہ کے ساتھ ان کی ازلی مناسبت اور ذہنی ہم رشتگی تھی جس نے مسلسل تجسس اور تجربوں کے دائروں کو وسیع سے وسیع تر کیا اور ان کے فکری تجزیوں نے ان میں ندرت، معنی آفرینی اور حسنِ معنویت کو اُبھارا۔

وہ اپنی زندگی میں برابر ایک LIVING WIRE — ایک مضطرب رگِ حیات رہے۔ اور ان کی سوچ کا ریشمی سلسلہ برابر آگے بڑھتا رہا۔ اس حالت میں بھی — کہ وہ طرح طرح سے امراض و آلام میں مُبتلا تھے۔

---

[1] از عودِ ہندی ص ۲۴۰۔

میر مہدی بھی ہیں جن کے سامنے انھوں نے بڑی بے تکلفی سے اپنے حالات اور خیالات رکھ دیے ہیں۔

"اب رنجور نہیں تندرست ہوں مگر جو کچھ طاقت باقی تھی وہ بھی اس ابتلا میں زائل ہوگئی اب ایک جسم بے روح متحرک ہوں رجب ۱۲۸۰ء سے ستر واں برس شروع اور انتقام و آلام کا آغاز ہے۔ لاموجود الااللّٰہ ولامؤثر فی الوجود الااللّٰہ" (ص ۲۳۷) یہاں سنہ کے اندراج میں یا پھر اپنے سنین عمر کی یادداشت میں غالب سے تھوڑا سا تسامح ہوگیا ہے۔ اس وقت اُن کی عمر ستر برس نہ ہونا چاہیے کہ وہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے تھے بہر حال غالب کے یہاں اس طرح کے تسامحات یہاں اور وہاں مل جاتے ہیں اس دور میں جو مشکلات امراض و آلام کی وجہ سے غالب کی زندگی کا حصہ بنی ہوئی ہیں اُن کا تذکرہ بار بار آتا ہے۔ قاضی صاحب ہی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"حق تعالیٰ والیٔ رام پور کو صدوسی سال سلامت رکھے ان کا عطیہ ماہ بماہ مجھ کو پہونچتا ہے کرم گستری و استاد پروری کر رہے ہیں میرے رنج سفر اُٹھانے کی اور رام پور جانے کی حاجت نہیں۔ خلیفہ حسین علی صاحب رام پور میں مجھ سے ملے ہوں گے مگر واللہ مجھ کو یاد نہیں نسیان کا مرض لاحق ہے حافظہ گویا ندارد شامہ ضعیف سامعہ باطل باصرہ میں نقصان نہیں البتہ حدت کچھ کم ہوگئی ہے"

غالب نے میر مہدی مجروح کو جو خط لکھے ہیں اور جن میں دہلی کی تباہی اور بربادی کا ذکر کیا ہے ان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ دہلی کی اجڑی ہوئی شہریت اور برباد ہوتی ہوئی تہذیب کے ماتم گسار بھی ہیں۔ اور لکھنؤ کے شہری منظر نامے کا اس کی خوبیوں کے اعتبار سے اعتراف بھی کر رہے ہیں یہ بات اس لیے اہم ہے کہ اس زمانے میں اہلِ دہلی ایک خاص ذہنی سطح پر اہل لکھنؤ کو اپنا رفیق سفر نہیں رقیب مجلس سمجھ بیٹھے ہیں یہ اس دورِ تہذیب و شہریت میں کوئی انوکھی بات بھی نہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لوگ جھگڑتے ہیں اختلاف کرتے ہیں ادبی تنازعات پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر اُن کا سلسلہ اُستادوں سے شاگرد اور شاگرد در شاگرد ہوتا چلا جاتا ہے،

انھوں نے اپنے ذاتی غموں کو زندگی میں جس شدّت سے محسوس کیا اُتنا ہی شدّت سے وہ دوسروں کے دُکھ درد کو بھی اپنے دل میں جگہ دیتے رہے۔ ایک ایک کو یاد کیا، اور ایک ایک کے بارے میں جو معلوم ہو سکا اور جب معلوم ہو سکا وہ لکھا اور اس طرح اپنے دوستوں کی زندگی کے ساتھ مخلصانہ دلی تعلق کا اظہار کیا۔

غالب کے تقریباً سبھی دوست آفتوں کا شکار ہوئے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کا ذکر آچکا ہے ان کی وفات بھی انڈمان نکوبار میں ہوئی یوسف مرزا کو اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مرافعے میں حکمِ دوامِ حبس بحال رہا بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ . . . ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہونا ہے، جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔"

میاں داد خاں سیّاح سیر کرتے ہوئے کلکتے پہنچے تو غالب نے انھیں ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء کو خط لکھا۔

"ہاں خاں صاحب، جو آپ کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضلِ حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ انھوں نے رہائی کیوں نہ پائی وہاں جزیرے میں ان کا کیا حال ہے گزارہ کس طرح سے ہوتا ہے۔"

غالب کے الفاظ اب تک جیسے ہوا اور فضا میں گونج رہے ہیں۔ اور ذہن ان لمحات کا طواف کر رہا ہے جب ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد مولوی فضل حق خیرآبادی جیسا عالم و فاضل شخص وقت کی ستم ظریفیوں اور انگریزوں کے مظالم کا شکار ہوا تھا۔

مفتی صدرالدین آزُردہ اس دور کے بڑے علماء اور صاحب کمال اشخاص میں تھے ــــ بقول مولانا غلام رسول مہرؔ دینی علوم کے فیضان کا وسیع سلسلہ آپ کی

ذاتِ گرامی سے جاری ہوا۔ جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے قریب مدرسہ "دار البقا" کو از سرِ نو تعمیر کرایا اور اس میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا آپ خود بھی درس دیتے تھے' غالب کے گہرے دوستوں میں سے تھے' ہنگامہ غدر کے بعد جن لوگوں پر آفت نازل ہوئی ان میں مفتی صاحب بھی تھے [غالب نے اس کا حال قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے :]

"حضرت مفتی صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے" جان بخشی کا حکم دیا مگر نوکری موقوف (کہ آپ دہلی کے صدر الصدور تھے) جائیداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فنانشل کمیشن اور لیفٹیننٹ گورنر نے از راہِ ترحم نصف جائیداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرائے پر معاش کا مدار ہے۔" —

جو شخص دہلی کے ممتاز اشخاص میں ہو اور صاحبِ جائیداد رہا ہو جس کی زندگی بڑی عزت و احترام سے گزری ہو' اس کا گزر بسر صرف چالیس روپے تک محدود ہو کر رہ جائے اور بس' اس میں بھی مفتی صاحب نے اپنے بعض عزیز و اقربا کی پرورش اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ غالب لکھتے ہیں :

"اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے اس واسطے کہ ایک آپ ہیں اور ایک بیوی تیس چالیس روپے مہینے کی آمد لیکن چونکہ امام بخش کی اولاد ان کی عزت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہذا فراغ بالی سے نظر گزری ضعفِ پیری نے گھیر لیا ہے آخر ۸۱ برس کی عمر میں یہ چراغ علم و فضل خاموش ہو گیا۔"

بقول مولانا غلام رسول مہر " اعلیٰ درجے کی کشائش کا دور بھی انتہائی سلامت روی سے گزارا اور زندگی کے آخری بارہ سال بھی شدید مصیبتوں میں گزارے۔

کلکتے کے زمانۂ قیام میں غالب نے جو مثنوی لکھی تھی اس کا ذکر اس زمانے کے خطوں میں بھی آیا ہے، چنانچہ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں لکھا گیا ہے۔

"مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی عبدالقادر رام پوری، مولوی رحمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال و نظائر کے پاس بھیجی گئی اگر یہ جگہ پاتے تو میری کھال اُدھیڑ ڈالتے۔"

پنشن کے مقدمے کی کارروائی ابھی جاری ہے، غالب نے اس کے متعلق موقعہ بہ موقعہ اپنے احباب کو صورت حال سے باخبر کیا ہے، سرور کے نام ایک خط میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعض تفصیلات پیش کی ہیں، یہاں پنشن کا مقدمہ پیش ہے، کبھی صاحب کمشنر بہادر کے پاس کبھی صاحب ڈپٹی کمشنر کے پاس اور کبھی کمشنر بہادر کے پاس جانا ہوتا ہے، خود نہ جاؤں تو یہ خیال رہتا ہے کہ خدا جانے کس وقت بُلا بھیجیں یا کس وقت کوئی پُرسش آجائے۔ بائیس ۲۲ مہینے سے وہ رزق جو مقوم جسم اور مفرح روح تھا مسدود ہے، کیا کھاؤں اور کیوں کر جیوں۔

"الحمد للہ" کہ گنہگار نہیں ٹھہرا، پنشن پاؤں گا مگر وہ پنشن گورنمنٹ کے پولیٹیکل سررشتہ کی مقرر کی ہوئی ہو گی سو دہلی کی ایجنٹی کا دفتر لٹ گیا کوئی کاغذ باقی نہ رہا۔ اب یہ شہر پنجاب احاطے میں مل گیا۔"

"پنجاب کا نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا اس دفتر میں میری ریاست کا میری معاش کا میری عزت کا نام و نشان نہیں، ایسے ایسے پیچ پڑ گئے تھے کچھ نکل گئے ہیں کچھ باقی رہتے ہیں، یہ بھی نکل جائیں گے۔" [1]

ایک اور خط میں، جو انھیں مکتوب الیہ کے نام ہے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے۔

"حقیقت میری مجملاً یہ ہے کہ راہ رسم و مراسلت حُکام عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخۂ دستنبو سبیل ڈاک

---

[1] عود ہندی۔ صفحہ ۲۲۔

بھیجا تھا اُن کا خط بہ زبان فارسی شعر تحسین عبارت قبول، صدق ارادت و مودت بسبیل ڈاک آگیا پھر قصیدۂ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا گیا اس کی بھی رسید آگئی وہ یہ ہے "خان صاحب بسیار و مہربان دوستان القاب اور کاغذ افشانی" ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹیننٹ گورنر بہادر قلم رو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا اُس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر مجھکو آگیا پنشن ابھی تک مجھکو نہیں ملی جب ملے گی حضرت کو اطلاع پہنچا دی جائے گی۔"

غالب اپنی اس خاندانی پینشن کے سلسلہ میں ملنے والی رقومات سے کبھی مطمئن نہیں ہوئے۔ ان کے خیال سے پینشن انھیں ان کے حق سے بہت کم ملتی تھی مگر بالآخر اسی پر انھوں نے قناعت کی اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے نتیجہ میں جب یہ رقم بھی ملنا بند ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئے اور اس کے لیے انھوں نے دوڑ دھوپ بھی کی اور اپنی اس کوشش کے نتیجہ میں انھیں یہ پینشن ان کے حق میں بحال ہوئی انھوں نے خوشی و خرمی کے ساتھ اس کی اطلاع بھی اپنے بہی خواہوں کو دی۔ اس نوع کے اطلاع نامے گزشتہ صفحات میں بھی پیش کیے گئے ہیں۔

پنشن کا اجرا: بہت دنوں کی کشمکش اور ردّ و قبول کے بعد آخر پنشن جاری ہوئی تو غالب نے سرور کو اس کی اطلاع دی۔

پنشن جاری ہوگئی تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا بعد ادائے قرض کے (کذا) بچے اب ماہ بہ ماہ روپیہ ملتا ہے ــــ مگر یہ تین مہینے ستمبر۔ اکتوبر۔ نومبر ملیں گے دسمبر سے تنخواہ چھ ماہی ہو جائے گی۔ اس حساب سے میرے حصے میں ڈھائی روپیہ مہینہ آیا ساڑھے باسٹھ کے ساٹھ روپے رہیں گے کچھ رام پور سے ماہانہ آتا ہے یہ دونوں آمدنیاں مل کر خوش و ناخوش گذارہ ہو جاتا ہے۔

پنشن کی بازیابی اور انگریزی حکومت کی طرف سے اس کی واگزاری کے بعد جہاں تک مالی وسائل کا تعلق ہے' ان کی زندگی آرام سے گزری اور وہ اپنی بعض تصانیف کی طباعت واشاعت کی طرف توجہ فرما رہے۔

اپنے کلام کی جمع آوری میں انھوں نے نئے شوق وشغف کا اظہار کیا اور اپنی گوناگوں دشواریوں کے باوجود انھوں نے حوصلہ وہمت کا اظہار کیا۔ ہم ان کے زمانہ کے کسی دوسرے شاعر اور ادیب کو اس طرح کام کو آگے بڑھاتے اور وسعت دیتا ہوا نہیں دیکھتے۔

یہ زمانہ ان کی بیماری آزاری کا بھی ہے' یوں تو وہ اپنی جوان العمری میں بھی مبتلائے امراض و آلام رہے لیکن اس وقت صورت حال اس سے بھی آگے اور الگ ہے۔ پریشان کن اور اذیت ناک صورت پر ان کا بدن —— پھوڑوں سے پھل گیا۔

"ایک صورت پُر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے ہر پھوڑا ایک زخم اور ہر زخم ایک غار۔ ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے اور پاؤ بھر مرہم درکار' نو دس مہینے بے خور و خواب رہا ہوں اور شب و روز بیتاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی دو گھڑی غافل رہا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی جاگ اُٹھا تڑپا کیا' پھر سو گیا۔ سال بھر میں تین حصے دن یوں گزرے پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پیٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرے سے روح قالب میں آئی اب اگرچہ تندرست ہوں لیکن ناتواں اور سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا' حافظے کو رو بیٹھا اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اُٹھے۔" [1]

یہ تفصیلات غالب کے اندازِ نگارش کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ اُن سے گزارش کا سلیقہ بھی واضح ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ان کی زندگی کن حالات کس فضا اور کس ماحول میں گزر رہی ہے۔

"نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی امید، میں ہوں اور اندوہ ناکامی جاوید جیسا کہ خود ایک قصیدہ نعت کی تشبیب میں کہتا ہوں۔" لہ

یہ غالب کا پایانِ عمر ہے اگرچہ وہ اس وقت تک اس معنی میں ایک زندہ و تابندہ ذہن ہیں کہ وہ برابر سوچ رہے ہیں کہہ رہے ہیں لکھ رہے ہیں۔ شاگردوں کو اصلاحیں دے رہے ہیں اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ اپنے ضعف جسمانی اور اضمحلال قویٰ کی شکایت کرتے ہیں۔

مرزا نے اِس دورِ زندگی میں اپنے ذہن اپنی فکر اور اپنے خیال کے جو نقوش چھوڑے ہیں، ان میں بعض وہ باتیں بھی ہیں جو ان کی اپنی تصانیف سے متعلق ہیں، ان کے شعری رویوں سے تعلق رکھتی ہیں معاملات ہم رشتہ ہیں۔

عبدالرزاق شاکر کے نام اپنے ایک خط میں انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔

"قبلہ ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا　　　اسداللہ خاں قیامت ہے

۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کا دور کیا اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے اس دیوان حال میں رہنے دیے۔"

غالب کا یہ بیان اپنی جگہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ وہ دیوان جس کو انھوں نے چاک کیا تھا وہ اپنی جگہ موجود رہا۔ نسخہ حمیدیہ اُسی پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ جس بیاض کی دریافت بھوپال میں ہوئی ہے وہ بھی اُسی دور کے کلام پر مشتمل ہے۔ اور سفر کلکتہ کے وقت بھی ایسا کوئی مجموعہ اُن کے ساتھ تھا۔

لہ عود ہندی ص ۱۶۹۔

اس دورِ زندگی میں ان کے متحرک ذہن اور طریق ذکر و فکر کی بہت سی پرچھائیاں سامنے آتی ہیں۔ بعض خطوط کے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک خط میں غدر کے بعد دہلی کی صورتِ حال کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

"بھائی تم اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودِ نیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل کیا رودِ نیل یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، لو سنو اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت اور خس و خاشاک ڈال کر پر کر دیا۔ بلّی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم خاص و عام کچھ نہیں پنشن داروں سے حاکموں کو کام کچھ نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"بادشاہ مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ اور بیگم زینت محل کلکتہ پہنچے وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی اب آگے دیکھیے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے یہ بات اڑا دی ہے سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جاویں گے۔ خیر آج بدھ کا دن ۲۲، دسمبر کی ہے اب شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کیا ہوا۔"

یعنی دہلی کے دورِ ابتلا کی اذیت ناک پرچھائیاں برابر ذہن کی فضا میں موجود ہیں غدر کا ہنگامہ اپنی حشر سامانیوں مگر اس کے اثرات مابعد بھی کچھ کم نہ ہوئے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

گمانِ زیست بود بر منت ز بے دردی
بد ستِ مرگ دلے بدتر از گمانِ تو نیست

"اب اس سے زیادہ، بے دردی اور کیا ہو سکتی ہے کہ تو مجھے زندہ سمجھتا ہے۔ موت ہزار بُری ہو مگر تیری اس بدگمانی سے زیادہ تو نہیں۔"

"کاش یہ ہوتا کہ گُل کاری کی صنعت کی طرح یہ کام تنہا دست و بازو کی سعی سے صورت پذیر ہو جاتا تو میں اپنی دل شکستگی و خستہ خاطری کی طرف سے چشم پوشی اختیار کرتا اور آپ کا حکم جانتے ہوئے اس کام کی سرانجام دہی کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ کیا کروں کہ اس کا سر رشتہ دل کے ہاتھ میں ہے جب تک دل اپنی جگہ پر نہ ہو گا سخن سرائی ممکن نہیں۔"

دیدہ وران صاحب دل یہ جانتے ہیں کہ دیدہ و دل کس پیمانے پر ایک دوسرے کے ساتھ ہمدم و ہم ساز ہوں تب کوئی ایسا نقش بدیع تیار ہو سکتا ہے جو بالغ نظروں کے معیارِ پسندیدگی پر پورا اُترے، اس دل شکستہ سے جو غم و اندوہ سے ہمکنار رہتا ہے اور جو میرے سینہ میں ایک دیرینہ دشمن کے طور پر موجود ہے، بھلا سخن گستری و معنی آفرینی کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔

ابیات۔

در پیکرم ز درد دریغ است جان و دل
در بسترم ز خارہ و خار است پود و تار
کاشانہ مرا در و دیوار شعلہ خیز
ہم سایہ مرا سر د ستارہ پُر شرار
چشم کشودہ اند بجر دار ہائے من
زائیندہ نا امیدم و از کردہ شرمسار

میرے پیکر میں دُکھ درد کے باعث جان و دل ہیں بھی کہاں، میرے بستر کا تار تار خارِ خارِ غم سے تیار کیا گیا ہے، میرے کاشانہ کے در و دیوار شعلہ خیز ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس دور میں بہت سی جسمانی تکلیفوں کا بھی شکار رہے جن کا رشتہ فساد خون سے جڑا ہوا ہے اور اس کی وجوہات ان کی زندگی میں ایک نہیں انیک ہیں، اس میں ان کی رندی اور مے خواری کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے کے بعض بیانات کی طرف صورت حال کی مزید وضاحت کے لیے یہاں اشارہ کیا جاتا ہے۔

زمانۂ غدر کے بعد غالب بارہ برس تک اور زندہ رہے، اب یہ کہنا تو مشکل ہے کہ یہ زمانہ ان کی زندگی میں اطمینان و سکون اور راحت و آرام کا دور رہے، جسمانی تکالیف کے ماسوا ذہنی الجھنیں بھی ان کے ساتھ رہیں، ان کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ، بہت سے خرچ تو خود اُن کے اپنے بڑھائے ہوئے تھے، وہ رئیسانہ زندگی گزارنا چاہتے ہیں جس کا اندازہ ان کی اشیاء خوراک سے بھی ہوتا ہے، اس کا ذکر اس دور کے خطوں میں برابر وہ کرتے رہتے ہیں ــ اس کے علاوہ ان کے پاس تین چار ملازم ہیں ملازموں کی تنخواہیں بہت تھوڑی رہی ہوں گی مگر ان کی اس روش سے ان کے امیرانہ انداز کا کچھ پتہ تو ضرور چل جاتا ہے۔

حالی نے لکھا ہے کہ وہ پالکی یا ہوادار کے بغیر کبھی باہر نہ نکلتے تھے اور عامیانہ انداز سے پیدل سفر کرنا انھیں پسند نہیں تھا۔

دہلی میں وہ جن جن مکانات میں رہے، وہ آرام دہ مکان نہیں تھے لیکن جب وہ ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں تو ان باتوں کا بھی تذکرہ آتا ہے جن کی وجہ سے وہ انھیں پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔

لائق ذکر اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ وہ آخری وقت تک کسی نہ کسی علمی کام اور ادبی مصروفیت میں اپنا وقت گذارتے رہے۔ زمانۂ غدر میں ان کا ذہن کس قدر Disturb اور ان کا دل کرب و اضطراب کا شکار رہا ــ اس کا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے۔ جس میں بعد غدر دوستوں کی مفارقت شہر کی بربادی اور اہل شہر کی مظلومی سزایابی جلاوطنی وغیرہ کا بیان ــ شامل ہے۔